اُن ناقدوں کی نذر

جو مجھے افسانہ نگار نہیں مانتے!

کیوں کر کہوں کہ کیسے سب نکتہ چیں ہوئے چُپ

سب کچھ کہا انھوں نے پر ہم نے دم نہ مارا

درماں زِ درد ساز اگر خستہ تن شوی
خوگر بہ خارِ شو کہ سراپا چمن شوی

کتاب - درد درماں

از صالحہ عابد حسین

فہرست

۱۔ گرم شال	۱۱
۲۔ میاں! بیوی!	۲۰
۳۔ انمول موتی	۲۹
۴ فن کار	۳۷
۵۔ یہ بھی شادی، وہ بھی شادی	۴۷
۶۔ دو مائیں	۵۷
۷۔ کایا پلٹ	۷۷
۸۔ لکشمی	۸۵
۹۔ محرومی	۹۷
۱۰۔ ڈائن	۱۰۷
۱۱۔ سوتیلی	۱۱۸
۱۲۔ خالہ اتو	۱۳۲
۱۳۔ وہ رکشا والا	۱۴۱
۱۴۔ دکھ سکھ کا میلا	۱۵۶
۱۵۔ یہ نئی بستی	۱۷۰
۱۶۔ رانو!	۱۸۱

۱۷۔ پرستان	۱۹۰
۱۸۔ یادوں کے کھنڈر	۲۰۶
۱۹۔ بھولی یاد	۲۱۳
۲۰۔ نصیبہ بیگم	۲۱۹
۲۱۔ ہمرے بھیّا دیوتا	۲۲۸
۲۲۔ دُنیا کیا سے کیا ہو جائے گی ؟	۲۴۲
۲۳۔ ہم سفر	۲۵۴
۲۴۔ جوئی کی بیل	۲۶۱
۲۵۔ تفریح	۲۷۳
۲۶۔ درد کا رشتہ	۲۷۹
۲۷۔ زخم و مرہم	۲۹۰
۲۸۔ پرتیں..... پٹّیاں... پھاہے...	۲۹۶
۲۹۔ اُلجھے سُلجھے رشتے	۳۰۵
۳۰۔ ایک سوال	۳۱۲

یہ کہانیاں

یہ میرے افسانوں کا پانچواں مجموعہ ہے۔ چار میں سے تین پر جو افتاد پڑی وہ خاصی عبرتناک ہے۔ "نقشِ اول" میری سب سے پہلی تصنیف تھی۔ کہانیاں اور ڈرامے جو اس میں شامل تھے خاصے بچکانہ تھے مگر پڑھنے والوں اور نقادوں نے شاید ہمت افزائی کے طور پر ان کو سراہا۔ "افسانۂ ہستی" ۱۹۴۷ء کے فسادات کی بھینٹ چڑھ گیا۔ اور "نراس میں آس" ۱۹۴۸ء میں چھپا۔ اسی کے بعض افسانوں کو پسند بھی کیا گیا مگر ہنگامی ادب تھا۔ کتب پبلشرز جس نے اسے شائع کیا تھا خود ہی باقی نہ رہا [illegible] لگے۔

میرے نو افسانوں کا مجموعہ ایک اور پبلشر نے چھاپا تھا مگر فروخت نہیں کیا۔ اب افسانوں کا یہ نیا انتخاب مرتب کیا ہے۔

گذشتہ بیس سال میں میں نے بہت سے طویل اور مختصر افسانے لکھے ہیں۔ ان میں سے بیشتر آل انڈیا ریڈیو کے مختلف اسٹیشنوں سے نشر ہوئے اور بہت سے رسالوں میں شائع ہوئے۔ ان میں سے کتنے ہی افسانوں کے مسودے میرے پاس سے گم ہو گئے۔ ان سب رسالوں کے نام بھی ذہن میں محفوظ نہیں جن میں وہ شائع ہوئے تھے، کہ میرے رسالے میرے بہت سے عزیزوں، دوستوں، پڑوسیوں کے مطالعے میں رہتے ہیں اور اکثر وہی رسالے غائب ہوتے ہیں جن میں میرا افسانہ چھپتا ہے۔ بہرحال اس کے باوجود ساٹھ سے زائد افسانوں میں سے میں نے

ان کہانیوں کو چنا ہے۔ مصنف کے لیے خود اپنی لکھی چیزوں کا انتخاب کرنا بہت مشکل ہوتا ہے جیسے ماں کو اپنا ہر بچہ خوبصورت معلوم ہوتا ہے، فن کار کو اپنی ہر تخلیق اچھی لگتی ہے۔ مگر میں شاید فن کاروں کی اس کسوٹی پر پوری نہیں اترتی۔ جیسے تیسے میں نے یہ کٹھن کام انجام دیا اور جو کہانیاں "کم و بیش" میرے معیار پر پوری اتریں ان کو اس انتخاب میں شامل کیا ہے۔ لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ میری اور آپ کی پسند یکساں ہو۔؟

میں افسانہ کیوں لکھتی ہوں، اس کا جواب تو نہیں دے سکتی۔ یہ جانتی ہوں کہ محض کسی رسالے یا ریڈیو کی فرمائش پر کہانی نہیں لکھتی یا کبھی کبھار لکھنا پڑ جائے تو وہ اکثر مجھے خود ہی پسند نہیں آتی۔ میں کہانی اسے سمجھتی ہوں جو خود زبردستی اپنے کو مجھ سے لکھوا لیتی ہے۔ میری راتوں کی نیند اڑاتی ہے۔ دن کا چین لوٹ لیتی ہے اور ہر کام سے بے دل کر دیتی ہے۔ اس انتخاب میں میری تقریباً سبھی کہانیاں ایسی ہی ہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ کہانی فن کار کے دل کی گہرائیوں میں پلتی اور وہیں سے ابھرتی ہے، دماغ کے کارخانے میں نہیں ڈھلتی۔ جب تک کوئی واقعہ حادثہ یا کوئی کردار، دل کے تاروں تک نہ جھنجھنا دے کہانی کے سُر نہیں جاگتے۔

شاید آپ کو یہ کہانیاں سیدھی سپاٹ اور پرانے طرز کی معلوم ہوں۔ نہ ترقی پسندی کی خصوصیات کی حامل، نہ جدید کہانی کے معیار کے آس پاس، نہ چٹپٹا عشق، نہ وہ رومانیت جو دنیا و مافیہا سے بے خبر بنا دے اور تو اور، نہ جنسیات نہ عریانی نہ بے باکی۔ بھلا ان خوبیوں کے بغیر کوئی کہانی مقبول کیسے ہو سکتی ہے؟

میں بھی سوچتی ہوں، سچ مچ ان میں کیا ہے؟ بس زندگی کی سیدھی سچی حقیقتوں کو کہانی کی مالا میں پرونے کی کوشش کی ہے۔ یا ایسے جذبات و احساسات کو کہانی میں سمونے کی جو فن کاروں کے ذہنوں کو کم ہی متاثر کرتے ہیں، یا کرتے ہیں تو ان کو بیان کرنا کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا!

ہاں ان کہانیوں میں آپ کو اپنے اور میرے ماحول کی عکاسی نظر آ سکتی ہے۔ انسانی، خصوصاً نسوانی دلوں کی دھڑکن سنائی دی جا سکتی ہے۔ ان سے دکھ، سکھ

ان کی محرومیاں، کامرانیاں، ان کی خصوصیات اور کمزوریاں آپ چاہیں تو اس تصویر میں دیکھ لیں گے۔ بدلتے سماج کی جھلک بھی شاید نظر آجائے۔ غمِ جاناں ملے گا تو آٹے میں نمک کے برابر، ہاں غمِ دوراں کی کمی محسوس نہ ہوگی۔ کہیں کہیں آپ کو کہانی کار کے دل کے رشتے، بوند بوند لہو کی سرخی بھی نظر آجائے گی، جنھوں نے ان کہانیوں کو رنگ دیا ہے۔ سکون اور روحانی مسرت کی کھوج کیسے ہو؟ زندگی کے دکھ اور مصائب کیسے جھیلے جائیں؟ سکھ اور راحت کا اصل مطلب کیا ہے؟ شاید ان سوالوں کا جواب آپ کو کسی کہانی میں مل جائے۔ زبان ان کی وہی ہے جو میری آپ کی بول چال کی زبان ہے۔ عبارت آرائی اور بیان میں خوبی اور دلکشی پیدا کرنے کی شعوری کوشش نہیں کرتی ہوں۔ خود بخود یہ رنگ کہیں پیدا ہو جائے تو اور بات ہے۔ ان کہانیوں میں سے بیشتر نشر ہو چکی ہیں۔ دو تین کو چھوڑ کر باقی سب اردو کے مختلف رسالوں۔ جامعہ۔ آج کل۔ نیا دور۔ شاعر۔ سب رس۔ مطالعہ۔ شب خون۔ نقوش۔ سب ساتھ۔ حریم۔ بانو۔ روشنی وغیرہ میں شائع بھی ہو چکی ہیں۔

ان کہانیوں میں کسی کو سچی حقیقی زندگی کی جھلک نظر آجائے اور ان بے انصافیوں اور مسائل کی طرف توجہ ہو جائے جو ان میں آ گئے ہیں، بس یہی میری کاوش کا انعام ہے۔

صالحہ عابد حسین

اکتوبر ۷۶ء

گرم شال

"امی کام تو میں نے سب ختم کر لیا۔ اب تیار ہو جاؤں جا کر؟" نفیسہ نے جھجک کر کہا۔

"ہاں بچی تجھے دیر نہ ہو جائے...." ماں نے آہستہ سے کہا۔ جب سے وہ بیمار پڑی تھیں نفیسہ کی آواز میں یہ جھجک نہ سنی تھی، چہرے پر یہ مسرت نہ دیکھی تھی۔ شکر ہے اب ان کا بخار ٹوٹا تو بچی کی فکر بھی دور ہو گی اور گھر کے کام کا سارا بار جو اس پر آپڑا ہے، اس کا بوجھ بھی کم ہو گا۔

نفیسہ نے ابھی پچھلے مہینے ہی تو بڑی مشکل سے ماں سے اجازت لے کر پڑوس کے اسکول میں کام شروع کیا تھا۔ یہ نیا قدم اٹھوں نے کتنی ہچکچاہٹ کتنے تردد کے بعد، کتنی راتیں آنکھوں میں کاٹ کر، کتنے دن سوچ میں گزار کر اٹھایا تھا۔ میر ضامن علی کی پرپوتی ــــ جن کے سو گاؤں کی زمینداری تھی نوکری کرے گی؟ ڈپٹی حسن علی کی پوتی جن کی حکومت کی دھوم دور دور تھی کسی کی ملازمت کرے؟ وکیل صاحب کی لاڈلی اکلوتی بیٹی روٹی کھانے کے لیے دوسروں کی چاکری کرے؟ آج ان کے میاں زندہ ہوتے ــــ تو یہ دن دیکھنا نہ پڑتا؟ جوان لڑکا اگر بیوی کو لے کر الگ نہ ہو گیا ہوتا تو.... الٰہی تو نے اسی دن کے لیے مجھے زندہ رکھا تھا؟

"امی جی ــــ امی پیاری۔ ارے آپ رو کیوں رہی ہیں!" نفیسہ نے ماں کے گلے میں باہیں ڈال دیں ــــ انھیں لگا وہ چوری کرتے پکڑی گئی ہیں۔ بیٹی کے سامنے وہ کبھی آنکھ سے آنسو نہیں نکالتی تھیں۔۔۔۔ "جا رہی ہو میری لال ــــ دیر نہ کرنا ــــ"

"نہیں امی۔ بس چھٹی ہوتے ہی بھاگتی ہوں بس تو" نفیسہ جانے کو مڑی پھڑک گئی۔۔۔ کھدر کی سوتی پرنٹڈ قمیص اور لٹھے کی شلوار پر اس نے ماں کی کئی سال پرانی شال لپیٹ رکھی تھی۔ "کیسی لگ رہی ہوں امی جی میں!" مسکرا کر اس نے کہا تو اس کی مسکراہٹ کی چھوٹ ماں کے لبوں پر بھی پڑ گئی ــــ

"ماشاء اللہ۔ ماشاء اللہ ہزاروں میں ایک ــ" نفیسہ ہنسی "ماں کی نظر!" اور تیزی سے باہر چلی گئی۔

"کوئی مدد کرنے نہ آیا اعتراض کرنے کے لیے کتنے برادری والے موجود ہو گئے۔ وہ تو اللہ بھلا کرے رام چندر دادا کا جنھوں نے اسے کام دلایا۔ خود انھیں سمجھایا کہ محلے ہی میں اسکول ہے ــــ پھر یہ تو غریب بچوں کے لیے کھولا گیا ہے۔ اپنی بھی مدد اور دوسروں کی بھی ــــ کیسے ہمدرد اور شریف ہیں رام دادا۔ اور ایک یہ عزیز رشتے دار ہیں۔۔۔۔ وہ کس کس کے آگے رونا روئیں کہ جب اپنے ہاتھ پاؤں اور بینائی جواب دے رہی ہے اور جوان بیٹا نالائق نکل گیا تو کیا کریں؟ جس بیٹے کو انھوں نے ہزاروں دکھ اٹھا کر پالا، دن کو دن نہ سمجھا رات کو رات نہ جانا، خود روکھا سوکھا کھایا اور اس کو سالن روٹی دی، خود پیوند لگا کر پہنا اور اسے نئے کپڑے پہنائے۔ آہ بیٹے کے سامنے انھوں نے معصوم بچی کی پروا نہ کی، اس کی ضد بھی پوری نہ کیں۔ لڑکی ذات کا کیا ہے۔ پر لڑکے کو یہ محسوس نہ ہو کہ باپ مر گئے تو اس کا کوئی نہیں۔۔۔ راتوں کو سوئٹر بنے، دنوں کو سلائیاں کیں، اچار اور چٹنیاں بنا بنا کر بیچیں اور اسے بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی کرایا ــــ باپ کا جانشین بنے گا میرا لاڈلا ــــ اور اسی نے اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر،

بیاہ رچاکر، اپنا الگ گھر بسا لیا —— بیوی کو ساس نند کے پاس رہنا پسند نہیں۔
—— بیوی —— اپنا سونا کھوٹا تو پرکھنے والے کا کیا دوش . . . . پچاس روپے دیے
کو کہا تھا —— پچاس روپے —— ماں کی محبت اور محنت، خدمت اور مامتا کی اتنی
بھاری قیمت —— انھوں نے منھ پر دے مارے وہ روپے —— نکل جا میرے
گھر سے —— اب منھ نہ دکھائیو —— اور وہ سچ مچ چلا گیا —— خدایا تیری دنیا میں
ہوا اب یوں سفید ہونے لگے . . . . ” اب وہ ہچکیوں ہچکیوں رو رہی تھیں ——
اس وقت آنسو پونچھنے والا کون تھا۔
” الٰہی میری بچی کی ہزاروں برس کی عمر ہو —— وہ تو اب بیٹا بھی ہے اور
بیٹی بھی۔ دسویں تک بھی میں تو اسے نہیں کرا رہی تھی —— پر اس نے اپنی ضد
سے اسکول میں نام لکھایا، پڑھا، ٹریننگ لی۔ اور خود ہی رام چندر دادا سے
کہہ کر نوکری کا انتظام کر لیا —— خود ہی ان کو میرے پاس بھیج کر اجازت دلوائی۔
اجازت نہ دیتی تو کیا کرتی۔ اپنی صحت تو جواب دے رہی ہے —— غریب کی لڑکی
کے بیاہ کا خیال ہی بے کار ہے . . . پھر میں بھوکوں مر جاؤں تو پاپ کٹے ——
پر میری بچی —— جس کو نہ کبھی اچھا کھانا نصیب ہوا۔ نہ اچھا پہننا . . . کتنی خوش ہے
اس سو روپے کی نوکری سے جیسے قارون کا خزانہ مل گیا ہو مرے لال کو . . . . “
جب انھوں نے اسے منع کیا تھا —— تو کتنی دلگیر ہو گئی تھی ! ” امی اب میں آپ کا
بیٹا ہوں “ اس نے کہا تھا تو ماں نے منھ چوم کر جواب دیا ” بے شک ! مگر یہ
دنیا تو جوان کنواری لڑکی پر بے بات بھی تہمت رکھ دیتی ہے میری چاند “ ” امی
آپ کو تو مجھ پر بھروسا ہے نا۔ بس کافی ہے —— نفیسہ اپنی ماں کی بیٹی ہے . . . .
” نہیں بیٹا —— “ اور وہ تن کر کھڑی ہوئی تو انھوں نے بے اختیار اس کی بلائیں
لے لی تھیں اور دعائیں پڑھ کر پھونکی تھیں . . . . انھیں وہ زمانہ یاد آیا جب
ان جیسی جوان بیوی کو اسی محلے میں مر مر کر جینا اور جی جی کر مرنا پڑا تھا —— اور
ہر آفت، ہر تحریفیں، ہر بے ہودگی، ہر بدمعاش کی بد نظروں کا ان کی عصمت و

عفت نے مقابلہ کیا تھا۔ ہاں نفیسہ ان کی بیٹی ہے۔ اور یہ سوچ کر جیسے ان کے دل کو قرار آگیا تھا۔ وہ اپنی سوچوں میں اتنی گم تھیں کہ نفیسہ جو کھچڑی پکا کر رکھ گئی تھی وہ بھی نہ کھائی ــــ یہاں تک کہ سایہ ڈھلنے لگے اور تھکی ہاری نفیسہ دروازے سے آتی نظر آئی۔ انھوں نے دونوں باہیں پھیلا دیں۔ کچھ دن سے رضیہ بی دیکھ رہی تھیں کہ نفیسہ کچھ چپ چپ سی رہتی ہے، یا چہرے کی وہ چمک، آواز کی وہ چہک، آنکھوں کی وہ دمک جو شروع میں نظر آتی اب کم ہو گئی ہے اور وہ کسی سوچ میں، کچھ حسرت کے سے عالم میں رہتی ہے۔ پہلے ماں سمجھ نہ سکی کہ کیا بات ہے۔ مگر پھر غور کرنے پر بات ان کی سمجھ میں آگئی۔

"امی جی کا نتا دیدی اور ساجیہ آپا ایسے خوبصورت قیمتی کوٹ پہن کر آتی ہیں کہ بس دیکھے جاؤ....." نفیسہ نے اپنے کئی سال پرانے سوئٹر میں باہیں ڈالتے ہوئے ایک دن کہا.... پھر ایک اور دن صبح سویرے جاتے جاتے بولی "امی یہ شال آپ نے کب لی تھی ــــ اس میں تو اب ذرا بھی گرمی نہیں رہی...." ماں کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ وہ کچھ نہ بول سکیں۔ شام کو نفیسہ آئی تو اس کی آنکھیں لال تھیں۔ ماں گھبرا گئیں۔ جب کسی سوال کا جواب نہ ملا تو وہ بہت گھبرائیں کسی غنڈے نے میری بچی کو چھیڑا تو نہیں.... وہ کانپ اٹھیں ــــ "نہیں نہیں امی ــــ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں ــــ میرے یہ ناخون دیکھیے اس کی آنکھیں نہ پھوڑ دوں گی ــــ"

"مگر پھر ہوا کیا؟"

"وہ امی ــــ وہ کنول اور شکیلہ ہیں نا ــــ انھوں نے آج میری شال اور سوئٹر پر اتنے فقرے، اتنی پھبتیاں کسیں کہ....." اور وہ رونے لگی۔

"کیوں؟ تیری شال اور سوئٹر سے انھیں مطلب؟" ماں کا پارہ چڑھ گیا "پرانی، بدرنگ اور سستی ہے نا" نفیسہ کی آواز گھٹ گئی۔

"وہ چھچھوری تو دولتی عورتیں وہاں اسکول میں آتی کیوں ہیں۔ میں رام داد ا سے کہوں گی....."

"نا ـــــ نا امی ـــــ کچھ نہ کہنا ـــــ وہ آنریری پڑھانے آتی ہیں نا وہاں ... !"

"اری وہی کنول نا؟ اس بلیک مار کیٹیے کی چوتھی جورو ـــــ اور وہ شکیلہ ... بے ایمان ٹھیکدار کی بیٹی ـــــ ان کی یہ مجال کہ وہ تیرے منھ آئیں!"

"امی وہ امیر ہیں ـــــ کئی کئی سو کی شالیں، ولایتی کوٹ اور سوئیٹر پہن کر آتی ہیں ـــــ کیوں نہ فقرے کسیں ... انھوں نے سارے اسکول کے اسٹاف کو احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیا ہے ـــــ" کچھ شرمندگی سے نفیسہ بولی۔ "بیٹی جس میں اس بیماری کے جراثیم نہ ہوں اسے کون احساسِ کمتری میں مبتلا کر سکتا ہے؟ انھیں غریبوں کا خون چوس کر، ملک سے غداری کر کے، بے ایمانی کر کے روپیہ کمانا اور خرچ کرنا مبارک رہے ـــــ تیری اس بدرنگ سستی شال، اس پرانے سوئیٹر کی قدر و قیمت وہ بے چاریاں کیا جان سکیں گی ـــــ میری لال اس میں محنت کے زریں تار ہیں، جفاکشی کا ریشم ہے، خونِ جگر کا رنگ ہے، ماہتا کے پیار کا تانا بانا ہے ... ایسی نادر چیز تو انھیں سات جنم بھی نہ مل سکے گی ـــــ" رضیہ بی نے سر اٹھا کر کہا تو ان کا چہرہ تمتما رہا تھا ـــــ نفیسہ نے لپک کر ان کے منھ پر سر رکھ دیا ـــــ "مجھے معاف کر دو ماں ـــــ مجھے اس شال پر فخر ہے ـــ اس ماں پر ناز ہے۔"

اس وقت تو بات آئی گئی ہوئی۔ مگر روز صبح کو جب سرد ہوا میں نفیسہ سوئیٹر کے بٹن بند کرتی اور پرانی شال کو کس کے چاروں طرف لپیٹتی باہر چلی جاتی تو ماں کا دل کوئی اندر سے یوں مسل ڈالتا جیسے اب وہ دھڑک نہ سکے گا ... وہ سوچ رہی تھیں، نفیسہ کی پہلی تنخواہ میں سے سب سے پہلے اس کے لیے ایک شال اور سوئیٹر کا اون آئے گا ـــــ اب بھی وہ بن تو سکتی ہیں۔

"امی اب میں دوسری کلاس کو پڑھا رہی ہوں ـــــ ہیڈ مسٹرس اور مدام دادا دونوں میرے کام سے بہت خوش ہیں!" ایک دن نفیسہ نے ماں کو بتلایا۔

"بیٹی خدا انھیں نیک کام کی جزا دے اور تجھے خوش رکھے ـــــ تیری خوشی

میں میری زندگی ہے ـــــ" ماں نے درد و محبت بھرے لہجے میں کہا۔

"امی میرے بچے بڑے اچھے ہیں۔ دو تین کے سوا سب ذہین ہیں ـــــ اور امی میرے بچے مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں ـــــ میری ہر بات مان لیتے ہیں۔ مگر۔۔۔۔" وہ بات کرتے کرتے افسردہ ہوگئی۔

"مگر۔۔۔۔ کیا بات ہے ـــــ تو روہانسی کیوں ہو رہی ہے؟"

"امی ان میں سے بعض بچے بہت غریب ہیں ـــــ اتنے غریب کہ یونیفارم تک نہیں بنا سکتے ـــــ کئی لڑکیاں تو پرانے کرتوں پر پھٹے دوپٹے لپیٹ کر آتی ہیں ـــــ ہائے امی انھیں کتنی سردی لگتی ہوگی ـــــ ان کے پاس تو پرانی صدریاں اور پھٹی شالیں بھی نہیں۔۔۔۔ مجھے تو اپنے گرم کپڑوں سے شرم آنے لگی ہے ـــــ"

"ہاں میری بچی ـــــ" ٹھنڈا سانس لے کر ماں نے اپنی سوتی شال بیمار ہڈیوں کے گرد لپیٹ لی "ابھی ہمارے ہاں بہت غریبی ہے، بہت گھٹنائیاں ہیں، اور پھر ـــــ کاہلی بھی بہت ہے۔۔۔۔" وہ کھوسی گئیں۔

"امی مجھے پتا نہ تھا کہ ہمارے ہی محلے میں اتنی غریبی، اتنی بے کاری، ایسی حالت ہے۔" اور پھر دونوں ہی خیالات میں ڈوب گئیں!

مہینے کی تیسری تاریخ کو نفیسہ خوش خوش آئی اور ماں کے گلے میں باہیں ڈال کر سو روپے ان کے قدموں میں رکھ دیے! "امی رام دادا نے کہا ہے دو تین مہینے بعد وہ میری تنخواہ اور بڑھا دیں گے ـــــ" ماں نے بیٹی کو کلیجے سے لگایا، خوشی کے موتی اس کے سر پر نچھاور کیے بس اب یہی ان کا بیٹا ہے اور یہی بیٹی!

"جانتی ہیں اس میں سے سب سے پہلے کیا آئے گا؟"

"جا سے کسی سے ـــــ شبّو اللہ سے پہلے نذر کے لیے دو روپے کی مٹھائی منگا لوں۔۔ اور پانچ روپے۔۔۔۔ بیچارے بڑے میاں کو تو خود اپنے ہاتھ سے دے آ ـــــ"

"اچھا امی ـــــ اور باقی روپے؟"

"باقی روپے تیرے ہیں ـــــ پورے نوے ـــــ اس میں سے اپنے لیے

ایک گرم شال، کچھ اون اور دو کرتوں کا کپڑا خرید لائیو ——"

"مگر امی گھر کا خرچ ...."

ارے گھر کا خرچہ جیسے آج تک چلا اس مہینے میں بھی چل جائے گا ——
اگلے مہینے سے تو تجھے بس دس روپے جیب خرچ ہی ملے گا نا —— مگر یہ روپے
پہلی تنخواہ سے میری بچی کے شوق کی چیزیں آئیں گی ——" محبت پاش
نظروں سے ماں نے بیٹی کو دیکھا اور وہ ہنستی، پنجوں کے بل ناچتی —— گنگناتی اپنی
سہیلی سرلا کے پاس شام کی شاپنگ کا پروگرام بنانے چلی گئی۔

سورج چھپ چکا تھا، دن کی روشنی پر شام کی سیاہی غالب آرہی تھی اور
سائے طویل ہو کر غائب ہو گئے تھے —— نفیسہ اب تک واپس نہ آئی تھی ——
رضیہ بی کے دل میں پنکھے لگے ہوئے تھے "الٰہی میری بچی کی خیر —— الٰہی میری نفیسہ
عزت آبرو کے ساتھ گھر آئے ——" اُف یہ ماں کا دل!

اور جب نفیسہ نے کئی تھیلے لا کر ماں کے سامنے ڈھیر کر دیے تو انھوں نے
غصّے سے کہا کہ "اتنی دیر کیوں کر دی۔ میں فکر کے مارے مری جا رہی تھی ——"

"ارے امی وہ بسوں کا جو چکر تھا —— آپ تو جانتی ہی نہیں اب کہیں آنا
جانا، جان جوکھوں کا معاملہ ہو گیا ہے ....." یہ کہہ کر اس نے سب سے اوپر والا
تھیلا کھولا اور ایک بڑی سی سرمئی رنگ کی اونی و سوتی دھاگے کی بنی مکس شال ماں
کے کندھوں پر ڈال دی "امی ناپسند نہ کیجیے گا —— نہیں میرا دل ٹوٹ
جائے گا ——" ماں نے شال کو پھیلا کر دیکھا، چوما اور سر پر ڈال لیا ——
بہت اچھی بہت گرم ہے —— اور تیری شال اور سوئٹر ؟"

باقی تھیلے نفیسہ نے پلنگ پر الٹ دیے —— بہت سستی گہرے سبز رنگ
کی کوئی دو پونڈ اون اور اسی رنگ کا کچھ کھدر ...." ارے یہ کیا اٹھا لائی ؟"
ماں نے کچھ حیرانی اور کچھ غصے سے بیٹی کی طرف دیکھا .....

"امی جی دیکھیے نا —— کتنا پیارا رنگ ہے اس اون کا —— ہمارے

اسکول کے بچوں کی یونیفارم کا رنگ یہ ہے ــــ اور کھدر بھی سیل میں سستا مل گیا.."
"آخر تو ان کا کیا کرے گی ؟ "

"آپ میرا ہاتھ بٹا دیں گی نا ! تین یا چار سویٹر بچوں کے اس میں بن جائیں گے۔ آپ تو اتنا اچھا بنتی ہیں اور کرتے لڑکیاں گھروں پر ہی سلوالیں گی . . . "

" یہ بیگار کس نے تجھے پکڑوادی آخر" اب انھیں غصہ آچلا تھا ــــ "اور روپے کیا کیے سارے ؟ "

" امی جی پیاری ــــ ناراض نہ ہوئیے ــــ سبھی روپے خرچ ہو گئے۔ پچاس روپے کا تو یہ سامان آ گیا . . . . . بیس کی آپ کی شال . . . اور ۱۵ کا یہ دیکھیے یہ کیسا خوبصورت اون، اپنے سویٹر کے لیے لائی ہوں ــــ امی جی ــــ میرے کچھ بچے بہت عزیز ہیں۔ میں یہ اون اور کھدر ان کے واسطے لائی ہوں ــــ آپ ہی نے تو کہا تھا کہ تیرے پیسے ہیں جیسے چاہے خرچ کیجو ــــ " اس کی آواز میں خوف بھی تھا اور خوشامد بھی !

ماں کچھ دیر جوان بیٹی کا منھ یوں تکتی رہی جیسے پہلی بار دیکھ رہی ہوں ! امنگوں، آرزوؤں، شوق اور خواہشوں کی یہ عمر اور یہ ایثار ! پھر ماں کے ہونٹوں پر ایک دلکش مسکراہٹ اور آنکھوں میں ہنسی اور آنسوؤں کی ملی جلی چمک جاگی اور بھرے گلے سے وہ اتنا کہہ سکیں۔

" مگر . . . . . مگر تیری شال نفیسہ . . . . . "

" میری شال ؟ ارے امی جی پیاری میری اس شال سے زیادہ حسین شال کس کے پاس ہے بھلا ــــ دیکھیے ــــ اس میں ماں کا حسن، محبت و خلوص کا رنگ ہے، محنت اور جفا کشی کی گرمی ہے اور ماں کی محبت . . . . کا تانا . . بانا . . . . . "

اس نے زور سے ماں کو اپنے سے لپٹا لیا ــــ " امی جی میری ! "

ممتا کی آنکھوں کو بھی بیٹی کبھی اتنی پیاری نہ لگی تھی ! لالٹین کی دھندلی پیلی روشنی میں اس کا چہرہ ایثار و انکسار کے عجیب رنگوں میں رنگ گیا تھا، ہونٹوں

پر مدھم مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں سچی مسرت کی دمک، ماں کی آنکھیں فخر سے چمک اٹھیں اور ممتا سے چھلک گئیں ——

پھر دونوں ایک ساتھ ہنسنے لگیں۔

۵

میاں ابیوی!

چند ثانیے کے لیے گہری بھوری پتلیاں ایک سے دوسرے کی طرف گردش کرتی رہیں جیسے وہ سوچ رہی ہوں، سننے کی کوشش کر رہی ہوں کہ یہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں، کیا کر رہے ہیں۔۔۔ میاں نے محسوس کیا کہ ڈوبتی نبض واپس آ رہی ہے۔ زرد چہرے پر ہلکی سی سرخی جھلک آئی ہے اور پلکیں ایک دوسرے سے جدا ہیں، اور وہ ان کو دیکھ رہی ہیں۔۔۔ مایوسی کا اندھیرا چھٹ گیا اور امید کی کرن دمک اٹھی۔

ہلکی سی ہنسی ان کے بے رنگ ہونٹوں پر ابھری۔۔۔ جیسے مرجھاتا پھول نسیم سحر کے جھونکے سے اچانک شگفتہ ہو جائے۔۔ "ارے یہ تم سب کو کیا ہوا۔۔ کیا تم سمجھے میں مر رہی ہوں۔۔۔؟"

"نہیں خدا نہ کرے۔۔۔۔ آپ بے ہوش ہو گئی تھیں۔۔۔ تو سب گھبرا گئے" بھاوج نے بات بنانی چاہی مگر زبان لڑکھڑا رہی تھی۔۔

"بے ہوش؟" کیسی سریلی ہنسی کی جھنکار تھی "بٹیا۔۔۔ ایسی بے ہوشی پر ہزار ہوش مندیاں نچھاور کی جا سکتی ہیں! میں تو اب ٹھیک ہوں۔" میاں کو اتنا پریشان حال تو انھوں نے کبھی بھی نہ دیکھا تھا۔۔۔ آنکھیں درد و غم کی جھیلیں، ماتھے اور چہرے پر جھریاں، وہ تو ساٹھ برس کی عمر میں "ساٹھے پاٹھے" کہلانے والے

مردوں میں سے تھے یہ ایک دم انھیں کیا ہوا؟

بیوی کے بڑھتے ہوئے ہاتھ کو ہاشم علی چند ثانیے دیکھتے رہے اور پھر آہستہ سے اپنا کانپتا ہاتھ اس پر رکھ دیا ـــــ ان کے ماحول اور مشرب میں بیوی سے اظہارِ محبت صرف رات کی تاریکی اور تنہائی میں جائز تھا... اور پرانی تہذیب و قدامت پسندی کی بدولت بھی اس وقت بھی وہ کھلتے نہ تھے۔ مگر اس وقت ان کے ہاتھ میں جو گرمی، جو پیار، محبت کی جو لہریں تھیں ....! آہ بتیس برس کے ریاض کے بعد انھیں محبت کی وہ دولت مل گئی جس کے لیے ہمیشہ ان کی روح تڑپتی رہی تھی؟

وہ خیالات میں کھو گئیں اور آنکھیں بند ہو گئیں اور میاں بیوی کو ایک ٹک دیکھتے رہے....

کیا دیا انھوں نے اپنی اس ستی ساوتری بیوی کو؟ کیا عورت صرف ضروریاتِ زندگی کی بھوکی ہوتی ہے؟ کیا شوہر کا فرض صرف نان و نفقہ دے کر ادا ہو جاتا ہے اور اس ذرا سے مادی فائدے کے بدلے وہ کیا کچھ اس سے نہیں لیتا۔ نہیں لینا چاہتا۔ خدمت! اطاعت! خاندانی فرائض! ہر حکم پر سر جھکانے کی عادت! روکھا سوکھا کھا کر اور موٹا جھوٹا پہن کر بھی مسکراتے رہنے اور محبت کے بدلے محبت نہ پا کر بھی پریم، شردھا اور عقیدت کے پھول قدموں پر نچھاور کرتے رہنے کی خواہش ـــــ وفا بے وفائی کے بدلے، توجہ بے اعتنائی کے بدلے ـــــ یہ سب مرد کا حق ہے ـــــ یہ سب عورت کا فرض ہے ـــــ جانے اور ان جانے ایسی کتنی باتیں ذہن، دل اور دماغ میں بچپن سے بیٹھی ہوئی تھیں! انھوں نے اپنی بیوی سے یہ سب چاہا ـــــ اور کون کہہ سکتا ہے کہ کیا کچھ نہ پایا ـــــ مگر اسے کیا ملا؟ کیا دیا انھوں نے؟ زندگی کی صرف ایک مسرت اُسے حاصل ہوئی اور وہ بھی چھن گئی ـــــ تب بھی انھوں نے اس کے دل کا درد نہ سمجھا! اس کی آنکھوں میں جھانکتی بھوک، اس کے ہونٹوں پر کانپتی مسکراہٹ اس کی پلکوں پر لرزتے

آنسو نہ دیکھے۔

لیکن ــــ وہ اسے چاہتے تو ہمیشہ سے تھے ــــ یہ بے نیازی اور بے رخی ہمیشہ سے تو نہ تھی۔ جب وہ ان کی زندگی میں آئی ــــ الھڑ، حسین، چنچل، ہنسوڑ، ملنسار، شوقین طبیعت کی لڑکی "تو وہ پہلی نظر میں مسحور نہیں ہو گئے تھے؟ ان کا دن، رات کے انتظار میں نہیں گزرتا تھا؟ ان کی راتیں اس کی زلفوں کی چھاؤں میں سورگ کا نمونہ نہ ہوتی تھیں کیا...؟ وہ اس کے لیے نت نئے تحفے لاتے، اس کی ہر خوشی اور خواہش پوری کرنے کی کوشش کرتے ــــ ہاں وہ کم گو اور کم آمیز ضرور تھے ــــ ان کے بھائی بہن چھیڑا کرتے تھے۔ وہ بے ہنسوڑ اور یہ ہیں ہوں منقطع میرا تیرا جوڑ نہیں!

تو وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بیوی کی طرف دیکھتے تو اس کی آنکھوں میں محبت کی نرم نرم لہریں ابھرتی دیکھ کر ان کا دل مسرت سے پھول اٹھتا اور پھر وہ نندوں اور دیوروں کے ساتھ ہنسی کی پھلجھڑیاں سارے گھر میں بکھیر دیتی!

"آپ ــــ کیا سوچ رہے ہیں" اس کی دھیمی آواز نے انھیں جیسے خواب سے چونکا دیا.... ان کا ہاتھ اب بھی اس کے ہاتھ پر تھا ــــ "تم سوئی نہیں نا؟" ان کی سمجھ میں نہ آیا اور کیا کہیں!

"صاحب! کیا بتاؤں ــــ اتنی دیر سے... جانے کل سے کہ برسوں سے ــــ کب سے میں پڑی ہوں... مگر ــــ میں بے ہوش نہ تھی ــــ ہوش میں بھی نہ تھی ــــ یہ جانتی تھی کہ آپ میرے پاس ہیں، یہ محسوس کرتی تھی کہ اماں مجھ پر پڑھ پڑھ کر پھونک رہی ہیں ــــ بٹیا میری خدمت کر رہی ہے مگر ساتھ ہی ساتھ ــــ ایک اور دنیا بھی تھی.... کیا بتاؤں ــــ کیسے بتاؤں" وہ اتنے ہی میں پسینے میں نہا گئیں!

"تم ــــ زیادہ بولو نہیں ــــ تھک جاؤ گی ــــ ڈاکٹر نے منع کیا ہے ــــ"

"ہنہ، ڈاکٹر کیا جانے میرے دل کا حال ..... مجھے بولنے سے مت روکیے ..... کہنے دیجیے ..... جانے پھر کہہ سکوں .... یا ....." ایک حزیں مسکراہٹ ان کے سارے چہرے پر پھیل گئی ـــــ میاں نے سر جھکا لیا اور آنسو پی گئے!

"میں نے دیکھا .... ایک باغ ہے ـــــ رنگ برنگے پھولوں سے ڈھکا ایک کنج ہے ... سنہری روپہلی چمک دار تاروں کی جالی سے گھرا ہوا .... کہ بس جگ مگ کر رہی ہے .... میں اس کے بیچ میں بیٹھی ہوں اور میرے سارے بچے سبھی تو .... وہاں ہیں ـــــ بھائی صاحب اور بھائی جان کے بچے، باجی اور بٹیا کے بچے، رجو اور منجھلی کے بچے، اور پھر وہ سارے بچے، میرا طلوا، میری نورو، میرے نیموا اور کلوا ـــــ سب نے مجھے گھیر رکھا ہے .... سب چھوٹے چھوٹے سے ہیں ... کندھوں پر چڑھے تھے، گلے میں جھول رہے تھے، سینے سے لپٹے تھے .... کھانے کی چیزیں لے کر کھا رہے تھے .... اور پھولوں کی برکھا ہو رہی تھی۔ موتیوں کی بکھیر .... اور .... اور جانے کیسا کنج تھا ـــــ کیسا سپنا تھا ـــــ مگر نہیں یہ سپنا تو نہ تھا ـــــ" ان کی آواز سرگوشی سے اب کچھ ہی زیادہ تھی! اماں اور بٹیا کی آنکھوں سے جھر جھر آنسو بہہ رہے تھے اور ہاشم علی کا پورا جسم ضبط کی کوشش میں لرز رہا تھا!

ـــــ چند منٹ تک وہ آنکھیں بند کیے خاموش پڑی رہیں ـــــ پھر چونکیں "ارے یہ سب کیوں آگئے ـــــ امتحان چھوڑ کر ـــــ مجھے دیکھنے؟ میں ایسی بیمار تو نہیں ـــــ پھر منجھلی کی تو بچی چھوٹی ہے .... اور نیموا ـــــ اور کلوا ـــــ آہ ـــــ وہ کیوں نہ آئے ـــــ کیوں نہ آئے وہ!" ان کی آنکھوں کے گوشوں سے آنسو لڑھک لڑھک کر تکیے میں جذب ہو رہے تھے اور اب وہ پھر خاموش تھیں!

"ہاں وہ کیوں آتے؟ کیوں آتے بیمار ممانی اور چچی کو دیکھنے ـــــ؟ کیوں آتے ہم جان پھوپھی سے ملنے ـــــ؟ وہ تو خدمت کرنے کے لیے

تھی ــــــ مصیبت جھیلنے کے لیے ساری عمر ان پر قربان کرنے کے لیے...."

اماں بی بڑبڑا رہی تھیں اور بٹیا سوچ رہی تھی ــــــ "کوئی ــــــ کوئی بھی تو نہ آیا۔ باجی نے عمر بھر سب کی خدمت کی، سب سے محبت کی اور ان کو اس کا یہ ثمر ملا؟ اگر میں بھی نہ آسکتی تو؟" ہاشم علی بُت بنے بیٹھے تھے ــــــ "میرے خاندان والوں کو جتنا پیار، جتنی اپنائیت ــــــ جتنی محبت امینہ نے دی ــــــ کسی اور نے اس کا دسواں حصّہ بھی تو نہ دیا تھا ــــــ مگر اس کو کیا دیا انھوں نے؟ وہ صرف پیار کی بھوکی تھی ــــــ اپنی مامتا کو سیراب کرنا چاہتی تھی ــــــ غیروں کو اپنا بنا کر روح کا کرب مٹانا چاہتی تھی ــــــ مگر...." اور پھر ان کی سوچوں کا رُخ دوسروں سے اپنی طرف ہو گیا....

"اوروں کو کیا کہوں ـ خود.... میں نے اسے کیا دیا ــــــ سال ڈیڑھ سال کی جذباتی محبت کے بعد ــــــ کیا میں خود اس سے دور نہیں ہوتا چلا گیا ــــــ مگر کیوں ایسا کیوں ہوا؟ جب مُنّا پیدا ہوا، اس وقت وہ کتنے خوش تھے ــــــ کتنی فکر تھی انھیں اپنی نازک اندام بیوی کی ــــــ کتنے خوش تھے وہ جب ان کی ڈالی کا پہلا پھل، ان کی محبت کی پہلی نشانی، ان کی زندگی کا حاصل کسی نے ان کی گود میں ڈال دیا تھا، بڑی بڑی کالی چمکتی آنکھیں، گھونگھریالے کالے نرم بالوں سے ڈھکا مُنّا سا سر اور گلابی گلابی مٹھیاں ــــــ جیسے کرشن جی کا بال پن زندہ ہو گیا ہو ــــــ انھوں نے بے اختیار اسے چھاتی سے لگا لیا تھا ــــــ اور سارے بہن بھائی، ماں اور خالہ پھوپھی ہنس پڑی تھیں اس والہانہ انداز پر....

دونوں ہی بچے پر پروانہ وار نثار تھے ــــــ امینہ کا رنگ، مادریت کے جلال سے کندن کی طرح دمک اٹھا تھا اور آنکھوں میں مامتا کے دیے چمکتے رہتے تھے.... جیسے جیسے بڑا ہوتا گیا اور پیارا ہوتا گیا ــــــ ان دونوں کا کیا ذکر خاندان کا ہر فرد اس پر جان دیتا.... اور باپ کا کتنا چہیتا تھا ــــــ وہ اسکول سے آتے تو اسے دروازے پر کھڑا پاتے جو انھیں دیکھتے ہی ڈولتی ٹانگوں

باپ کی چھاتی سے لگ کر رونا بھول جاتا اور ماں کو چڑاتا مُنّا آیا ـــــ اماں کا نا ہیں؟ سے دوڑتا کبھی گر بھی پڑتا تو ادھر سے ماں دوڑتیں ـــــ ادھر سے باپ ـــــ وہ
اور امینہ کی چھاتی مسرت سے پھول اٹھتی ..... مگر آہ! مسرت کی یہ گھڑیاں پلک
جھپکتے بیت گئیں ..... دو دن کے بخار میں مُنّا چٹ پٹ ہو گیا اور ان دونوں کی
زندگی کو ویران کر گیا .....
حادثہ اتنا سخت، صدمہ اتنا جان لیوا تھا کہ سب یہ سمجھتے تھے کہ ماں باپ
دونوں کی جان بھی خطرے میں ہے ..... مگر وہ تو جھیل گئے یہ پہاڑ! انھوں نے اپنی
صابر بیوی کے چہرے پر نظر ڈالی ـــــ کیسے سہارا ہو گا اس کی ماممتا نے اس
کاری زخم کو؟ خود انھوں نے تو خدا کی عبادت میں اپنے زخم کا مرہم تلاش کر لیا
تھا ..... پھر دھیرے دھیرے اپنے اسکول کے کاموں میں لگ گئے، دنیا کے دھندوں
میں کھو گئے ـــــ مگر امینہ ـــــ یہ بدنصیب ؟؟
برسوں وہ دونوں ـــــ اس آس میں رہے کہ ان کی تمنا کی شاخ پھر ہری
ہو گی! پھر ایک ننھا سا وجود ان کی زندگی میں آئے گا جو زخم کا مرہم بنے گا .....
مگر امید بندھتی اور ٹوٹ جاتی ـــــ کئی "کچے بچے" جاتے رہے ـــــ پورا ایک بھی
نہ ہوا ـــــ ہر بار امینہ موت کے منھ سے بچ جاتی اور ایک نیا داغ دل پر سہارتی
ـــــ لوگوں نے انھیں بہت مشورے دیے کہ وہ دوسری شادی کر لیں ـــــ
لڑکیوں کی ماؤں نے ڈورے ڈالے ـــــ خاندان کا نام ـــــ وارث، دل کا
چین ..... مگر امینہ کو وہ کس قصور کی سزا دیں؟ ان کا دل نہ مانا ـــــ اور سب
مشورے سب کوششیں بے کار گئیں!
مگر ..... مگر ..... کیا یہ حقیقت نہ تھی کہ وہ امینہ پر سوت نہ لا کر یہ سمجھتے رہے
کہ انھوں نے اس پر ایسا احسان کیا ہے جس سے وہ سر نہیں اٹھا سکتی ـــــ وہ
یہ نہ سمجھ سکے کہ سوت نہ لا کر بھی اس سے دور ہوتے گئے، لاپروا ہوتے گئے،
بے رخی بڑھتی گئی ..... مگر اس نے کبھی حرفِ شکایت منھ سے نہ نکالا ـــــ

ان کے احسان سے وہ اس طرح دب گئی کہ ان کے لیے جان دینے کو بھی تیار تھی .... وہ آنکھوں میں تڑپتی محبت کی بھوک کو پہچان نہ سکے ــــــ انھوں نے خدا کی عبادت میں سکون حاصل کیا تو امینہ نے اس کے بندوں کی خدمت میں؛ خاندان بھر کے، محلے بھر کے بچوں کی خدمت کر کے وہ دل کو سکون دے لیتی۔ ہر ننھا بچہ اس کی محبت کا مرکز بن جاتا ــــــ اور جب وہ بچے اپنے ماں باپ کے ساتھ کہیں چلے جاتے یا بڑے ہو کر اس سے چھٹ جاتے تو وہ ذرا بھی دل تنگ نہ ہوتی اور کسی اور بچے یا بچوں پر ممتا کے موتی نچھاور کرنے لگتی .....

مگر.... گذشتہ دس سال سے ــــــ جب سے وہ کنبے سے الگ ہو کر، اپنے قصبے میں، آبائی مکان میں آ کر رہے تو ایک دوسرے کے لیے لازم ملزوم سے ہو گئے تھے ــــــ کہنے کو سبھی تھے نوکر چاکر، غریب عزیز، بے پالک یتیم بچے، مگر امینہ میاں کی ہر خدمت، ہر کام، اپنا فرض سمجھتی تھی۔ اس کے بھائی بہن بلاتے تب بھی وہ میکے نہ جاتی یا دس پانچ دن میں واپس آ جاتی "ان کو تکلیف ہو گی" بس اتنا ہی کہتی ــــــ مگر اس ایک جملے میں محبت کی جو دنیا چھپی ہوتی اس سے ہاشم علی واقف نہ ہوں اور لوگ ضرور آگاہ تھے ــــــ مگر وہ خود بھی تو .... اس دس سال میں اس سے نزدیک ہوتے گئے تھے ــــــ دو دن کے لیے کہیں چلے جاتے تو گھبرانے لگتے ــــــ "گھر اکیلا ہے ــــــ ان کو انتظار ہو گا...." وہ غیر شعوری طور پر ایک دوسرے کا سہارا بن گئے تھے.... دوستی اور محبت کی ایک دھیمی، بے آواز، نرم رو ندی دل و دماغ کی گہرائیوں میں بہہ رہی تھی جس کا شعوری احساس دونوں میں سے کسی کو بھی نہ تھا ــــــ مگر امینہ کے دل کے دورے کے بعد..... ہاشم علی پر ساری باتیں جیسے آئینہ ہو گئی تھیں....

اس کے ہونٹ ہل رہے تھے "جائیے گا نہیں ــــــ نہیں ــــــ

میرے پاس رہیے گا ــــ" انھوں نے جھک کر کان لگایا تو یہ ٹوٹے جملے سنائی دیے اور دونوں ہاتھوں سے انھوں نے بیوی کا سر تھام لیا ــــ" امینہ ــــ امینہ ــــ میں یہیں تو ہوں آنکھیں کھولو ــــ"

امینہ نے اپنی گہری کالی آنکھیں وا کیں .... ان آنکھوں میں پچاس سال کی ساری یادیں جھانک رہی تھیں ــــ زندگی کے تجربوں، تلخیوں، مسرتوں، محرومیوں اور نعمتوں کا سارا شعور ان میں سمٹ آیا تھا ــــ جیسے بجھتی لو ایک دم بھڑک اٹھتی ہے ...... ہاشم علی کی درد و مسرت اور آنسوؤں میں ڈوبی آنکھوں سے آنکھیں لڑیں اور دل نشیں مسکراہٹ بوڑھے، بیمار خشک ہونٹوں پر دوڑ گئی !

" بھیا ... کب آ رہے ہیں ؟ " وہ کچھ اور نہ پوچھ سکی ۔

" پرسوں پہنچ جائیں گے تار آ گیا ہے ! " بٹیا نے پائنتی سے جواب دیا !

" پرسوں ! بہت دور ہے .. . پرسوں ! " اور پھر ان کا سر تکیوں میں دھنس گیا ۔

" دیکھیے دیکھیے بھائی صاحب ــــ باجی بے ہوش ہو گئیں کیا " بٹیا نے روتے ہوئے کہا۔

" نہیں تھک گئی ہیں ــــ سو جائیں تو اچھا ہے ۔ " میاں نے آہستہ سے کہا۔

" نہیں نہیں ــــ میں جاگ رہی ہوں ــــ جانا نہیں ــــ نہیں جانا ۔"

اور ان کے ہاتھ کی گرفت شوہر کے ہاتھ پر ذرا اور مضبوط ہو گئی ! کئی منٹ یوں ہی بیت گئے ــــ

اماں اب بھی سجدے میں پڑی گڑگڑا رہی تھیں ۔ بٹیا سرد پیروں کو دبانے کی کوشش کر رہی تھی .... اور میاں کی نظریں بیوی کے چہرے پر جمی تھیں !

" ذرا ... دیکھیے .... یہ کون ہے ــــ یہ میرے برابر کون بچہ بیٹھا ہے .... "

بیوی نے دونوں ہاتھوں سے بستر کے دائیں جانب ٹٹولنا شروع کیا ــــــ آنکھیں بند تھیں، ہاتھ حرکت کر رہے تھے . . .

وہ کانپ کر کھڑے ہو گئے .... بٹیا نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور روتے ہوئے بولی " بھائی صاحب ــــــ بھائی صاحب ــــــ باجی کیا کہہ رہی ہیں۔ ڈاکٹر کو لائیے نا ــــــ"

" اب کوئی امید نہیں .... وہ انھیں لینے آچکا ہے! "

" کون بھائی صاحب ــــــ کون آ گیا ؟ "

" مُنّا ــــــ میری جان ــــــ میرا لال ــــــ میرا بچہ ــــــ آ گئے تم ــــــ"

یہ کیسی جاندار آواز ان کے ہونٹوں سے نکل رہی ہے؟ ــــــ کیسی پیاری مسکراہٹ چہرے پر کھیل رہی ہے ؟

میاں نے تڑپ کر بھٹکتے ہاتھوں کو تھام لیا ــــــ اور پھر انگلیاں نبض پر رک گئیں ــــــ

" ان کا بچہ انھیں لینے آ گیا بی بی ــــــ " ہاشم علی نے درد میں ڈوبی آواز میں کہا اور پٹی پر سر جھکا دیا ــــــ

" مُنّا لے گیا اپنی ماں کو .... "

اور زندگی میں پہلی بار سب نے دیکھا کہ ہاشم علی بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہے ہیں!

انمول موتی

نکاح ہو چکا تھا اور شادی کا ہنگامہ اپنے شباب پر پہنچ گیا تھا ـــــ
سمدھنوں کی آؤ بھگت، مہمانوں کی یورش، بچوں کی چیخ پکار، جہیز کی نمائش،
منتظموں کا گلا پھاڑنا۔

وہ تین دن سے کام کرتے کرتے شل ہو چکی تھی۔ اس کے ذمے کوئی خاص
کام نہ تھا، پھر بھی ہر کام کے لیے اس کی پکار پڑتی تھی۔ کوئی نہ بھی کہتا، تب بھی
وہ خود ہی بگڑے کام کو سنوارنے پہنچ جاتی۔ مانا کہ وہ مہمان کی طرح شریک
ہے مگر کام تو اسی کا ہے۔

"دولھا آرہا ہے" کا شور برپا ہوا۔ اس کا کمزور دل زور زور سے
دھڑکنے لگا۔ ایک بار دولھا کو کلیجے سے لگا لینے کو وہ بے قرار ہو اٹھی۔ ہے
تو وہ آخر اسی کا بیٹا۔ "بیٹے اور داماد میں فرق ہی کیا ہوتا ہے۔ مگر وہ مجھے
کیا جانے؟ وہ تو آپا کو ساس سمجھ رہا ہے، جو سب کچھ کر رہی ہیں۔ سوچے گا
یہ کون عورت بلا کی طرح چمٹ گئی؟"

وہ اس ہنگامے سے کھسک کر چپکے سے اوپر چلی گئی اور کاٹ کباڑ کی
کوٹھری میں جو چھوٹی سی کھڑکی تھی اس میں جا کر بیٹھ گئی۔ سر چکرا رہا تھا،
دل اندر سے پیسا جا رہا تھا، اور سارا جسم اس سردی میں پسینے سے بھیگا

ہوا تھا۔

"ہاں، یہ جگہ ٹھیک ہے۔ یہاں سے لیلےٰ اور دولھا کو اچھی طرح دیکھ سکوں گی۔ اور پھر — میرا منحوس سایہ بھی میری لاڈلی پر نہ پڑے گا۔"

نیچے اندر کے بڑے کمرے کا دروازہ کھلا، عورتوں اور بچوں کا ایک غول باہر نکلا۔ باہر کھڑے بیٹھے لوگ بچے اور عورتیں ادھر لپکیں، جدھر سے دولھن آ رہی تھی۔۔۔۔ وہ اور زیادہ جھک گئی۔۔۔۔ اپنی خالہ زاد بہنوں کے سہارے لیلیٰ آ رہی تھی۔ اس کے سبک نازک پاؤں کتنے دھیرے دھیرے اٹھ رہے ہیں۔ کہ پھولوں کی بکھری پنکھڑیاں ان کے نیچے آ کر مسلی نہیں جا سکتیں۔ آتشیں گلابی کامدانی کے دوپٹے کا آنچل ڈھلک کر ماتھے تک آ گیا ہے اور اس پر لگی سنہری کرن اس کے شرم سے تمتماتے ہوئے چہرے کے سامنے ماند پڑ گئی ہے۔ ہونٹ ضبطِ گریہ کی کوشش میں یوں کانپ رہے ہیں جیسے گلاب کی نازک پنکھڑیاں صبح کی ٹھنڈی ہوا سے لرز اٹھتی ہیں۔ لمبی سیاہ پلکوں پر چند موتی آ کر رک گئے ہیں اور بید کا سا نازک جسم بھاری جوڑے سے لچکا جا رہا ہے۔

نظروں ہی نظروں میں وہ اس کی بلائیں لیتی، اور دل ہی دل میں دعائیں مانگتی رہی، "الٰہی میری بچی کا نصیب اپنی ماں کا سا نہ ہو۔ الٰہی یہ رسے بسے، خوش رہے۔"

اپنا سر اس نے چوکھٹ پر ٹیک دیا۔ آنسوؤں کے آبشار کے پردے کی اوٹ سے لیلیٰ اس سے کتنی مشابہ نظر آ رہی تھی۔

اور پھر اسے ایسا لگا کہ یہ لیلےٰ نہیں وہ خود ہے۔ بائیس سال کا عرصہ درمیان سے غائب ہو گیا۔

ایسے ہی شور و ہنگامے کے درمیان، یوں ہی شرم و حیا کے بوجھ اور بھاری کارچوبی جوڑے کے وزن سے دبی وہ دالان سے صحن میں لائی گئی تھی۔۔ اور پھر دولھا نے اس کا گھونگھٹ الٹ کر سورۂ اخلاص اس کے منھ پر زور سے

پھونک مار کر دم کی تھی۔ اس کا دل چاہا تھا کہ وہ ذرا سی آنکھ کھول کر اپنے دولہا کو دیکھے، جس کے حسن و جمال کے بہت سے قصے سن چکی تھی، مگر شرم نے اس کی اجازت ہی نہ دی ـــــ اس کی بہنوں اور سہیلیوں کے فقرے اور قہقہے اور دولہا کے جھلائے ہوئے جواب البتہ اس کے کانوں میں پڑتے رہے تھے۔ مگر یہ آنکھیں بند ہی رہیں، جن سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے ـــــ اور جب دبلے پتلے دولہا نے اسے اٹھایا تھا تو وہ ہانپ گیا۔ ڈولے تک لے جاتے ہوئے اس نے اپنا منہ اس کے کان کے پاس لا کر آہستہ سے کہا تھا۔ "زندگی میں اتنی بھاری بوجھ بن کر نہ رہنا میری جان۔" فکر و شرم سے وہ لرز اٹھی تھی۔ پھر دولہا نے ڈولے میں لا کر اسے پٹک ہی دیا تھا۔ بڑی بوڑھیوں نے جس پر خوب لے دے کی تھی۔

اس نے آنکھیں کھولیں تو کھڑکی کے میلے دھندلے شیشے پر اس کی نظر پڑی۔ آہ اس کا وہ بھرا بھرا جسم کیا ہوا؟ وہ چمکدار آنکھیں جن کے حسن کے ترانے اس کا شوہر گاتا تھا، وہ گھنیرے سیاہ بال، جن کو وہ کالی گھٹا سے تشبیہ دیا کرتا تھا، وہ گندمی رنگت جس پر ہر رنگ کا لباس نکھر اٹھتا تھا، یہ سب کہاں گئے؟ شیشے میں چالیس سال کی جوان خوبصورت عورت کی جگہ ایک ہڈیوں کا ڈھانچہ بڑھیا جھانک رہی تھی، جس کے گالوں پر زمانے کی مصیبتوں نے جھریوں کا جال بن دیا تھا۔ کھچڑی بالوں کی الجھی لٹیں زرد چہرے پر بکھری ہوئی تھی۔ حسن جوانی اور مسرت کی تصویر مٹ چکی تھی۔ بڑھاپے، مصیبت اور غم کی مورتی باقی رہ گئی تھی۔

آہ قسمت نے اس کے ساتھ کیسا کھیل کھیلا تین چار سال مسرت و محبت کے سایے میں یوں پلک جھپکتے بیت گئے کہ پتا ہی نہ چلا۔ ہائے وہ کیا جانتی تھی کہ یہ بہار عارضی ہے۔ اس کے بعد دائمی خزاں منہ کھولے کھڑی ہے اس نخلستان کی چھاؤں میں چند دن بسر کرکے اسے عمر بھر کے لیے تپتے ریگستان میں چھوڑ دیا

جائے گا۔ یہ اٹھارہ سال تھے کہ اٹھارہ صدیاں جو اس پر بیت گئیں ان کا دکھ صرف وہی سمجھ سکتی ہے!

اُس کا کیا قصور تھا۔ یہ وہ کبھی نہ سمجھ پائی۔ ضرور اس سے کوئی غلطی ہوئی ہوگی معصوم ہونے کا دعویٰ کون کر سکتا ہے؟ وہ بھی نہیں کرتی۔ وہ تو اتنی الھڑ، ناتجربہ کار بلکہ بے وقوف تھی کہ زمانے کے نشیب و فراز اور دنیا کی چالوں کو آج بھی پوری طرح نہیں سمجھ پائی۔ جس قصور کی اسے ایسی سخت سزا ملی وہ یہی تھی نا کہ وہ اپنے میاں کی سرد مہری اور رکھائی سے پریشان ہوگئی تھی۔ اور میکے کی بڑی بوڑھیوں کے بتائے ہوئے ٹونے ٹوٹکے اور تعویز گنڈے کرنے لگی تھی۔ مگر محبت کے جرم کی ایسی سزا! وہ یہ کیوں نہ سمجھے کہ ان کی محبت حاصل کرنے کے لیے ہی تو اس نے حماقتیں کی تھیں۔ وہ کیوں دشمنوں کے بہکائے میں آ گئے کیوں اس سے بدگمان ہو گئے؟ ہائے کس جرم پر اس کے دو سال کے ہنستے کھیلتے بچے کو اس سے چھین لیا گیا۔ جس کو پھر وہ آج تک نہ دیکھ سکی۔

مگر اس نے یہ سب کیا ہی کیوں؟ اپنی محبت کی گرمی اور خدمت کے جادو سے شوہر کی سرد مہری کو کیوں دور نہ کیا؟ اس کی کڑوی کسیلی باتوں اور طعن و طنز کو چپ چاپ کیوں نہ سہار لیا؟ مگر آج یہ سب باتیں وہ سوچ سکتی ہے۔ سمجھ سکتی ہے کہ ایسا کرتی تو وہ اپنے گھر کی ملکہ، اپنے شوہر کی رفیقِ حیات، اپنے بچوں کی ماں ہوتی جس کی دنیا میں عزت ہوتی، حق ہوتا، جگہ ہوتی۔ ایک بے سہارا، ٹھکرائی، بے مایہ عورت بن کر غیروں کے ہاتھوں اپنی اکلوتی بچی کو رخصت تو نہ کرتی۔

"ہائے رے اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ اسے تو ہوش جب آیا جب وہ اپنی بیوہ ماں کے گھٹنے سے آ لگی۔ بچہ چھین لیا گیا اور چھ مہینے بعد اس نے ایک کمزور سی بچی کو مر مر کر جنم دیا۔ مگر لاکھ بلانے پر بھی اس کا شوہر نہ آیا۔ اور ہمیشہ کے لیے اس سے قطع تعلق کر لیا۔

کیسی بدنصیب بچی تھی جو پیدا ہونے سے پہلے ہی باپ کی شفقت سے

محروم ہوگئی۔ کاش پیدا ہی نہ ہوئی ہوتی۔ مگر پھر اس کی زندگی کا کیا سہارا رہ جاتا وہ لیلیٰ پر پروانہ وار نثار تھی۔ لوگ کہتے تم لڑکی کو بگاڑ رہی ہو۔ کوئی کہتا اسے بھی میاں کے پاس پھنکوا دو۔ سانپ کے سپنولیے ہی ہوتے ہیں۔ ہائے وہ اس کے دل کی حالت کیا سمجھتے جس کے پاس زندگی کی ہر دولت لٹا کر بس یہ انمول ہیرا باقی رہ گیا تھا۔

بیوہ ماں جب تک زندہ رہیں بیٹی اور نواسی کو چھاتی سے لگائے رہیں۔ مگر ان کے بعد یہ سات سال کی بچی تھی، وہ تھی اور خدا کی ذات۔ بڑی بہن اور چھوٹے سوتیلے بھائی نے اسے اپنے پاس بلا کر رکھنے پر اصرار کیا۔ کاش کہ اسی وقت اسے سمجھ آگئی ہوتی۔ کاش وہ بچی کو لے کر اس کے باپ کے پاس چلی گئی ہوتی تو شاید اس کا دل پگھل جاتا۔ مگر اس کی مجروح خودداری نے یہ برداشت نہیں کیا کہ جہاں سے ٹھکرا کر نکالی گئی ہے پھر وہاں جائے۔ پھر اس نے سنا کہ اس کے شوہر نے دوسری شادی کرلی اور ظاہر ہے کہ سارے دروازے اس کے لیے بند ہو گئے۔

وہ آپا کے ہاں چلی آئی اور انھوں نے لیلیٰ کو اپنی بیٹی بنا لیا۔ جمیل ان کا اکلوتا لڑکا جوان ہو چکا تھا۔ اور بقول ان کے ان کی مامتا کا بے پناہ جذبہ کسی چھوٹے بچے کے لیے بے قرار تھا..... "رضو لیلیٰ کو مجھے دے دو۔ میں اسے پڑھاؤں لکھاؤں گی۔ بیاہ شادی کروں گی۔ تیرے ساتھ یہ کہاں کی ٹھوکریں کھائے گی۔" یہ جملہ آج تک اس کے دل میں اٹکا ہوا چبھتا رہا تھا۔ مگر پھر بھی بچی کو اس نے آپا کو دے دیا۔ اپنی مامتا کو لیلیٰ کے مستقبل پر نثار کر دیا۔

مگر اس نے تھوڑے ہی دن میں اندازہ لگایا کہ اس کا لیلیٰ کے ساتھ رہنا مناسب نہیں۔ اس نے لاکھ چاہا کہ لیلیٰ ماں کو خالہ کا اور خالہ کو ماں کا درجہ دے سکے۔ زبان سے اس نے اپنے کو خالہ اور بہن کو امی کہلوانا شروع بھی کر دیا۔ مگر منھ بولی ماں لاکھ کرنے پر بھی وہ محبت نہ پا سکی جو اصلی ماں کا حق

تھی۔ اور بے چاری غریب ماں اس محبت کو بچی کے دل سے نہ نکال سکی جس کو وہ اپنے کو حق دار نہ سمجھتی تھی۔

پھر جب اس نے دیکھا کہ آپا کو ان دونوں کی محبت ناگوار ہے تو وہ خود ہی بہانہ بنا کر بھائی کے پاس چلی گئی۔ سال چھ مہینے میں، مہینے بیس دن کے لیے آتی اور بیٹی کی صورت دیکھ کر جلتی ممتا پر ٹھنڈے پانی کا پھایا رکھ لیتی۔ وہ اب اتنی بڑی، اتنی قابل، اتنی مہذب ہو گئی تھی کہ اسے یہ سوچتے ڈر لگتا تھا کہ یہ اس کی لیلیٰ ہے وہ اس سے اظہار محبت بھی کرتی تو چھپ کر کوئی دیکھ نہ لے۔ آپا یہ نہ سمجھیں کہ اپنا حق جتا رہی ہے۔ جب منگنی بیاہ کی بات ہوئی تب بھی وہ بالکل بے تعلق رہی۔ شادی کے انتظام میں بھی دخل نہ دیا۔ جہیز وغیرہ میں بھی اس کی پسند یا خواہش کا کوئی سوال نہ تھا۔ دولہا کو بھی دور سے دیکھا بات تک کرنے کی ہمت نہ کی۔ وہ جانے کیا کہہ دے یہ کون ہے۔ اس کا سر چکرا گیا۔ اس نے سمجھا تھا بیٹی اپنے گھر کی ہو گی تو اس کا بھی ٹھکانہ ہو جائے گا۔ در در کی ٹھوکریں کھانے سے بچ جائے گی۔ مگر اب ؟

نیچے چبوترے پر اس کی تعلیم یافتہ بیٹی اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ میں سر جھکائے ہاتھ میں گلاب کے پھولوں کی مالا لیے کھڑی تھی۔ سامنے اس کا ڈاکٹر دولہا چنبیلی کے پھولوں کا ہار ہاتھ میں پکڑے مسکرا رہا تھا۔ "نئے فیشن کا آرسی مصحف"! اس نے سوچا اور عین اسی وقت تالیوں کے شور کے درمیان دونوں نے ایک دوسرے کے گلے میں ہار ڈال دیے۔ دولھن کی گردن اور جھک گئی۔ دولھا کی آنکھوں میں اور زیادہ نشہ چھا گیا۔ اس کی لاڈلی پرائی ہو گئی۔ اس کی لیلیٰ دوسرے کی بن گئی۔ مگر لیلیٰ اس کی تھی ہی کب؟ غریبی، بے کسی اور بدنصیبی نے اس کے اپنے بچوں کو بھی اس سے چھڑا لیا تھا۔ لڑکا جواب کڑیل جوان ہو گا مگر اس کی آنکھیں اس کی دید کو ترستی رہی ہیں۔ لڑکی جو آنکھوں کے سامنے بھی دوسرے کی بنی رہی آج آپا کی بیٹی بیاہی جا رہی ہے اس کی نہیں۔

"مگر پھر یہ کم بخت کلیجہ کیوں منہ کو آ رہا ہے۔ دل کیوں بیٹھا جا رہا ہے۔

آنکھوں سے آنسوؤں کی برکھا کیوں ہوئے جا رہی ہے۔ لیلیٰ سکھ سے رہے۔ اپنے گھر کی ملکہ بن کر۔ اپنے دولھا کے دل کی رانی بن کر بس میں کچھ نہیں چاہتی۔"

نیچے سے آوازیں آرہی تھیں۔

"رضو کہاں ہے؟"

"خالہ اماں کہاں چلی گئیں؟"

"ارے کہاں چلی گئیں؟"

"ارے کوئی رضو کو ڈھونڈو۔ بچی سے رخصتی کے وقت مل تو لے۔"

"نہیں بھئی دیر ہو رہی ہے۔ کل جب دلھن آئے گی تو مل لے گی تم تو اب خیر سے بسم اللہ کرو۔"

"نہیں نہیں۔ خالہ اماں سے بے ملے کیسے لیلیٰ جا سکتی ہے۔"

"اے لڑکیو، ہٹو سامنے سے دلھن کی بدائی کے سمے بچے سامنے نہیں آیا کرتے۔"

ڈومنیوں نے اپنا فرسودہ مگر پُراثر گیت چھیڑ دیا تھا۔

"کاہے کو بیاہی بدیس رے لکھی بابل مورے"

اس کا سر زور سے چکرایا۔ "تو لیلیٰ اس سے بے ملے ہی چلی جا رہی ہے۔"

زیوروں کی جھنکار، مہندی کے عطر اور پھولوں کی ملی جلی خوشبو کا جھونکا۔

اس کی لیلیٰ۔ اس کی بچی رخصت ہو رہی ہے ۔ ۔ ۔ بے ملے جا رہی ہے — اس کا دل ماں کا دل نہیں ۔ ۔ ۔ بیٹی کا دل ہے۔ ٹھیک بھی تو ہے۔ اس مبارک ساعت میں ماں کا منحوس سایہ لیلیٰ پر کیوں پڑے؟

اس کا رواں رواں لرز رہا تھا۔ کہیں وہ گر نہ پڑے۔ بے ہوش نہ ہو جائے۔

اور پھر دو کومل باہیں اس کے گلے میں حائل ہو گئیں اس نے پلٹ کر دیکھا دلھن بنی لیلیٰ اور اس کا دولھا اسی کے پیچھے کھڑے تھے۔ "میری اماں"

"اماں لیلیٰ آپ کی بیٹی نہ ہو مگر میں آپ ہی کا بیٹا ہوں۔"

دولہا کی بھاری بہ وقار آواز نے سرگوشی کی اور جھک کر اپنا سر اس کے سینے پر رکھ دیا۔۔۔

رضو نے باہیں پھیلا کر دونوں بچوں کو کلیجے سے لگا لیا اور آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار بہہ اٹھی ۔۔۔ آنسو جن میں دکھ اور غم کی جلن نہ تھی۔۔ تلخی نہ تھی بلکہ مسرت اور محبت کی مٹھاس گھلی ہوئی تھی۔

یہ انمول موتی دولہا دلہن کے جھکے سروں پر نچھاور ہو رہے تھے۔

فن کار

سب سے پہلے کوئی دس بارہ برس قبل میں نے اسے دیکھا تھا۔ بڑی بڑی سرخ آنکھیں جن میں بیک وقت وحشت اور ذہانت کا ڈیرا تھا۔ تپے ہوئے تانبے کا سا رنگ، لمبا تڑنگا جسم۔ عجیب بھیانک وضع تھی۔ ہاں جب مسکراتا تو آنکھوں کی وحشت اور چہرے کی خونخواری کہیں غائب ہو جاتی اور ایک دلکش مسکراہٹ جیسے اس کے سارے وجود پر چھا جاتی تھی۔ پہلی نظر میں اس سے ڈر لگتا، پھر ہمدردی پیدا ہوتی اور رفتہ رفتہ انس ہو جاتا تھا۔ اس کے کام کی تعریف سب ہی کرتے تھے۔ اگرچہ جب مہینے مہینے بھر جھک کر وہ آتا تو سب اسے برا بھلا کہتے جسے وہ سن لیتا تھا، ہاں اپنے فن کی تحقیر نہیں برداشت کر سکتا تھا۔ اس کے بارے میں ذرا کچھ کہہ دو تو آپے سے باہر ہو جاتا تھا۔

اس سے مل کر پہلا خیال یہی آتا کہ وہ آرٹسٹ ہے، وہی لاابالی پن، وہی خودداری، وہی تنک مزاجی اور نازک دماغی، وہی اپنے فن پر ناز، پیسے سے بے نیازی اور کام کے پیچھے جان دینے کا جذبہ جو سچے فن کار کی پہچان ہے۔

اس زمانے میں وہ نئی دہلی کی ایک کوٹھی کے گیراج میں مقیم تھا اور وہی میں اس کا "اسٹوڈیو" بھی تھا۔ میں بھی اس کی مداح بن گئی اور اس سے کام کرانے لگی۔ وضع داری کا یہ عالم تھا کہ کئی سال تک آٹھ دس میل دور آکر مجھ

سے کام لے جاتا رہا اور نازک مزاجی کا یہ حال کہ مہینے بھر میں بھی آئے تو کچھ کہنے کی مجال نہ تھی۔ اتنا ہی کہہ پاتی "گوپال۔ تم بہت پریشان کرتے ہو۔ دیکھو اس بار تقریباً ایک مہینہ لگا دیا..... بھلا کیسے اتنے دن انتظار کیا جا سکتا ہے۔ تم سے نہیں ہوتا تو ہیں....."

مگر تو بہ کیجیے۔ بات پوری ہونے سے پہلے وہ ایک لمبی تقریر شروع کر دیتا۔ اسے آپ کچھ کہہ لیں مگر اس کے کام کی ناقدری ؟ "باجی بی۔ آپ تو مجھے دس بیس برس سے جانتے ہو۔ (اس معاملے میں مبالغہ اس کی فطرت تھی) بھلا کوئی دوسرا کر سکے ہے ایسا کام ؟ بولو ؟ ہے کسی مائی کے لال میں اتنا دم جو گوپال جیسا کام کرے ؟ ہاتھ کٹوا ڈالوں ہاتھ ——" اور واقعی چپ ہونا پڑتا۔ اس لیے کہ یہ واقعہ تھا۔

اور پھر ایسا ہوا کہ چند سال تک اس کی خیر خبر نہ ملی۔ کچھ عرصے وہ یاد آتا رہا۔ اس کی کمی محسوس ہوتی رہی مگر پھر سب بھول گئے۔ اس جیسے معمولی آدمی کو بھلا کون یاد رکھتا ہے۔

اچانک، دو ڈھائی برس پہلے، ایک دن دیکھا تو سامنے کھڑے ہیں۔ آنکھیں اور زیادہ ابلی ہوئی، چہرہ اور زیادہ جھلسا ہوا، جسم کی ہڈی ہڈی الگ! جیسے کسی عظیم الشان عمارت کا کھنڈر۔ مگر چہرے پر وہی خلوص، ہونٹوں پر وہی دلکش مسکراہٹ۔

"سلام باجی بی۔ اچھی ہو۔ صاحب کیسے ہیں؟" اور اس نے ایک ایک کا نام لے کر خیر صلا پوچھنی شروع کی اور دوسرے لوگوں سے مخاطب ہو کر بار بار دہراتا "باجی بی تو مجھے برسوں سے جانیں ہیں۔ بھلا میرے سوا اور کون ان کا کام کر سکے ہے۔ اب میں یہیں آ گیا ہوں باجی بی۔ سامنے والی کوٹھی کے گیراج میں۔" مجھے خیال آیا یہ کیا بات ہے کہ ہمیشہ اس کا اسٹوڈیو کسی نہ کسی گیراج میں ہوتا ہے۔

اور اچانک اس کی موت کی خبر بستی میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ ہر کسی کی

زبان پر یہی تھا کہ ہائے گوپال مر گیا۔ کل تک تو بھلا چنگا تھا مگر جاننے والے جانتے تھے کہ اسے گھن لگ چکا تھا۔ اور اب تو مہینوں سے وہ پیٹ کے سخت درد میں مبتلا تھا۔ چادر سے کمر باندھ باندھ کر کام کرتا اور جب نہ ہو سکتا تو پھر "زہر" خرید کر پیتا اور اپنے درد و غم کو اس میں ڈبوتا۔ ملاوٹ کا وہ یوں بھی قائل نہ تھا اور شراب میں ملاوٹ تو وہ گناہ سمجھتا تھا، پھر اسپرٹ ہر شراب سے زیادہ سستی بھی تو تھی۔ بارہ آنے کا ادھا بھلا اور کہاں ملے گا؟ کیسے اس کا جسم برسوں سے اس 'زہر ناب'، کو سہار رہا تھا اس پر سب ہی کو حیرت تھی۔ لاکھ لوگ سمجھاتے، منع کرتے، ڈانٹتے، مر جاؤ گے گوپال، مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوتا وہ اپنی دلکش ہنسی کے ساتھ بے نیازی سے جواب دیتا۔ "مر جاؤں گا تو کون رونے والا بیٹھا ہے —— پر میں مروں گا نہیں۔ بڑا سخت جان ہوں۔ یم دوت بھی ڈر کر بھاگ جاوے گا۔ مجھ سے ——"

جانے یہ اس کے مضبوط قویٰ تھے یا قوتِ ارادی کا کمال جو وہ اب تک زندہ تھا، کھاتا پیتا اور کام کرتا تھا۔ جب تک اس کی "جانِ تمنا" اسے ملتی رہی چاہے لوگ اسے نیم مردہ سمجھتے، پاگل کہتے مگر وہ اس مخمور حالت میں بے حد مسرور، مطمئن اور زندہ دل نظر آتا تھا جیسے اب اسے کوئی دکھ، کوئی غم نہ ہو۔ اس مئے ناب میں وہ عشق کی ناکامی کے روح فرسا غم کو، بے عزتی کے کرب کو ڈبو کر دنیا ومافیہا سے بے خبر اپنے "اسٹوڈیو" میں مست و مخمور بڑبڑاتا ہنستا اور گاہک اس کی جان کو روتے، اس کو برا بھلا کہتے، مگر جب وہ حواس میں آجاتا تو سب کی شکایتیں دور کر دیتا۔

اور اب سفید کپڑے میں لپٹی اس کی ارتھی ایک پرانی چارپائی پر گل مہر کے پیڑ کے نیچے دھری ہے اور چاروں طرف بچے بڑے اور بوڑھے، عورتیں اور لڑکیاں سب کھڑے آنسو بہا رہے ہیں۔ لو وہ ایک بوڑھی عورت چلی آرہی ہے۔ کانپتی ہوئی، روتی ہوئی...... بین کرتی ہوئی۔ "ارے میرے بچے تجھے کس

کی نظر کھا گئی۔ ارے مرے لال تو نے جوانی کا سکھ نہ دیکھا ۔میرے بچے تو نامراد چل بسا۔" وہ لے اور سُر کے ساتھ بین کیے جا رہی تھی اور لوگ حیران ہو کر سوچ رہے تھے کیا گوپال کسی کا بچہ بھی تھا؟ وہ جس نے زندگی بھر کسی عزیز کا نام نہیں لیا تھا۔ آج یہ اس کی ماں کہاں سے نکل آئی؟

لوگ جا جا کر اس کا منھ کھلواتے، ایک نظر ڈالتے اور روتے ہوئے پلٹ جاتے ہیں۔ جس کا کوئی رونے والا نہ تھا، آج کتنے لوگ اسے رو رہے تھے۔ اسے یا اس کے فن کو؟ یا اپنے نقصان کو؟ کون جانے!

اس کے دوست اول منزل کرنے کے لیے گاہکوں سے پیسے وصول کر رہے ہیں۔ جو دو دو چار چار روپے کے لیے اسے ہفتوں جھکلاتے تھے، وہ شراب کی طلب میں تڑپتا، بلکتا، خوشامدیں کرتا اور وہ نصیحت و فضیحت کے دفتر کھول کر بیٹھ جاتے اور اس بہانے اس کے پیسے دینے سے انکار کر دیتے۔ اس وقت چپ چاپ روپے نکال کر دے رہے ہیں۔ شاید ضمیر کی چبھن سے مجبور ہو کر......

گل مہر کا پیڑ ہوا سے ہلا اور گوپال کی سفید چادر پر سرخ سرخ پھول بکھر گئے۔ جن میں اس کے دل کے خون کی سرخی جھلک رہی ہے۔ شاید قدرت اس فن کار کو خراج عقیدت پیش کر رہی ہے...... مگر ہمارا "فن کار" آج ہر بات سے بے نیاز، سکھ کی نیند سو رہا ہے — جانے کتنے عرصے بعد؟

اگر حالات ساز گار ہوتے تو وہ کیا ہوتا؟ ماہر صناع یا باکمال مصور، جادو نگار شاعر یا شعلہ نوا مغنی؟ وہ کیا نہیں بن سکتا تھا؟ مگر نہیں — اسے تو ایک دھوبی کے گھر پیدا ہونا تھا — جس کا فن پرانے چیتھڑوں اور میلے کپڑوں کو زندگی بخشنے تک محدود رہا۔

ہاں وہ دھوبی تھا — خود کیچڑ میں لتھڑا رہ کر دوسروں کی گندگی دھونے والا دھوبی۔ اس کا کمال صرف یہ تھا کہ اس کے ہاتھ میں آ کر ہر کپڑا نئی زندگی پا جاتا

جیسے وہ اس میں اپنی روح پھونک دیتا ہو۔ وہ کپڑے کی نفسیات کا ماہر تھا۔ موٹی
ریشمی، اونی، ملاوٹ والے، موٹے، مہین، سفید، رنگین، ہر ایک قسم کے کپڑے
کا وہ پورا مزاج داں تھا۔ جو کپڑا اس کے ہاتھ سے گزرتا اس کی قلب ماہیئت ہی
ہو جاتی تھی۔ اور گوپال اپنے اس کمال سے واقف تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ جو
لفاست پسند ایک بار اس سے کپڑے دھلوا لیں وہ پھر کسی اور سے پیمانِ وفا نہیں
باندھ سکتے۔ "ایسے جلد باز، مغرور اور خود پرست" لوگ اسے سخت ناپسند
تھے جو "مہینے بیس دن" کی دیر کو دیکھتے ہیں کام کی قدر کرنا نہیں جانتے۔
پیسے کی اسے ذرہ بھر پروا نہ تھی۔ تھوڑے سے لوگوں کا کام لیتا اور جان توڑ کر
کرتا۔ ایک ایک کپڑے کو دس دس بار دھوتا بناتا اور جب تک وہ اس کی
مرضی کے موافق نہ ہو جاتا اس کا پیچھا نہ چھوڑتا۔ کوئی کہتا گوپال تم کیوں اتنی
مصیبت بھگتتے ہو، ملنے تو وہی ۲ یا ۳ آنے ہیں تو وہ بگڑ جاتا، واہ جی ——
پیسے کا کیا ہے؟ پر کپڑا ابرا دھلے یہ میں برداشت نہیں کر سکتا ہوں، بدنامی
تو میری ہو گی نا۔ گاہک سر ٹپک ڈالے مگر جب تک کپڑا گوپال کی مرضی کے مطابق
نہ دھلے وہ اسے نہ دیتا تھا۔ وہ مصیبت اٹھاتا، فاقے کرتا، شراب تک چھوڑ بیٹھتا
مگر دوسرے درجے کا کام کر کے دینا اس کی ہی نہیں اس کے فن کی تذلیل تھی
جسے وہ کسی طرح بھی گوارا نہیں کر سکتا تھا۔

مگر آج وہ ہر بات سے بے نیاز، اپنے ہی ہاتھ کی دھلی چادر میں منھ
چھپائے سب سے روٹھ کر کہاں جا رہا ہے؟ شاید کسی ایسے جہاں کی تلاش
میں جہاں محبت ٹھکرائی نہ جاتی ہو، وفا کی توہین نہ ہوتی ہو، فن کی تذلیل اور
فن کار کی تحقیر نہ کی جاتی ہو۔ اس دنیا سے دور جس نے اس کی قدر نہ کی وہ
جو پیدائشی آرٹسٹ تھا۔ قدرت کی طرف سے احساسِ حسن و تناسب کا صحیح
ذوق لے کر پیدا ہوا تھا جس کی انگلیوں میں وہ کمال، ہاتھوں میں وہ صفائی،
نگاہ میں وہ پرکھ دل میں وہ لگن تھی جو شاذ و نادر کسی خوش نصیب کو ودیعت

ہوتی ہے۔

مگر قدرت کی اس ستم ظریفی کو کیا کہیے کہ اسے پیدا کیا ایک دھوبی کے ہاں۔ وہ بھی ہندستان کے جاہل، مفلوک الحال دھوبی کے گھر جس کے بچے دنیا کی ہر نعمت سے محروم رہ کر صرف باپ کا فن ہی سیکھ سکتے ہیں۔

اگر اسے بہتر مواقع ملتے، کیا ہوتا؟ شاید وہ ایک ماہر صنّاع ہوتا، ایلورا کے خالقوں کا ورثہ دار جو پتھر کے بے ڈول ٹکڑوں میں جان ڈالتا اور اپنا نام امر بنا جاتا۔

یا مصور ہوتا اجنتا کے فن کاروں کا جانشین، جو رنگوں میں جادو جگاتا، لکیروں کو زندگی بخشتا اور خود حیاتِ جاوداں پاتا۔ وہ ــــ لفظوں کا ساحر، جذبات کا صنّاع، احساسات کا مصور، محبت کا نقیب، حسن کا پرستار، شاعر ہوتا جس کے فن پارے عاشقوں کے دل کی آواز، حسینوں کے سینے کی دھڑکن، حسنِ فطرت کے متوالوں کی تسکین، محروموں اور ناکاموں کی امید کا دیا بن جاتے۔

مگر نہیں، اس کی قسمت نے اسے ایک اندھیری جھونپڑی میں جنم دیا تھا، اس نے گندے کپڑوں میں نشوونما پائی، جہالت اور افلاس کے گہوارے میں جھولا اور محبت کی ان مول دولت سے بھی، جو ہر بچے کا پیدائشی حق ہے، محروم رہا کہ ماں اسے جنم دیتے ہی چل بسی تھی۔ ماں کی ممتا، باپ کی محبت، بہن بھائیوں کی سنگت سے محروم یہ بچہ اپنے من کی پیاس قدرت کے حسن کے نظارے سے بجھاتا رہا۔ کپڑوں کی لادی دریا کے کنارے رکھے ڈوبتے سورج، ابھرتے چاند، چمکتے تاروں کے نظاروں میں محو، نہ جانے کتنی کتنی دیر بیٹھا رہتا۔ اسے ہر حسین چیز سے پیار تھا۔ دلکش مناظر، خوب صورت انسان، سڈول مورتیاں، وہ انھیں دیکھتا ہی رہ جاتا۔ اس پر اس نے کتنی بار باپ اور سوتیلی ماں کی مار کھائی تھی، بھوکا رہا تھا۔ جنگل میں سویا تھا۔ مگر وہ کرتا تو کیا؟ کپڑے دھونے میں اس کا جی نہ لگتا تھا اور دنیا میں ہر طرف حسین دلنشاسب چیزیں بکھری ہوئی تھیں۔ وہ کیسے ان

کی طرف سے آنکھیں بند کر لے؟

اور پھر نوجوانی کے دور میں اسے ایک انسانی پیکر میں ساری کائنات کا حسن مجسم نظر آیا۔ جس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے وہ سارا دن گلی میں کھڑا رہتا ـــــ بھوکا پیاسا ـــــ اپنی ذات سے ـــــ ساری دنیا سے بے نیاز اور جب وہ نظر آتی تو اس کی بڑی بڑی آنکھیں، جو کبھی بڑی حسین تھیں ـــــ اس پیکرِ جمال پر اس طرح جم جاتیں کہ نظر ہٹنے کا نام نہ لیتی۔ اور جہاں وہ جاتی وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے ایسا چلتا رہتا جیسے معمول عامل کے پیچھے چلتا ہے۔

مگر گوپال کو ایک دن اپنی حسن پرستی کی سزا بھگتنی پڑی۔

لڑکی کے باپ نے اسے پٹوایا کہ وہ سر سے پیر تک خون میں لت پت ہو گیا۔ وہ جس کی نازک مزاجی کی وجہ سے باپ کڑے تیوروں سے نہ دیکھ سکتا اور سوتیلی ماں ایک دو بات سے زیادہ نہ کہہ پاتی ـــــ اسے اس طرح ذلیل و رسوا کیا گیا کہ سارے گاؤں میں اس کی بدچلنی کا چرچا پھیل گیا۔ ہر ایک کی زبان پر یہی تھا کہ نتھو کے بیٹے گوپال نے راجو کی بیٹی پر "بری نظر ڈالی"۔ بری نظر؟ یہ بری نظر کیا ہوتی ہے؟ گوپال کا انجان، معصوم، پاکباز دل نہ سمجھ سکا۔

وہ حسن کے اس شاہکار کو دیکھتا تھا۔ لیکن اس میں عیب کیا ہے؟ آخر وہ غروب ہوتے آفتاب، طلوع ہوتے چاند، سویرے چمکتے ستارۂ صبح، بہتے دریا، پھولتی شفق، ہنستے پھولوں، لہلہاتے پودوں کو بھی تو دیکھتا تھا۔ کبھی کسی نے یہ نہیں کہا کہ ان پر بری نظر ڈالتا ہے ـــــ مگر لاجونتی کو دیکھنے کی اتنی بڑی سزا، اتنی ذلت، اتنی رسوائی؟

اور اس ناکامیِ عشق اور بدنامی کا ایسا ناسور گوپال کے دل میں پڑا جو زندگی بھر رستا رہا۔ اور ساتھ ہی اس پیکرِ حسن کا نقش بھی اس دل پر ثبت ہو کر رہ گیا جو کبھی نہ مٹ سکا۔ مگر پھر اس خوددار نے کبھی کسی عورت پر ـــــ نظر ہی نہیں ڈالی۔ "بری نظر۔"

اس نے وہ قصبہ چھوڑ دیا ـــــــ وہ صوبہ چھوڑ دیا ـــــــ اور دور ـــــــ
بہت دور ـــــــ ہندستان کے دارالسلطنت میں آکر ڈیرا جالیا۔

وہ مصور نہ تھا کہ تصویروں کی زبان سے اپنے امٹ پریم اور ناکامی عشق کی داستان سناتا۔ بت تراش نہ تھا کہ پتھر میں اپنی محبوبہ کو ڈھال کر اس کی پرستش کرتا۔ شاعر نہ تھا کہ اپنے جذبات واحساسات کو شعر کی لڑیوں میں پرو کر اپنے دل کو تسکین دے سکتا، مغنی نہ تھا کہ گیت کی دھن میں اس کے من کی ہوک اور دل کی جلن ہم آہنگ ہو کر دلوں کے تاروں میں لرزش پیدا کرتی۔ وہ تو ایک دھوبی تھا، صرف دھوبی۔

مگر ـــــــ اس کے پاس شاعر کا دل، صناع کا دماغ، مصور کی انگلیاں اور مغنی کا ذوق تھا ـــــــ فن کار کی لگن تھی۔

مگر وہ فن کپڑے دھونے کا جانتا تھا۔ صرف کپڑے دھونا۔

اور اس فن کار نے اپنی ساری صناعی، سارا فن، ساری صلاحیتیں اپنے اس آرٹ میں سمو دیں۔ وہ گندے میلے چیتھڑوں کو نئی زندگی، نیا حسن، نئی کشش بخشنے لگا ـــــــ اور اسے اپنے کام میں وہی سرور، وہی لطف حاصل ہوتا، وہی بے خودی پیدا ہو جاتی جو کسی بھی فن کار کو اپنے فن میں محو ہو کر ہوتی ہے۔ اور اسے "اپنے فن" سے ایسا ہی پیار اور اس پر وہی ناز بھی پیدا ہو گیا، جو ہر فن کار کی فطری کمزوری ہے۔

اور اس فن میں اس نے محبوب کی یاد، توہین کا صدمہ اور تنہا اجاڑ زندگی کی بے کیفی اور ویرانی کو ڈبو دیا۔ مگر ایسے دن بھی آتے کہ وہ باوجود کوشش کے پرانی یادوں کو نہ بھلا سکتا چڑھتا چاند، جھومتے بادل، کھلتے غنچے، کھلکھلاتے پھول، اسے پھر دیوانہ بنا دیتے۔ وہ اپنے بال نوچ ڈالتا، کھانا پینا چھوٹ جاتا، نیند غائب ہو جاتی، اور اس حالت میں صرف ایک شے تھی جو اسے تسکین دیتی۔ شراب۔ تند و تیز شراب آہ، کتنی بے خودی، کیسا سرور، کتنی مسرت حاصل

ہوتی، اس پری پیکر محبوبہ کی سنگت میں۔ گوپال روز بہ روز اس کا دیوانہ ہوتا گیا۔ جوں جوں ذوقِ مے آشامی بڑھا، طلب بڑھتی چلی گئی۔ ہلکی سے تیز، تیز سے تند ـــــ پھر نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ خالص اسپرٹ پر اتر آیا۔ جس میں بہت سی خوبیاں تھیں۔ تندو تیز تھی۔ سستی تھی ـــــ مل جاتی تھی ـــــ اور مدت تک مدہوش رکھتی تھی۔ اور یوں کئی سال سے اس نے اپنے جسم و جان کو محبت کی آگ کے ساتھ ساتھ اس آگ میں بھی جھونک دیا تھا۔ اس کے دوست و بہی خواہ لاکھ سمجھاتے۔ "گوپال۔ اس شراب کو چھوڑ دے۔ مر جائے گا کمبخت۔ جلا کر راکھ کر دے گی یہ منحوس اسپرٹ تجھے ـــــ" مگر وہ ہنس کر ٹال جاتا۔ جیسے کہنا ہو یہ لوگ بچارے کیا جانیں بھلا؟ اس میں رہا ہی کیا تھا جسے اسپرٹ جلائے گی اسے تو ایک حسن مجسم کی برقِ تجلی مدت گزری جلا کر راکھ بنا چکی ہے……

اور یوں ہی دن بیتے رہے ـــــ اور آج بستی میں یہ خبر پھیل گئی کہ گوپال مر گیا ـــــ سچ مچ مر گیا۔

گوپال کو نہلا دھلا کر آخری منزل کی طرف لے جانے کی تیاری ہو رہی ہے۔ چاروں طرف سوگواروں کا مجمع آبگوں آنکھیں لیے کھڑا ہے۔ اس بلانوش کے درشن کے لیے جو ایسا بدمست شرابی ہوتے ہوئے بھی کتنا شریف، کتنا عالی ظرف تھا۔ جو کبھی بہکتا نہ تھا، بھٹکتا نہ تھا۔ جس نے کبھی کسی عورت کی طرف نظر نہیں اٹھائی، کسی حالت میں بھی کوئی نازیبا بات منھ سے نہیں نکالی۔ جس خوددار نے فاقے کیے مگر سوائے محنت کی کمائی کے کبھی کسی کے سامنے دستِ سوال نہیں دراز کیا۔ کسی کا برا نہیں چاہا۔ اس نے ہر کسی کی خدمت کی اور خود کسی سے کوئی کام نہ لیا۔ کسی کا احسان نہیں اٹھایا، خود جتنا ہو سکا دوسروں کے ساتھ سلوک کیا۔

ہزار سے کم کا نہ ہوگا۔"

"بہن، بارہ پندرہ ہزار کا تو خالی زیور ہی ہے۔ ایک پوری شیشے کی الماری میں زیور سجے ہیں۔"

"اور کیا بہن! ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے اس زمانے میں اتنا دینا۔ اس کے لیے دل چاہیے دل۔"

فرحت آپا اب نہ سہار سکیں۔ "اس کے لیے دل سے زیادہ فالتو روپے کی ضرورت ہے۔" اور ان کے لہجے کے طنز پر کئی عورتوں نے مڑ کر انھیں دیکھا۔ ایک صاحبہ دوسری سے دبی آواز میں کہنے لگیں۔ "اے یہ فرحت آپا یونہی لوگوں کا جہیز اور شادیاں دیکھ کر جلا کرتی ہیں۔"

"جلتی نہیں بچاری، اصلاح کی کوشش کرتی ہیں، مگر سنتا کون ہے ان کی۔"

"کہتی تو سچ ہیں۔ جہیز اور تحفوں کا زور ہمارے دیکھتے دیکھتے کتنا بڑھ گیا ہے۔ زندگی اجیرن ہوگئی ہے۔"

"اور کیا، ہر مہینے دو ایک تحفے دینے کا خرچ ہم جیسے کم حیثیت لوگوں کے لیے مصیبت بن گیا ہے۔ اور پھر غریب آدمی کا جی کتنا للچاتا ہے ان رئیسوں کی لڑکیوں کا جہیز دیکھ کر۔"

"اخفٖ، پیسے والے تو بہت ہیں، حدن میاں کا سا دل کسی کا نہیں ہے۔"

"دل تو جب ہوتا خالہ!" فرحت آپا نے بوڑھی بی بی کو مخاطب کر کے کہا۔ "جب اپنی بیٹی کو اتنا زیادہ جہیز دینے کے بجائے، تھوڑا کم کر کے، دو چار غریب لڑکیوں کا بیاہ کرا دیتے۔"

"اوئی بوا! یہ نرالی منطق ہے۔"

"اتنا جہیز، متوسط درجے کی پندرہ بیس اور غریب گھرانے کی چالیس پچاس لڑکیوں کے لیے کافی سے زیادہ ہوتا خالہ!"

"اے ہے، تم سے کون مغز مارے بوا۔ تم نہ دینا اپنی لڑکی کو کچھ، غریب لڑکیوں کا بیاہ کراتی پھرنا۔" "انشاء اللہ" فرحت آپا نے کہا اور اس انشاء اللہ نے سب کی زبان بند کر دی۔

دوسری طرف دلھن کی سہیلیاں ریحانہ کی قسمت کو سراہ کر رشک کی کھٹک کم کر رہی تھیں۔

"کتنی خوش نصیب ہے ریحانہ۔ اتنا زیور، ایسے تحفے، اتنا سامان۔"

"اور دولھا بھی اچھا ملا۔ سنا ہے ہزار روپے سے زیادہ کی آمدنی ہے اس کی۔"

"اُنھ ہزار کمانے سے کیا ہوتا ہے۔ پڑھا لکھا تو خاک نہیں۔ بزنس مین ہے نرا۔"

"اور ریحانہ صاحبہ بی اے۔ بی ٹی۔"

"ارے بڑے لوگ یہ کب دیکھتے ہیں۔ پیسہ دیکھا جاتا ہے۔ پیسہ۔"

"صورت بھی دولھا کی ماشاء اللہ ہے۔ کیسا بدھو سا لگتا ہے۔ موٹا ٹھنگنا۔ بھدا۔"

"صحبتِ ناجنس۔ میں تو ایسے سے دس ہزار کمانے والا ہوتا تب بھی نہ کرتی۔"

"بس رہنے دے شیخی پارو۔ تجھے تو دو تین سو والا بھی پوچھ لے گا تو......"

"بری بات ہے سینا۔ مانا کہ پارو کالی ہے مگر......"

"دیکھو انجم تم مجھے پارو سے لڑاؤ نہیں۔ میں نے تو یونہی مذاق میں کہا تھا۔"

"آخر یہ اتنے سارے تحفے کہاں سے آئے؟"

"تحفے؟ دوستوں نے عزیزوں نے دیے ماتحتوں نے معمولی ملنے جلنے والوں تک نے دیے ہیں۔ دو ہزار کارڈ جب چھپوا کر تقسیم کیے جائیں تو اس کا مطلب یہی یہ ہوتا ہے کہ آؤ نہ آؤ تحفہ بھیج دو۔" اور کئی لڑکیاں قہقہہ مار کر ہنس پڑیں۔

"تم نے دیکھا! فرحت آپا نے کوئی تحفہ نہیں دیا؟"

"وہ تو کسی کو بھی تحفہ نہیں دیتیں۔ اصول ہے ان کا۔"

"ریحانہ ایک دُوکان رکھ لے گی تو اچھا رہے گا۔ اتنے لیمپ، تھرماس، گھڑیاں، چائے، کافی، لیمن، آئس کریم کے سٹ، کئی ریڈیو، سینکڑوں زیور، پچاسوں جوڑے، بیسیوں جوتے، آخر کیا کرے گی بیچاری، ان سب کا؟"

"چک اور روپے کیا کم ہیں؟ ایک شوکیس میں تو سارے چک اور نوٹ ہی ڈِسپلے کیے گئے ہیں....."

"اور ایک صاحب کی جدّت دیکھی؟ چاندی کے سو روپے ایک چاندی کی پلیٹ میں رکھ کر دیے ہیں۔"

"یہ جدّت ہے یا بدمذاقی کی انتہا۔"

"بدمذاقی اور نو دولتے پن کا اظہار ہے کس چیز میں نہیں؟"

"اوفوہ پارو۔ چپ بھی رہ...... تیری زبان نہ رکے گی۔"

"انجم صاحبہ آپ کی مارے رعب کے گھگی بندھی ہوئی ہے، میری نہیں۔ بھلا دیکھو تو پڑھی لکھی لڑکی اور اتنے بھاری جہیز میں ایک کتاب بھی نہیں۔"

"اب یہ تمہاری زیادتی ہے بہن۔ ایک کتاب ہے تو —— پرنسپل صاحبہ کا تحفہ ——"

"چار پائے برو —— صرف ایک کتاب۔" اور فرحت آپا جو تھوڑی دیر سے کھڑی ان لوگوں کی باتیں سن رہی تھیں بے اختیار ہنس پڑیں۔

"ارے لڑکیو کیا بک بک کیے جا رہی ہو۔ راستے سے تو ہٹو۔ دولھا اندر آرہا ہے، آرسی مصحف کے لیے" ایک بھاری آواز گونجی۔

"چلو بھئی بھاگو۔ کوتوال صاحبہ آگئیں۔"

"انجم پرسوں ہمارے ہاں آنا تمہیں ایک اور شادی دکھائیں گے۔"

"کس کی شادی ہے پارو۔"

"میرے پڑوس میں ایک لڑکی کی۔"

"میں بے بلائے کیسے......"

"ارے میری ہر سہیلی کو وہاں ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔ فرحت آپا آپ بھی تو چلیں گی نا نادرہ کے بیاہ میں۔"

"ہاں بیٹی ضرور۔" فرحت آپا نے جواب دیا۔

"شاہدہ بھی آئے گی نا؟ یہاں تو نہیں آئی؟" پارو نے پوچھا۔

"وہاں ضرور جائے گی۔ ابھی سے تیاری کر رہی ہے۔" فرحت آپا کی آواز عورتوں کی چیخ و پکار میں دب گئی۔

آرسی مصحف ہو رہا تھا۔ عورتیں بیتے سہاگ کے دنوں کی شیریں یاد میں محو تھیں تو لڑکیوں کے دل مستقبل کے آئینے میں اپنے سپنوں کے پیتم کی مورت دیکھ کر دھڑک رہے تھے۔

انجم پہنچی تو پارو جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔

"آؤ انجم چلیں۔ دیر ہو گئی خاصی۔"

"تم کیا تحفہ دے رہی ہو اپنی دوست کو ذرا دکھاؤ نا۔"

"میں الگ سے کیا دیتی۔ امی کچھ چیزیں بھیج رہی ہیں۔"

پارو نے پیکٹ کھولا۔ سستی ساٹن کا گلابی جوڑا، کامدانی کا دوپٹہ۔ سنہرے چپل ایک رومالوں کا سیٹ، ایک چھوٹا سا پرس اور بیس روپے۔

"جوڑا اور روپے امی بھیج رہی ہیں۔ رومال نادرہ لائی ہے اور پرس میں دے رہی ہوں۔" پارو نے بتایا۔

"لو یہ میری طرف سے دے دینا۔" انگریزی کی ایک خوبصورت جلد کی کتاب انجم نے پارو کو تھما دی۔

پارو مسکرائی۔ "یہ کتاب —— اس کے کام نہ آئے گی۔"

"کیوں تم ہی تو کل کہہ رہی تھیں کہ کتاب سے بڑھ کر کوئی تحفہ نہیں۔"

"ہاں مگر وہ انگریزی نہیں جانتی۔ . . . ." پارو نے بتایا۔

"نہیں کوئی بات نہیں۔ لو وہ فرحت آپا بھی آگئیں۔ ارے یہ تو بہت برا ہوا۔"
"بیٹی مجھے ذرا دیر ہوگئی۔ کیا آصفہ ابھی تیار نہیں ہوئیں؟" فرحت آپا نے پوچھا
"امی تو آج ماموں جان کے ہاں گئی ہوئی ہیں۔ ہم لوگ چل رہے ہیں۔
فرحت آپا آپ کے ساتھ۔"
"اور شاہدہ نہیں چل رہی ہیں؟" انجم نے پوچھا۔
"وہ تو دوپہر سے وہیں ہے۔"
"آپ نے کیا دیا فرحت آپا نادرہ کو؟" پارو نے پوچھا۔
"کچھ بھی نہیں بیٹی۔"
"واہ ــــ زینب خالہ تو کہہ رہی تھیں سب آپ ہی نے کیا ہے۔"
"وہ تو گپ مارتی ہے۔"
"سچ بتائیے ورنہ میں خود زینب خالہ سے پوچھ لوں گی۔"
"نہیں نہیں اس سے نہ پوچھنا۔ میں نے کچھ نقد دے دیا تھا۔ البتہ شاہدہ
اپنی طرف سے کچھ چیزیں لائی ہے۔"
"کیا کیا لائی ہے شاہدہ؟"
"ایک چائے کا سٹ، ایک ساڑھی، ایک گلے کی لاکٹ۔"
"اتنی بہت سی چیزیں آپ نے ایک لڑکی کو دے دیں؟ اور کل آپ کہہ رہی
تھیں کہ تحفے دینا بے کار کی نمائش اور فضول خرچی ہے؟" انجم نے حیرت سے کہا۔
"ہاں بیٹی۔ آدمی سے خطا ہو ہی جاتی ہے۔ کہتا کچھ ہے کرتا کچھ ہے۔"
"ارے ارے انجم کیا بک رہی ہو۔" پارو نے شرمندہ ہو کر کہا۔
"اچھا اب چلو۔" فرحت آپا نے بات ٹالی۔
"چلیے میری کار باہر کھڑی ہے۔" انجم نے پیش کش کی۔
"کار کی ضرورت نہیں دو قدم ہی پر ہے۔" انجم نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا
پیچھے سے تیرہ سالہ ناہید ریشمی سرخ جوڑا سرسراتی اور زیور چھنکاتی ان

میں شامل ہو گئی۔ تھوڑی دور چلے تھے کہ انجم بولی۔

"یہاں کہاں جا رہی ہو پارو۔ ادھر تو جھونپڑیاں ہی جھونپڑیاں ہیں۔"

"انجم وہیں جانا ہے!"

"تمھاری سہیلی جھونپڑی میں ہے؟"

"تو کیا تم کسی کوٹھی بنگلے کا تصور کر کے آئی تھیں؟" پارو نے کھسیا کر کہا۔

"بیٹی کوٹھی بنگلوں کی شادیاں تو اکثر دیکھتی ہو۔ آج جھونپڑی کا جشن دیکھ لو۔"

"فرحت آپا۔ نادرہ باجی کا دولھا بڑا اچھا ہے۔ لمبا گورا، ہنس مکھ۔" ناہید نے اپنی معلومات سے سب کو فیض پہنچانا شروع کیا۔ "دو جوڑے ریشمی آئے ہیں بری میں اور تین زیور۔ ناک کی نتھ۔ پاؤں کے چھاگل اور گلے کا چاندی کا ہار مگر زینب خالہ کہتی ہیں، تین تیرہ نہیں ہونے چاہییں اور لاؤ ایک یا دو زیور۔"

"پاگل ہے وہ تو۔" فرحت آپا نے دھیرے سے کہا۔

"سب کہہ رہے ہیں دولھا بڑا کماؤ ہے۔ ڈرائیور ہے بس کا۔ سو روپے ملتے ہیں آپاجی اب تو نادرہ آپا مزے کریں گی۔۔۔۔"

جھونپڑی کے باہر ذرا سی کھلی جگہ میں ایک چھوٹی سی دری پڑی تھی۔ بارات ابھی نہ آئی تھی اور پڑوس کے بچے اس پر دھماچوکڑی مچا رہے تھے۔ جھونپڑی کے بڑے صحن میں ٹاٹ کے چار پانچ ٹکڑوں کا فرش بچھا تھا۔ چار پانچ بانوں کی چارپائیاں پڑی تھیں، ایک لالٹین چھپر میں لٹک رہی تھی اور ایک بدقلعی ٹوٹا ہوا پاندان کھلا پڑا تھا جس میں ڈبیاں زیادہ تھیں اور چھالیہ کتھا کم۔ پڑوس کی بہت سی عورتیں اور بچے جمع تھے۔ جن کو بیٹھنے کی جگہ نہ تھی، وہ ادھر اُدھر کھڑی تھیں۔ عورتیں حسب عادت اعتراض کرتے، بچوں کو ڈانٹنے یا دودھ پلانے اور پان کھانے میں مصروف تھیں۔ پارو اور فرحت آپا کو دیکھ کر کئی آوازیں بلند ہوئیں۔ "آداب آپا۔ سلام آپا۔" "آؤ آؤ آپا۔" "ادھر بیٹھ جاؤ۔" "اری جمیلہ ذرا پنکھا تو جھل آپا کو۔" "دیکھا آپا تم نے اپنی زینب کا جھونپڑا پا۔

"دری تک نہیں۔ روشنی نہیں۔ توبہ۔ توبہ۔"

فرحت آپا سب کے سلاموں کا جواب دیتی، باتیں سنتیں آگے بڑھیں۔

زینب نے لپک کر ان کی پیشوائی کی۔ "آؤ آپا بیٹھو۔"

"نادرہ کہاں ہے؟"

"اندر چھپر میں ہے۔ ابھی نہلا کر اٹھایا ہے۔ سسرال کے کپڑے آئیں گے تو پہنے گی۔"

"چلو اس کے پاس چلتے ہیں پہلے۔"

اندر سترہ سالہ نادرہ صرف ایک پرانے بدرنگ سرخ دوپٹے میں لپٹی بیٹھی تھی۔ گیلے بالوں کا آبشار پشت پر گر رہا تھا، سبک ناک میں چھوٹی سی نتھ ہل رہی تھی۔ گندمی رنگ میں شرم، مسرت اور شرارتِ جذبات نے سرخی بھر دی تھی اور سیاہ پلکوں سے موتی لڑھک لڑھک کر دھڑکتے سینے پر پھسل جاتے تھے۔ فرحت آپا نے جا کر اس کا چھاتی سے لگایا تو اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ اس کے گرد بہت سی لڑکیاں بیٹھیں ہنسی مذاق ...... کر رہی تھیں مگر اپنی ہنس مکھ پُرخلوص سہیلی کے جدائی کے احساس سے ان کی آنکھیں آبگوں تھیں۔

انجم گدڑی کے اس لال کو دیکھنی کی دیکھتی رہ گئی۔ پرسوں ریحانہ کے حسن کو دیکھ کر رشک کی ایک تیز لہر اس کے سینے میں اترتی محسوس ہوئی تھی۔ وہ حسن جس کو مصنوعی سامانِ آرائش، کارچوبی جوڑے اور جڑاؤ زیورات نے دو آتشہ بنا دیا تھا مگر نادرہ کے اس قدرتی حسن، سادہ حسن نے اسے مسحور سا کر لیا۔

فرحت آپا باہر آ کر ایک جھلنگے پر بیٹھ گئیں اور بھانت بھانت کی بولیاں سننے لگیں۔ زینب بی پاگلوں کی طرح ہر طرف کام کرتی پھر رہی تھیں۔ باتیں بنانے والے بہت تھے، ہاتھ بٹانے والا کوئی نہ تھا اور کوئی کرتا بھی تو کیا؟ نہ کھانے کا اہتمام نہ فرش فروش، نہ مہمانوں کی خاطرداری کے انتظامات، نہ پان چھالیہ کا بکھیڑا۔ پھر ایک دم وہ فرحت آپا کے پاس آ کر رو پڑیں۔ "تم تو جانو ہو آپا۔

میرے پلے تھا ہی کیا۔ فاقے پڑ رہے تھے —— تم ہی لوگوں کے صدقے میں اس کے ہاتھ پیلے کر پائی۔ اب دیکھو —— یہ غور نہیں کیا کلّوں میں چاول دبا دبا کر باتیں بنا رہی ہیں ...... تم ہی کہو پان چھالیہ، کھانا دانا، خاطر مدارات کہاں سے کرتی، دس براتیوں کے لیے قورمہ روٹی اور زردہ پکوایا ہے۔ اور یہی دو چار جوڑے اور برتن ہو سکے ہیں۔" اور وہ زیادہ بلک بلک کر رونے لگی۔

"تم کیوں پروا کرتی ہو، لوگ تو بکا ہی کرتے ہیں۔ بچی کو اچھا گھر اور بر مل گیا اس سے زیادہ اور کیا چاہیے تھا۔" فرحت آپا نے تسلی دی۔

"ذرا چل کر اپنی بچی کا جہیز تو دیکھ لو —— غریبوں کے بھی تو دل ہوتے ہیں آپا۔"

اور فرحت آپا کے ساتھ ساتھ اور لڑکیاں اور عورتیں بھی اندر لپکیں۔ جہیز کے دوسرے کونے میں ٹاٹ کے فرش اور ٹین کے صندوق پر جہیز سجا کر سہیلیوں اور بہنوں نے دل کے ارمان نکالے تھے۔

پانچ سوتی یا سستے ریشم کے جوڑے، سات، تانبے کے برتن، ہاتھوں پاؤں کے چاندی کے چھلے دو چاندی کی پتلی پتلی چوڑیاں، ایک لال تکیہ، دلائی، ایک تولیہ، دو کڑھے غلاف شیشے کی چند رکابیاں پیالے، شاہدہ کا لایا چلئے سے منا سا مراد آبادی پاندان۔ ٹین کے چار چمچے، ایلومونیم کا ایک لوٹا اور بھرت کا گلاس۔ باقی اللہ کا نام اور اللہ کا کلام۔ ایک چھوٹا سا کلام مجید مع رحل کے۔

درد کی ایک لہر فرحت آپا کے دل میں اٹھی اور آنکھیں بھر آئیں۔ لیکن لالٹین کی مدھم روشنی میں ان کے دل کی کیفیت چھپ گئی اور وہ ہنس ہنس کر ایک ایک چیز کی تعریف کرتی رہیں۔

پارو، شاہدہ، انجم، ناہید سبھی جھکی پڑی تھیں۔ انجم کی نظروں میں پرسوں کی شادی کا منظر گھوم گیا۔ دولت اور غربت کی ننگی پرچھائیاں ناچتی ہوئی اس کی نظروں کے سامنے سے گزر رہی تھیں۔ اور اس کے ذہن و دماغ میں پہلی بار ہلچل پیدا ہوئی۔

"دولھا آرہا ہے۔ دولھا آرہا ہے۔"

لڑکیاں یہ سن کر بھدر بھدر بھاگیں۔ باہر بینڈ کا شور اور ہیجڑوں کا ناچ، بچوں اور چھوٹی لڑکیوں کو لبھا رہا تھا۔ اور اندر دلھا عورتوں اور نوجوان لڑکیوں کا مرکز توجہ بنا تھا وہ سسرال کے سستے نئے جوڑے میں، سرخ رومال سے منھ چھپائے شرمایا کھڑا تھا مگر مسرت اس کے عضو عضو سے پھوٹی پڑ رہی تھی اور لڑکیوں کی چھیڑ چھاڑ اور فقرہ بازیوں سے محظوظ ہو رہا تھا۔

لپٹی لپٹائی دلھن جس کے چھریرے جسم پر سسرال کا سرخ جوڑا بڑا بانکا لگ رہا تھا اور سہرے کی لڑیوں سے شرمایا چہرہ بادلوں میں چھپے آدھے چاند کی طرح جھانک رہا تھا، باہر لائی گئی۔ ڈھولک کی تھاپ پر نوجوان گلوں کے گھنگرو بج اٹھے، گیت کی مدھر تانیں فضائیں بکھرا اٹھیں۔ روپہلی قہقہوں کی گونج نے مسرت کے موتی ہر طرف بکھیر دیے۔

انجم اب سب کچھ بھول کر اس ماحول کا ایک جز بنی خود بھی شاہدہ اور پارو کے ساتھ لہک لہک کر گا رہی تھی اور فرحت آپا کے دل کی کسک بھی مسرت کی اس سادہ معصوم فضا میں جانے کہاں تحلیل ہو گئی تھی۔

دو مائیں

پاربتی ایر کنڈیشن کمرے میں بجلی کے تیز پنکھے کے نیچے باریک کپڑوں میں' شربت، آب شورا، عرق، دودھ اور لسی پی پی کر بھی اتنی ہی بے چین اور پریشان تھی جتنی مریم اپنی پھونس کی جھونپڑی میں لو کے تھپیڑوں میں' گرم گرم پانی پی کر اور صبح و شام موٹی جھوٹی روٹی اور بتھوے یا خرفے کی بھجیا کھا کر۔ دونوں ہی کے دن گن گن کر کٹ رہے تھے۔ کب خدا ان کی مشکل آسان کرے گا؟ کب اس خوشگوار بوجھ سے چھٹکارا ملے گا؟ ابتدائی دنوں میں یہ بار جتنا ہلکا اور جاں فزا تھا اب اتنا ہی بھاری اور پریشان کن ہوتا جا رہا تھا۔ موجودہ تکلیف کا احساس آئندہ کی فکر دونوں کو گھلا رہی تھی۔ حالانکہ ایک کے لیے دنیا جہان کی نعمتیں میسر تھیں' دوسری افلاس و کس مپرسی کی آخری حد یں چھو رہی تھی۔ مگر جھیلنے والی مصیبت کا خوف بھی ایک سا تھا اور آنے والی بے پایاں مسرت کا احساس بھی دونوں دلوں میں ایک سی لرزش پیدا کر رہا تھا۔ دونوں ہی نادیدہ محبوب کی الفت میں گرفتار تھیں۔ آنکھیں نور نظر کے دیدار کی پیاسی تھیں۔ سینوں میں مامتا دودھ بن کر ابل رہی تھی۔ دونوں ہی برسوں سے اس نعمت کو ترس رہی تھیں جس کے لیے ان کا رواں رواں بے قرار تھا اور دونوں ہی کی تمنا خدا نے بر لانے کی صورت پیدا کی تھی۔

پاربتی کی شاخ تمنا میں سات آٹھ سال بعد پھل آیا تھا۔ خاندان کا ہر فرد اس کو سوکھی ڈالی قرار دے چکا تھا۔ اس کا امید پرور پتی بھی مایوسی کی آخری منزل پر پہنچ کر صبر کر چکا تھا۔ اولاد کی تمنا کو جو اس کے دل و دماغ کو ہر وقت گھیرے رہتی تھی اس نے دل کی گہرائیوں میں دفن کر دیا تھا۔ اور دل و جان سے اپنی چہیتی بیوی کی دلداری میں اپنے کو کھپانے لگا تھا۔ لیکن پاربتی کے من مندر میں آشا کا دیا کبھی نہیں بجھا۔ اسے امید تھی کہ ایک نہ ایک دن اس کے دل کی مراد ایشور ضرور پوری کرے گا۔ اس کے من میں بچوں کے لیے لڑکپن سے پیار کا جو ساگر موجزن تھا اسے ایشور کبھی سوکھنے نہ دے گا۔ وہ لاکھ دوسروں کے بچوں سے پیار و محبت کرے، مگر ممتا کی پیاس سراب سے تو نہیں بجھ سکتی نا۔

اور آخر آشاؤں کے دیے جگمگا اٹھے۔ من کی دنیا میں دیپک جلے۔ شاخ مراد بار آور ہوئی۔ اور اس خاندان کا ہر فرد، ماں جو بیٹی کی بدقسمتی کو رو کر بیٹھ چکی تھیں، بہن اور بھاوج جو اس کی طرف ایک رحم بھری نگاہ ڈال کر فخر و ناز سے اپنے پیارے بچوں کو دیکھا کرتی تھیں، پتی جو اس کے سکھ پر مسرت بھری ہنسی کے لیے ترسا کرتا تھا، ساس جو اس کو منحوس اور بانجھ کے لقب سے یاد کرتی تھی، نندیں جو بھتیجے کا منھ دیکھنے کے لیے بھائی کو دوسرے بیاہ پر آمادہ کرتی رہتی تھیں۔ سب اس کی ناز برداری میں لگے رہتے تھے۔ پاربتی من ہی من میں مسکرا کر رہ جاتی۔ ہاں اپنی ماں اور میاں دو کی سچی مسرت پر اس کی آنکھیں ضرور ڈبڈبا آتیں تھیں ..... اور پھر اس کا دل ایک ان جانے خوف سے لرز اٹھتا۔ اگر ـــــ اگر کہیں ـــــ کچھ ـــــ کچھ ہو گیا.....؟ اس سے آگے سوچنے کی اس میں ہمت نہ تھی۔ آنسو بے اختیار اس کے گالوں پر لڑھک آتے اور سارا گھر اس کی دلداری اور دلاسے میں لگ جاتا.....

پاربتی کے احساس انانیت اور توجہ کی ہوس کو پوری پوری غذا مل رہی تھی جس کا اثر اس کی صحت اور مزاج دونوں پر بڑا اچھا پڑا تھا۔ لیکن جوں جوں

دن قریب آرہے تھے وہ بے چین اور پریشان ہوتی جاتی تھی۔

مریم نے ابھی سال بھر پہلے پاربتی کے عالی شان کوٹھی کے احاطے کے باہر اپنی پھولس کی جھونپڑی ڈالی تھی۔ سرکیوں کے ٹاٹ کھڑے کرکے ایک کوٹھری اور ایک برآمدہ سا بنالیا تھا۔۔۔۔ اور وہ اپنے اس "محل" میں بہت خوش تھی۔ اس لیے کہ مدتوں بعد اسے سر چھپانے کو جگہ ملی تھی۔ جب سے وہ ساس سسر سے الگ ہوئی تھی یونہی در بدر کی ٹھوکریں کھاتی پھر رہی تھی۔۔۔۔ لیکن اب اس کا اپنا گھر ہے۔ یہ احساس اس کے لیے اتنا شیریں، اتنا پرکیف تھا جس کو لفظوں میں بیان کرنا اس جیسی ان پڑھ سیدھی سادی عورت کے لیے تو کیا بڑی پڑھی لکھی ادیب و شاعر خواتین کے بس کی بات بھی نہیں، بعض جذبات و احساسات ہوتے ہی ایسے ہیں جن کو انسان صرف محسوس کرتا ہے۔۔۔۔ بیان نہیں کرسکتا۔۔۔۔

دن بھر ہاشم مزدوری کرتا اور مریم اپنے جھونپڑے کے لاڈ چونچلے کرنے میں مصروف رہتی۔ جھاڑو دی جارہی ہے۔ چولھا پوتا جارہا ہے۔ ٹٹیوں کو ٹھیک سے کھڑا کیا جارہا ہے۔ زمین پر بچھی ٹاٹ کی جگہ بدلی جارہی ہے۔ پتیلیاں چھکائی جارہی ہیں۔۔۔۔ اس گھر کی محبت اور خوشی میں وہ اپنی اس محرومی اور بدنصیبی کو بھی بھول بیٹھی تھی جو گھن کی طرح اسے کھائے جارہی تھی اور جس کی بدولت ساس نندوں کے طعنے سنتے سنتے اس کا کلیجہ چھلنی ہوچکا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کے میاں کی نگاہیں بدلی بدلی نظر آتی تھیں اور سوت کا خوف ایک سیاہ منحوس سائے کی طرح ہر وقت اس پر منڈلاتا رہتا تھا۔۔۔ کہ اس کی خالی گود ہاشم کو دوسرے بیاہ پر نہ اکسا دے! پر وہ کیا کرتی؛ قسمت ہی کی ہیٹی تھی۔ نہیں تو تین بار وہ امید سے ہوئی اور ہر بار دوسرے یا تیسرے مہینے آس نراس میں بدل گئی۔ بھاری بھاری بوجھوں کے اٹھانے کی وجہ تھی یا خود اس کی جسمانی

کمزوری یا ۔۔۔۔ ہاشم ۔۔۔۔ کی زیادتیاں ۔۔۔۔ وہ یہ سب کیا جانے ۔۔۔۔
اسے تو صرف اس جال کا، حقیقت کا احساس تھا کہ ہر بار وہ اس انمول دولت کو کھو کر خالی ہاتھ رہ گئی تھی ۔۔۔۔ اور ہمدردی و محبت کے بدلے ہمیشہ اسے ساس نندوں اور پڑوسنوں کی دلدوز باتیں سہنی پڑیں تھیں ۔۔۔ اسی لیے تو اس بار وہ رو دھو کر ہاشم کے ساتھ شہر میں چلی آئی تھی جہاں وہ مزدوری کرتا تھا۔ اور کئی مہینے کی ٹھوکریں کھانے کے بعد اب اسے چین سے ایک ڈھنگ کی جھونپڑی بسا کر رہنے کا موقع ملا تھا.......

ایک دن پاربتی اور مریم دونوں کی ملاقات مشن اسپتال میں ہوئی۔ پاربتی کی طبیعت گری گری سی تھی ۔۔۔۔ موسم کے بدلنے کا اثر تھا شاید ۔۔۔۔ اور مریم کو کئی دن سے متلی اور چکر نے پریشان کر رکھا تھا..... پاربتی ایک آرام کرسی پر بیٹھی تھی۔ نائی لون کی قیمتی ساڑھی اور چکن کا بے آستین کا بلاؤز پہنے۔ ہاتھ میں چمڑے کا قیمتی پرس لیے اپنی اونچی ایڑی کو بار بار بے چینی سے زمین پر مار رہی تھی!

مریم اسی کے قریب لکڑی کے ایک بنچ پر کچھ خوف زدہ سی ٹکی ہوئی تھی۔ سستی چھینٹ کا میلا تنگ پاجامہ اور ڈورئیے کا پرانا سا کرتہ اس کے بدن پر تھا۔ دوپٹے کا رنگ و روپ اس قدر بدل گیا تھا کہ یہ پہچاننا دشوار تھا کہ وہ کس کپڑے کا ہے۔ گاڑھے کی موٹی چادر اس نے برائے نام پردے کے لیے سر پر ڈال رکھی تھی۔ اس کی نظریں پاربتی کے چمکتے کپڑوں اور میک اپ سے دمکتے ہوئے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

پاربتی ان دو موٹی موٹی خوبصورت آنکھوں کو مسلسل گھورتے دیکھ کر بے کل سی ہو گئی۔ ان جاہل عورتوں کی عجیب عادت ہوتی ہے یہ ۔۔۔ تیسری بار پھر اس نے نظر اٹھائی اب مریم ایک ننھے سے بچے کی طرف مخاطب تھی! اور پاربتی کی نظریں اس پر سے ہٹائے نہیں ہٹ رہی تھیں۔

پاربتی خوبصورت سمجھی جاتی تھی۔ اور وہ اپنے حسن کو دو آتشہ بنانے کے لیے مصنوعات کا استعمال بڑی فراخدلی سے کرتی۔ احساسِ حسن بھی کم نہ تھا۔ حسین سے حسین عورت کو وہ خاطر میں نہ لاتی مگر اس میلی کچیلی غریب مزدورنی کے حسن نے اس وقت اس کو مسحور کر لیا۔ سیاہ آنکھوں میں یہ معصومیت اور گہرائی، پسینہ اور گرد سے اٹے چہرے کے رنگ میں موتی کی سی آب، گلابی پتلے ہونٹوں پر یہ ادھ کھلی کلی کی سی مسکان — کتنی دلکش صورت ہے۔ اگر اسے اچھے کپڑے پہنائے جائیں تو سوسائٹی میں اس کا جواب نہ مل سکے گا۔

پاربتی کو اپنی طرف گھورتے دیکھ کر مریم شرماسی گئی پھر بڑی اپنائیت سے اس نے پوچھا "بی بی جی — تم ہمارے پڑوس والی میم صاحب ہو نا؟"

اب پاربتی کو یاد آیا کہ یہ وہی عورت ہے جس نے اس کے احاطے کے باہر جھونپڑی ڈالی ہے — اور اکثر ادھر ادھر گھومتی لکڑیاں چنتی، پانی بھرتی اور گنگناتی ہوئی اسے اپنی فرانسیسی کھڑکیوں میں سے نظر پڑ جاتی ہے۔ پاربتی چھ مہینے پہلے جب پہاڑ سے واپس آئی اور اس نے احاطے کی دیوار کے سہارے یہ جھونپڑا کھڑا دیکھا تو بہت بگڑی تھی۔ مالی کو ڈانٹا، چوکی دار کو برا بھلا کہا کہ کیوں اس نے ان خانہ بدوشوں کو یہاں رہنے دیا۔ کل کو اگر کہیں چوری چکاری ہو گئی تو کون ذمہ دار ہو گا؟ لیکن جب اس نے ملازم سے کہہ کر ان کا جھونپڑا وہاں سے ہٹوانا چاہا تو مینش کی رحم دلی ابل پڑی "پاری — کیوں تم ان بے چاروں کو بے گھر کرنا چاہتی ہو۔ آخر وہ تمہارا کیا بگاڑ رہے ہیں۔"

"جانے کون ہیں — ایسے اٹھائی گیروں کو کوٹھی کے باہر رہنے دینا بہت خطرناک ہے۔"

"بچارے شریف مزدور ہیں۔ اٹھائی گیرے تو نہیں۔ پھر تمہاری زمین پر تو نہیں بسے —"

"پر ہماری دیوار کے سہارے تو چھپر ڈالا ہے — اور دیکھو نا —

کتنا بدنما لگتا ہے ۔"

"اس بدنمائی کو مٹانے کے لیے تو ہمیں اپنے دیش کی حالت سنوارنی ہوگی۔ اپنے کروڑوں باسیوں کا اسٹینڈرڈ اونچا کرنا ہوگا ۔۔۔ ان کو رہنے کو مکان کھانے کو روٹی، پہننے کو کپڑے کا بربندھ کرنا ہوگا ۔۔۔ اور بے شک ہر دیش بھگت کا فرض ہے کہ وہ اس اونچے مقصد کے لیے اپنی زندگی کھپا دے ۔۔۔ ایک جھونپڑا ہٹا کر ۔۔۔ ایک خاندان کو اس کے ننھے سے گھروندے سے بے گھر کر کے تو تم اس بدنمائی کے داغ کو نہیں مٹا سکتیں پاری ۔" پاربتی شرمندہ ہو کر چپ ہو رہی ۔ مگر جب بھی اس کی نظر اس جھونپڑے یا مریم اور ہاشم پر پڑتی تو اسے گھن سے پھریری سی آجاتی ۔ عجیب جانور لوگ ہیں ۔۔۔ ان کے مرغے کی بانگ صبح صبح خواب شیریں میں خلل ڈالتی تو وہ بڑبڑانے لگتی ۔ کبھی مرغیاں باغ میں گھس آتیں تو مالی کی لاٹھی کے ساتھ پاربتی کے دشنام بھی ان کا سواگت کرتے ۔

مگر آج اس گدڑی کے لال کو دیکھ کر پاربتی کے دل میں ہمدردی کی لہریں اٹھنے لگیں کتنی سندر ہے یہ عورت ۔۔۔ اور کیسا میٹھا سبھاؤ لگتا ہے ۔ "بی بی جی ۔ میں نے کتنی دفا چاہا کہ تمھارے پاس آؤں ۔ پر جی ڈرے تھا ۔ جانے تم دھتکار نہ دو ۔ بڑی آدمی ٹھہریں ۔۔۔" بڑی بے تکلفی سے مریم نے اپنے جذبات کا اظہار کیا اور پاربتی ندامت سے پانی پانی ہوگئی ۔

"کیا نام ہے تمھارا ؟"

"مریم ۔۔۔ اور تمھارا بی جی ۔"

"پاربتی ۔۔۔"

اتنی ہی بات ہو پائی تھی کہ اندر سے مدراسی نرس نے پکارا ۔ "مریم بی بی ۔ مریم بی بی ۔۔۔" اور مریم گاڑھے کی چادر سنبھالتی ۔ ڈرتی گھبراتی ۔۔۔ اور پلٹ پلٹ کر پاربتی کی طرف دیکھتی ۔۔۔ ڈاکٹر کے کمرے کے اندر چلی گئی ۔۔۔ اور پاربتی کو غصہ آنے لگا ۔

"اُٹھ اس حقیر نی کو بلا لیا۔ ان مشن اسپتالوں کی یہی بات تو بری لگتی تھی اسے۔ ذرا چھوٹے بڑے کا پاس لحاظ نہیں کرتے سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکتے ہیں.... اسی لیے تو وہ یہاں آنا نہیں چاہتی تھی مگر منیش سے جانے کس نے اس اسپتال اور ڈاکٹرنی کی تعریفیں کر دی ہیں۔ اس کا سر جانے غصے سے کہ گرمی سے یا گندی، بسانددی عورتوں اور روتے بسورتے، غلیظ بچوں کی وجہ سے چکرا رہا تھا....

مریم کے باہر آتے ہی پاربتی کی پکار پڑی اور وہ اپنا پرس سنبھالتی ہوئی اندر چلی گئی۔ جلدی میں وہ یہ نہ سمجھ سکی کہ مریم کے چہرے پر اس وقت مسرت کی یہ برکھا کیوں ہو رہی ہے۔ جتنی دیر پاربتی اندر رہی مریم اس کی چھتری، اس کی جاپانی پنکھیا اور اس کے پانوں کی ڈبیہ اور بٹوے کو غور سے دیکھتی رہی — ایک آدھ بار چھو کر بھی دیکھا...... مگر پھر ڈر کر ہاتھ ہٹا لیا۔

جب پاربتی کمرے سے نکلی اور مریم نے اسے دیکھا تو ایسا لگا جیسے وہ کچھ بدل سی گئی ہو۔ کسی اندرونی جوش سے کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ ہاتھوں میں ہلکا سا رعشہ تھا۔ وہ آکر دھم سے کرسی پر بیٹھ گئی آنکھیں بند کر لیں اور دو آنسو ڈھلک کر اس کے غازہ آلود گالوں پر چمکنے لگے۔

"بی بی جی — کیسی طبیعت ہے جی۔ کیا کہہ دیا ڈاکٹرنی نے —"

پاس آکر ہمدردی اور گھبراہٹ کے ملے جلے لہجے میں مریم نے پوچھا۔

پاربتی نے آنکھیں کھولیں۔ جوشِ مسرت کا جو اُبال اس کے دل کو پھاڑے دے رہا تھا وہ مدھم پڑ گیا: تنہا اتنی بڑی مسرت کو سنبھالنا اس کے بس سے باہر ہو رہا تھا۔ یہ نئی ہمدرد اسے اس وقت بہت پرانی دوست محسوس ہوئی۔ پرس سے چھوٹا سا بیل دار رومال نکال کر اس نے اپنے آنسو خشک کیے اور مسکرا کر مریم کی طرف دیکھا تو آنکھوں میں آنسوؤں کی جگہ مسرت کھیل رہی تھی۔

"کیا ہوا بی بی۔" مریم نے پوچھا۔

"میں ماں بننے والی ہوں مریم۔" کپکپاتے لہجے میں اس نے کہا تو مریم

خوشی سے اچھل پڑی۔

"یہ تو بڑی کھوسی کی کھبر سنائی ـــــ تمہارا مالی کہے تھا ـــــ صاحب بچارے کب سے آس لگائے ہیں ـــــ" اسے یکایک احساس ہوا کہ اس کی بے تکلفی "بی بی جی" کو ناگوار نہ گزرے مگر پاربتی کا موڈ ہی بدل چکا تھا "ہاں مریم۔ اب تو سبھی نراش ہو چکے تھے ـــــ مجھے بھی آشا نہ رہی تھی ـــــ پر ـــــ آج۔ ڈاکٹرنی نے یقین سے کہا ـــــ کہ مجھے ـــــ تیسرا مہینہ ختم ہو رہا ہے ـــــ اور ـــــ منیش سنیں گے تو کتنے خوش ہوں گے۔"

"اللہ مبارک کرے بی بی جی ـــــ اور میں بھی ـــــ" شرماتے ہوئے مریم نے کچھ کہنا چاہا۔

"ہاں ہاں مریم ـــــ تم ـــــ کیا تم بھی؟" اشتیاق سے پاربتی نے پوچھا۔
"تمھارے کتنے بچے ہیں؟"

"ایک بھی نہیں ـــــ" حسرت سے مریم نے کہا "تین کچے بچے جاتے رہے۔ پورا ایک بھی نہ ہوا۔ اب ڈاکٹرنی کہے ہے کہ پھر ـــــ پھر ـــــ"
"تمھیں کون سا مہینہ بنایا؟" پاربتی کو اس وقت حفظِ مراتب کا خیال ہی نہ رہا تھا۔

"تیسرا یا چوتھا کہے ہے ـــــ کہوے تھی ـــــ بہت سنبھل کر رہیو۔ بوجھ نہ اٹھائیو۔ اونچا نیچا پیر نہ پڑے ـــــ لیٹی رہو تو اور اچھا ہے ـــــ" مریم نے کہا "بھلا ئی بی ـــــ ہم گریب لوگ ـــــ دن بھر محنت مجدوری کرنے والے۔ یہ نخرے کیسے کر سکیں ہیں" وہ عجیب انوکھی ہنسی ہنس پڑی۔

"نہیں اب کی بار تم بہت احتیاط کرنا۔ ایشور کی کرپا سے بچہ پورا ہوگا" پاربتی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ نرس اس کی دوا لے کر آ گئی تھی اور مریم اپنی دوا لینے جا چکی تھی۔

دروازے کے باہر موٹر کے پاس جاتے پاربتی کس سوچ ـــــ

کس انتظار میں کھڑی رہی ـــــ یہاں تک کہ مریم اپنے جسم کو کھدر کی چادر میں چھپاتی ہوئی آتی نظر آئی ـــــ گھر یہاں سے کوئی دو میل تھا ـــــ اس چلچلاتی دھوپ میں بچاری پیدل جائے گی۔

پاربتی نے آواز دی "مریم ـــــ" اس نے پلٹ کر دیکھا "ادھر آؤ ـــــ"

مریم پاس آئی ـــــ "چلو میرے ساتھ موٹر میں بیٹھ جاؤ ـــــ" تحکمانہ لہجے میں پاربتی نے کہا مگر آج اس تحکم میں نہ جانے کہاں سے نرمی اور شیرینی کی چاشنی آگئی تھی! مریم گاڑی میں اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اتنی گندی عورت کو پاس بٹھانے کی پاربتی کی ہمت نہیں پڑی۔ ڈرائیور نے گھور کر مریم کو دیکھا ـــــ ناک چڑھائی مگر منہ سے کچھ نہیں بولا اور تیزی سے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ "نبیا سنگھ ـــــ گاڑی آہستہ لے چلو ـــــ" پاربتی نے حکم دیا ـــــ پر مریم کو ایسا لگ رہا تھا کہ وہ آسمان پر اڑی جا رہی ہے۔ وہ کبھی اس کھڑکی سے جھانکتی کبھی اس میں سے اور پھر پاربتی کی طرف دیکھنے لگتی۔ اور پاربتی اس کی بچوں کی سی حرکتیں دیکھ کر بیٹھی مسکرا رہی تھی۔ من کے اندر جو تلخی اور بیزاری ہر چیز سے محسوس ہوئی تھی جانے آج وہ کہاں غائب ہو گئی تھی؟ آسمان روز سے زیادہ نکھر آیا تھا۔ پرندوں کی چہچہاہٹ زیادہ سریلی، ہوا زیادہ لطیف، پیڑ پودے زیادہ ہرے بھرے، پھول زیادہ شاداب اور لوگوں کے چہرے مہربان اور پُر محبت نظر آ رہے تھے.... ایک انجانی مسرت اس کے رگ رگ میں لہریں مار رہی تھی۔

مریم اور پاربتی کی یہ تو پہلی ملاقات تھی۔ اس کے بعد گاہے گاہے دونوں میں صاحب سلامت ہو جاتی۔ کبھی گوبر تھاپتی یا لکڑیاں بینتی ہوئی مریم کی نظر ریشمی پردوں کی اوٹ میں بیٹھی اونی سوئٹر بنتی ہوئی پاربتی پر پڑ جاتی تو وہ مسکرا کر اسے ہاتھ سے سلام کر لیتی۔ کبھی پاربتی باغ میں ٹہلتی ہوئی دیوار کے پاس آ کر مریم سے پوچھ لیتی "کیسی ہے مریم ـــــ؟

بوجھ وجھ نہ اٹھائیو ——" اور مریم مسکرا کر سر کو ایک جھٹکا دیتی "بی بی جی تم کیسی ہو سب ٹھیک ٹھاک ہے نا؟" اور پاربتی ہنس کر سر ہلا دیتی ۔ "ہاں ہے تو سب ٹھیک —— مگر مریم —— جی ڈرتا ہے ——"

"ارے بی بی جی ڈرو نہیں ۔ اللہ پر بھروسہ رکھو ۔ اس کی مرضی ہوگی تو سب ٹھیک ٹھاک ہی رہے گا ——" وہ بڑے اعتماد سے کہتی اور اس کے اعتماد بھرے لہجے کا اثر پاربتی پر بھی پڑتا ۔ "سچ تو کہتی ہے ——"

کبھی دونوں اسپتال میں مل جاتیں!! ملتے ملتے خاصی بے تکلفی ہوگئی ۔ اپنے اپنے دل کے وسوسے اور دھڑکے دونوں ایک دوسرے سے بیان کرتیں ۔ جو بات پاربتی مینش تک سے نہ کہہ سکتی اور جس کے لیے مریم کو ہاشم سے کہنے کی ہمت نہ پڑتی بڑی آسانی سے ایک دوسرے کو سنا دیتیں ۔ اس یقین کے ساتھ کہ دوسری اس کے دل کی حالت کو خوب سمجھ رہی ہے ۔

گرمی کی شدت بڑھی تو دونوں کو آٹھواں مہینہ شروع ہو چکا تھا ۔ آرام دہ خنک کمرے میں لیموں کا شربت پیتے پیتے پاربتی کو کبھی کبھی مریم یاد آجاتی ۔ "بیچاری وہاں لو کے جھکڑوں میں پڑی ہوگی ——" مگر ساتھ ہی وہ اپنے ضمیر کو یہ کہہ کر خاموش کر دیتی —— یہ سب عادت کی بات ہے ۔ اسے اتنی گرمی تھوڑی ہی ستاتی ہے جتنی ہم لوگوں کو ——'

اس نے ایک بار اپنی ملازمہ کے ہاتھ مریم کو دس روپے بھیجے کہ وہ اس کے پھل کھالے اور دن بھر من ہی من میں اپنے دیالوپن پر خوش ہوتی رہی —— مریم کتنی خوش ہوئی ہوگی اور کتنی شکر گزار بار بار اسے یہ خیال آیا ۔ مگر شام کو جب مریم اپنے بوٹے سے میلے دوپٹے سے اپنے گنبد نما پیٹ کو چھپانے کی ناکام کوشش کرتی ہوئی اس کے پاس برآمدے میں آکر بیٹھ گئی اور شرماتے اور جھجکتے ہوئے اس نے روپے یہ کہہ کر واپس کر دیے

کہ دو آپ کی محبت کا بہت بہت شکریہ ـــــ پر میرا میاں بڑا غیرت دار ہے
اور کبھی کسی کا ایک پیسے کا شرمندہ نہیں ہوا" تو پاربتی ششدر رہ گئی حیرت،
غصّے ندامت کے گوناگوں جذبات نے اسے بولنے تک نہیں دیا۔ مریم ذرا
دیر اس کے منہ کی طرف دیکھتی رہی اور پھر محبت بھرے لہجے میں بولی "بی بی جی۔
برا نہ ماننا۔ پر تم تو جانو ہو۔ مرد کی باتیں۔ ذرا سی دیر میں اِچّت اتر جاوے
ہے اس کی ـــــ تم کچھ اور خیال نہ کرنا ـــــ میرے تو کوئی ماں بہن بھی نہیں
کھیال کرنے والی ـــــ میں تو تمھیں اپنی بڑی بہن سمجھوں ہوں ـــــ"
تو پاربتی کی آنکھوں میں آنسو جانے کیوں بھر آئے ـــــ اس کے احساس
برتری کو اگرچہ بڑی ٹھیس لگی ـــــ مگر ساتھ ہی مریم اور اس کے شوہر کی
خودداری اور عزتِ نفس نے اس کے دل میں ان دونوں کی عزت کئی گناہ بڑھادی۔
اور اس کے بعد سے پاربتی نے کبھی روپے پیسے دینے کی ہمت نہیں کی۔
ہاں کبھی آپ سے آپ شوربا بھجوا دیتی اور کبھی سنترہ اور خربوزے۔ کبھی ریفریجریٹر میں
سے ٹھنڈے پانی کی بوتل اور کبھی آئس کریم۔ مریم بھی اس کی محبت کا بدلہ
اُتارنے کی کوشش کرتی رہتی۔ اپنی مرغی کے انڈے دے جاتی اور لاکھ کہنے
پر بھی پیسے نہ لیتی کبھی مکی کی روٹی یا سوکھے ٹکڑے پکا کر اس کے لیے لاتی
اور پاربتی کو ان میں اپنے ہاں کی نعمتوں سے کہیں زیادہ مزا ملتا۔۔۔۔۔۔
منیش کبھی کبھی پاربتی کو چھیڑ دیتا "ارے میم صاحب۔ اب تو اس فقیرنی
سے بڑی دوستی ہو گئی ہے ـــــ" پاربتی بگڑ کر کہتی "خبردار جو اسے فقیرنی
کہا ـــــ تم کیا جانو ـــــ وہ کتنی ـــــ کتنی ـــــ سوئیٹ ہے ـــــ"
صحیح لفظ نہ پا کر وہ انگریزی کا سہارا لیتی ـــــ وہ مریم کے حسن کی تعریف
کرتے ڈرتی تھی اور صفائی کا ذکر کرنے سے منیش کے اور زیادہ چھیڑنے
کا اندیشہ تھا۔
پر ہاشم کو بیوی کی میم سے دوستی ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ "یہ میم تو

تیرا دماغ خراب کر دے گی مریم ـــــ" کبھی کہتا " اس کا اثر تجھ پر بھی پڑ رہا ہے ـــــ جب دیکھو پڑی رہے ـــــ پنکھا جھل رہی ہے ـــــ گرمی لگ رہی ہے ـــــ جا تو بھی خس کی ٹٹیوں میں رہ جا کر ـــــ" تو مریم کو رونا آ جاتا ـــــ"۔ کیسا کٹھور مردوا ہے ـــــ ذرا بھی اسے میرا کھیال نہیں۔ ایک وکیل صاحب ہیں ـــــ کتنی کھاتر ـــــ کتنا کھیال کرت ہیں۔ پارو بی بی کا ـــــ" اور اسے روتا دیکھ کر ہاشم پگھل جاتا " اری واہ تو تو بڑی ناجک مزاج ہو گئی ہے ـــــ" وہ اس کا سر سہلا کر کہتا تو مریم سارے گلے شکوے بھول جاتی اور ہاشم کی چوڑی بالوں بھری پسینے میں بھیگی چھاتی میں منھ چھپا کر سورگ کے مزے لوٹنے لگتی ۔!

ایک دن رات کے دو بجے یکایک مریم کی آنکھ شور و غل سے کھل گئی۔ کوٹھی کی ساری روشنیاں جل رہی تھیں۔ نوکروں چاکروں کے بولنے اور "ماتا جی" کے چیخنے کی آوازیں آ رہی تھیں اور گراج میں موٹر غرا رہی تھی ـــــ وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

"کہاں جاوے ہے ری " ہاشم نے نیند میں پوچھا۔

" بی بی جی کی شاید تبیئت اچھی نا ہے ـــــ ذرا دیکھ آؤں ؟" اس نے خوشامد سے کہا۔

" تیری بی بی جی نے تو میرا ناک میں دم کر دیا ہے ـــــ" بڑبڑاتے ہوئے ہاشم نے کروٹ بدلی ـــــ اور مریم اس کی اجازت سمجھ کر کوٹھی کی طرف لپکی۔ جب وہ پہنچی تو پاربتی کو اس کی ماں اور نند سنبھالے ہوئے برآمدے میں لا رہی تھیں منیش جس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا۔ اور بجلی کی تیز روشنی میں پاربتی کا چہرہ دھلے کپڑے کی طرح سفید نظر آ رہا تھا۔ جس پر کرب کی ایک ناقابل بیان کیفیت تھی۔

مریم تڑپ کر آگے بڑھی ـــــ " بی بی جی " پاربتی نے پلٹ کر اسے

دیکھا " ارے مریم ـــــ تو بھی آ گئی ـــــ مریم ـــــ اب میں نہ بچوں گی ۔"
روتے ہوئے پاربتی نے کہا تو مریم بھی اس کے ساتھ رونے لگی ۔" باولی ہے
پارو تو " ماں جی نے پارو کو ڈانٹا ـــــ" اے لڑکی تو کیوں اسے پریشان
کر رہی ہے ـــــ" ماتاجی نے سختی اور رعونت سے مریم سے کہا ۔ انھیں
اپنی نازوں کی پلی امیر زادی بیٹی کی اس نچلے درجے کی گھٹیا عورت سے دوستی ذرا
نہ بھائی تھی ۔ اور طرہ یہ کہ مسلمان بھی !!
پاربتی نے اپنا ہاتھ ماں کے ہاتھ سے چھڑا لیا اور مریم کے کندھے پر
رکھ دیا ۔
" مریم بہن ـــــ دعا کیجیو ـــــ میرے لیے ـــــ اور ہاں دیکھ ـــــ
تو بھی وہیں اسپتال میں آوے گی نا ـــــ ؟"
" ہاں بی بی جی ـــــ" زبردستی مسکرا کر مریم نے کہا ۔
" بی بی " پاربتی اپنی نند سے مخاطب ہوئی " آپ ذرا مریم کا دھیان
رکھیے گا ۔ جب اس کو ضرورت ہو تو کار میں اسپتال لے کر خود آئیے گا ـــــ
اور دیکھنا جی ـــــ تم بھی ـــــ دھیان رکھنا ـــــ نہیں تو ـــــ" اور بات
کرتے کرتے ایک دم پاربتی کا چہرہ بگڑ گیا مٹھیاں بھینچ گئیں ، آنکھیں باہر
نکل آئیں ، ہونٹ بھینچ گئے اور اس نے لڑکھڑا کر ملنیش کا بازو تھاما تو اسے
لگا لوہے کی تیلیاں اس کے بازو میں پیوست ہوئی جا رہی ہیں ۔ ماتاجی بدحواس
ہوئی جا رہی تھیں " اچھا اچھا اب چلو جو تم کہو گی وہی ہوگا ـــــ اب دیر کا
وقت نہیں ...... آؤ بٹیا اسے سہارا دو ادھر سے ، موٹر میں بیٹھ جاوے ـــ"
ماں نے بیٹی کو موٹر کی طرف لے جانے کی کوشش کی ۔
اور اب مریم کی سمجھ میں آیا کہ یہ کسی بیماری کا دورہ نہیں کورد کے سیاگر
کی وہ لہریں ہیں ، جو اسے مادریت کے اعلیٰ مقام سے قریب تر کر رہی تھیں ۔
اور خود اس کا دل آنے والے وقت کے خیال سے زور زور سے دھڑکنے لگا ۔

ساری رات مریم کو کروٹیں بدلتے گزر گئی ـــــ "جانے بی بی کیسی ہے،
اللہ کرے جیتا جاگتا بچہ ہو ـــــ یا اللہ اس کی مشکل آسان کردے اور میری
بھی ـــــ" اپنے پیٹ کو سہارا دے کر کروٹیں بدلتے وہ یہی سوچتی
رہی ـــــ اور صبح کو سب سے پہلے اس نے پاربتی کی خیریت پوچھی۔ پتا چلا ـــــ
ابھی کچھ نہیں ہوا۔

اور دو دن اور ایک رات یوں ہی گزر گئی ـــــ مگر پاربتی کی مشکل آسان
نہیں ہوئی تھی۔ ڈاکٹرنیوں کا کہنا تھا کہ بچہ بہت پل گیا ہے۔ اور پاربتی میں
قوت برداشت بہت کم ہے سب فورس ڈیلیوری پر زور دے رہے تھے
مگر پاربتی کسی طرح راضی نہیں ہوتی تھی ـــــ اسے بچے کی جان کی پڑی ہوئی
تھی ـــــ اپنی جان کی ذرا سی پروا نہ تھی...... ماتا جی دو دن میں نیم مردہ
ہو گئی تھیں۔ اس لیے منیش انھیں اسپتال سے گھر لے آیا تھا۔ ان کے ایک
طرف فون اور دوسری طرف کرشن جی کی مورتی رکھی تھی اور وہ ہاتھ جوڑے پرارتھنا
کرتی رہتیں۔ مگر کان فون کی طرف ہی لگے رہتے تھے ـــــ سارا گھر میکے اور
سسرال کے لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ منیش نے نہ شیو کیا تھا نہ کپڑے بدلے
تھے نہ سویا تھا ـــــ چائے پی پی کر وقت کاٹ دیا تھا۔ ایک ٹانگ اسپتال
میں ایک گھر پر تھی ـــــ اور پاربتی کے پاس اب اس کی بڑی بہن لیلتا اور نند
موہنی تھیں ـــــ زیادہ آدمیوں کی ڈاکٹر نے ممانعت کر دی تھی۔

مریم بار بار بے قرار ہو ہو کر آتی اور خیر خبر لے کر چلی جاتی ـــــ دو
دن سے وہ خود بہت بے چین تھی مگر کوئی اتنا بتانے والا بھی نہ تھا کہ اب
وقت بہت قریب آ گیا ہے۔ تیسرے دن ـــــ اس کے کمر میں درد کی ایسی
لہر اٹھی کہ وہ دہری ہو گئی۔ "اے جی سنتا میرا جی بڑا گھبرا رہا ہے۔"
اس نے روتے ہوئے ہاشم سے کہا۔ ہاشم ابھی سویا ہی پڑا تھا گھبرا کر
اٹھ بیٹھا ـــــ اور گھبرا کر کوٹھی کے مالی کی بیوی کو بلا لایا۔ اس نے آ کر مریم

کو تسلی دلاسا دیا اور ہاشم سے بولی " ارے مردوئے اتنی بڑی داڑھی رکھے ہے اور تجھ کو یہ بھی خبر — نہیں — اس کا وخت بہت نجیک آ گیا ہے — جلدی سے بلا کسی دائی کو — " ہاشم بدحواس کھڑا تھا — " دائی کہاں سے لاؤں میں ؟ "

" ماں جی — دائی نہیں — مجھے تو بڑی میم کے اسپتال بھجوا دو — جہاں بی بی جی گئی ہیں — " مریم اب سنبھل چکی تھی ! " انھوں نے میرا نام لکھا رکھا ہے ! "

" اجی میم کیا کرے گی — بی بی جی دو دن سے وہاں پڑی ہیں اب تک بچہ نہیں ہوا — "

" نا — نا — میں وہیں جاؤں گی — یہاں تو مر جاؤں گی ماں — " مریم نے روتے ہوئے کہا — " بی بی جی ہوتیں تو مجھے موٹر میں بھیج دیتیں — ہائے میرا تو کوئی بھی نہیں — " پھر درد کی لہر اٹھی اور اس نے اپنے تکیہ میں منہ چھپا لیا —

ہاشم تیزی سے کوٹھی کی طرف چلا — منیش موٹر کے پاس اسپتال جانے کے لیے تیار کھڑا تھا — ہاشم ڈرتا ڈرتا پاس گیا —

" کیا ہے ؟ " تیز لہجے میں منیش نے پوچھا —

" جی — وہ — میں — میری بیوی — " ہاشم ہکلا رہا تھا منیش جھنجھلا گیا —

" کیا کہنا ہے جلدی کہو — مجھے فوراً جانا ہے — " ہاشم اور بھی گھبرا گیا — " بی بی جی — کیسی ہیں ؟ " وہ یہی پوچھ سکا —

" ابھی تو ویسی ہی ہیں " منیش ایک دم نرم پڑ گیا اسے خیال آیا یہ کہیں مریم کا میاں تو نہیں " کیا تم ہاشم ہو ؟ "

" جی حضور — "

"تو ____ تو ____"

"جی وہ ____ میری بیوی ____ بہت بیمار ہے ____ اسے اسپتال لے جانا ہے ____" اور ہاشم بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

منیش کو اس پر بڑا رشک آیا کاش وہ بھی اس کی طرح دل کی بھڑاس نکال سکتا ____ مگر ہائے ____ تہذیب کی یہ بندشیں ____ ہمدردی کا ایک گہرا احساس اس کے دل میں جاگا ____ ہاشم کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دیتے ہوئے بولا "میاں روتے کیوں ہو ٹھیک ہو جائے گی گھبراؤ نہیں۔ میں اسے گاڑی میں لیے چلتا ہوں۔ تم جلدی سے اسے لے آؤ جا کر ____"

ہاشم آنسو پوچھتا، گھر کی طرف بھاگا۔

منیش نے کار احاطے سے باہر نکالی اور سڑک پر جھونپڑی سے بیس گز کے فاصلے پر کھڑی کر دی۔ مریم دھیرے دھیرے مالی کی بیوی کے سہارے چلی آرہی تھی۔ ہاشم پیچھے پیچھے تھا۔ منیش کی نظر اس کے بے ہنگم جسم پر سے پھسلتی ہوئی اس کے چہرے پر ٹک گئی۔ درد و کرب کی لہروں کے درمیان آنکھوں میں آشنا کی جوت، ہونٹوں پر شرمیلی مسکان، اور چہرے پر مادریت کا جلال!! ایسا حسن تو آج تک اس کی نظر سے نہ گزرا تھا۔ منیش کا سر عقیدت سے جھک گیا۔

مریم بڑی مشکل سے موٹر میں بیٹھ سکی اس کی بیوی بھی ساتھ آ بیٹھی۔

"تم بھی آ جاؤ۔ میں اکیلی نا جاؤں گی ____" مریم نے روتے ہوئے کہا۔ ہاشم نے منیش کی طرف دیکھا ____ منیش نے اپنے پاس کا پٹ کھول کر اسے اپنے برابر بٹھا لیا ____ اس وقت دونوں ایک ہی کشتی میں سوار تھے۔

لیبر روم میں ایک میز پر پاربتی لیٹی تھی ____ اس کا چہرہ سوج گیا تھا۔ آنکھیں سرخ تھیں۔ ہاتھ زور لگاتے لگاتے نیلے پڑ چکے تھے ____ درد کی شدت برداشت کرنے کے لیے اسے کئی دوائیں دی جا چکی تھی مگر

اس کی کربناک چیخوں میں کمی نہ ہوتی تھی.....

بڑی ڈاکٹرنی نے پاس آکر انگریزی میں کہا "مسز مینش جب تک آپ کو آپریٹ نہیں کریں گی —— یہ مشکل آسان نہ ہوگی ——"

جھنجھلا کر پاربتی نے کہا "آپ لوگ مجھے مار ڈالیں گے —— اور کس طرح کو آپریٹ کروں —— مر تو گئی —— او —— ایشور —— ایشور —— یہ کیسا نرک ہے —— یہ کیسا عذاب ہے —— نجات دے مجھے اس مصیبت سے"

اس کی ہچکیاں بندھ گئیں —— مگر اسی وقت درد کا ایک اور ریلا آیا ——

ڈاکٹر تیزی سے میز کی طرف مڑ گئی —— نرس نے پاربتی کا ہاتھ تھام لیا ——

"بی بی ہمت کرو ——"

لیڈی ڈاکٹر اپنا کام کرتی جاتی اور نرس سے باتیں بھی —— "یہ بڑے گھرانوں کی نازک اندام لیڈیز زرا بھی سہار نہیں کر سکتیں۔ خود بھی زیادہ دکھ اٹھاتی ہیں اور ہم لوگوں کو بھی پریشان کرتی ہیں —— اور بے چاری ورکنگ کلاس کی عورتیں —— کتنا سہارتی ہیں —— اسی لیے تو بچے بھی ان کے آسانی سے ہو جاتے ہیں ——"

بڈھی نرس نے جواب دیا "یس ڈاکٹر۔ یہ بھی ہے —— مگر ایک بات اور ہے ان لوگوں کو تکلیف ہوتی بھی زیادہ ہے —— وہ لوگ زیادہ جفاکش زیادہ محنتی ہوتی ہیں۔ دکھ سہنے کی طاقت ان میں زیادہ ہوتی ہے تا —— آخر تک چلتی پھرتی کام کرتی رہتی ہیں"

پاربتی جو یونہی بے حال تھی یہ باتیں سن کر غصے سے اور بے قابو ہوئی جا رہی تھی۔ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر درد کے ریلے نے بولنے نہیں دیا۔ اب کی مرتبہ اس کی چیخوں میں درد کرب کے ساتھ ساتھ غصہ بھی تھا۔

"بی بی دیکھو —— زرا تو سہارے سے کام لے لو —— اس عورت کو دیکھو —— اس کا بھی نو: پہلا بچہ ہے اس کی عمر بھی تمھاری طرح زیادہ ہے اور

بے چاری کتنی کمزور ہے۔ پر کتنی برداشت ہے اس میں ـــــ"
بڈھی نرس نے پیار بھرے لہجے میں سمجھایا۔ پاربتی نے حواس میں آنے کے بعد اپنی رقیب کی طرف غصے سے دیکھا جس کی تعریفیں جلے پر نمک چھڑک رہی تھیں۔ وہ دوسری میز پر پڑی تھی۔ بیچ میں اسکرین تھا۔ ہاں اس کے چہرے کی جھلک نظر آرہی تھی.....

"ارے مریم ـــــ تم بھی ـــــ"

"ہاں بی بی جی ـــــ رات آئی ادھر گئی ہیں تو بی بی ـــــ آہ ـــــ"

"آہ ـــــ مریم ـــــ مریم۔ یہ سب ظالم ہیں سنگ دل ـــــ انھیں کوئی احساس نہیں کہ ہم پر کیا بیت رہی ہے ـــــ اوہ ـــــ آہ ـــــ افوہ"
ڈاکٹرنی پریشان تھی کہ کس کے پاس جائے ـــــ دونوں کی تھرڈ اسٹیج تھی۔

"نرس تم اس عورت کے پاس جاؤ ـــــ میں یہاں ہوں ـــــ" اس نے خود پاربتی کے پاس رہنے کا فیصلہ کیا ـــــ آخر وہ ایک مشہور رئیس وکیل کی بیوی تھی نازک اندام و نازک مزاج ـــــ مریم کا کیا تھا ـــــ اس کلاس کی عورتوں کو تو دائیوں کی بھی اکثر ضرورت نہیں پڑتی !!

تین گھٹی ہوئی چیخیں، نومولود کی ننھی سی پیاؤں پیاؤں کی کئی آوازوں میں کھو گئیں۔ مریم کی مشکل آسان ہو گئی تھی۔ مگر پاربتی کی کربناک کراہ اب بھی مریم کے دل میں چبھ رہی تھی۔

بڈھی نرس باہر آئی ـــــ "لڑکا ہے ـــــ"
منیش، ماتاجی، اور آٹھ دس عورتیں مرد بے قرار ہو کر آگے بڑھے۔
"لڑکا ہوا ہے۔ پاربتی کیسی ہے؟"
نرس نے ان خوشحال پوش لوگوں کی طرف دیکھا ـــــ یہ تو مریم کے گھر والے نہیں ہو سکتے! ـــــ بے اعتنائی سے رخ موڑا تو پیچھے کھڑے

ایک بدحواس میلے کچیلے مزدور پر اس کی نظر ٹک گئی۔

"اے ــــ سنو بہن! لڑکا ہوا ہے تمہارے" اور پھر وہ منیش کی طرف مخاطب ہوئی ــــ "مسٹر آپ کو ابھی اور شاید آدھ گھنٹے انتظار کرنا ہوگا"۔

پاربتی کے گھر والوں کے چہرے لٹک گئے ــــ ماتا جی بڑبڑائیں ــــ "آج ہی آئی اور آج ہی فارغ ہو گئی وہ ــــ میری بچی تین دن سے پڑی ہے۔ خاک پڑے ان ڈاکٹرنیوں کی صورت پر ــــ" گویا قصور قدرت کا نہیں ڈاکٹر کا تھا۔

ہاشم کا چہرہ مسرت اور غرور سے دمک اٹھا تھا۔ آنکھوں میں تشکر کے آنسو بھر آئے تھے ــــ مگر غریب کی مسرت میں بھی کوئی شریک نہیں ہوتا ــــ آدھ گھنٹے ــــ کہ آدھا دن ــــ کون جانے کتنا وقت بیت گیا ــــ منیش کی بدحواسی بڑھ رہی تھی ــــ شاید بچہ زندہ نہ ہو ــــ شاید پاربتی نہ بچ سکے ــــ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا رکھا تھا ــــ اور اس کی بہنیں اور بھائی اس کے پاس کھڑے اس سے زیادہ پریشان نظر آنے کی کوشش کر رہے تھے ــــ اب کے بڈھی نرس باہر آئی تو سب ہی دوڑے اس کی طرف ــــ "بے بی گرل ــــ" اس نے اناؤنس کیا۔

"سچ! ــــ واقعی! ــــ اے الشور! شکر ہے تیرا بھگوان! یہ لڑکی سو لڑکوں کے برابر ہے ــــ" کئی آوازیں بلند ہوئیں زندگی میں پہلی بار منیش کے دل نے سچی عقیدت سے بھگوان کا شکر ادا کیا ــــ بغیر منہ سے ایک لفظ نکالے ــــ ہر طرف سے لوگ اسے گھیرے مبارکباد دے رہے تھے! ماں جی اور ماتا جی خوشی کے آنسو بہا رہی تھیں۔ پھر ہاشم کا چمکتا ہوا چہرہ منیش کو نظر آیا "مبارک ہو بابو جی ــــ" منیش پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔

"شکریہ ــــ اور تمہیں بھی بیٹا مبارک ہو" اس نے دوستانہ انداز سے ہاشم کی کمر تھپتھپاتے ہوئے کہا ــــ دونوں باپوں کے چہروں پر اس وقت

مسرت و غرور کا ایک ہی سا رنگ نکھر آیا تھا۔

اور اندر میز پر پڑی دونوں مائیں اپنے بچوں کو دیکھ رہی تھیں۔ آنکھوں میں شکر کے آنسو، چہروں پر ماں کا جلال! ہونٹوں پر مسرت بھری مسکان لیے ــــ اور پھر دونوں نے ایک دوسرے کو مسکرا کر دیکھا ــــ کتنی برابری، مساوات اور اپنا ئیت تھی اس نظر میں۔ سارے سماجی بھید بھاؤ ختم ہو چکے تھے۔

٥

کایا پلٹ

یوں تو اس دور میں بہت سے زمینداروں، رئیسوں اور حاکموں کے لاڈلے مرزا پھویا قسم کے بیٹے اس کالج میں پڑھنے آتے تھے جن کا خوب خوب مذاق بنتا اور اکثر وہ رو دھو کر بھاگ بھی جاتے تھے۔ مگر شفن میاں جس ٹھاٹ باٹ سے آئے وہ اور ہی تھے۔ خدمت کے لیے دو ملازم ساتھ۔ پہننے کے لیے جامہ دار کی شیروانیاں اور جامدانی کے انگرکھے، ریشمی بنیان، ریشمی موزے اور کمربند۔ چکن کے کرتے اور "تین پی" کے لٹھے کے غرارہ دار پاجامے۔ انواع و اقسام کے کھانوں کے پارسل گھر سے آتے رہتے۔ جتنے روپے کی ضرورت ہوتی باپ چچا بھیج دیتے۔ کسانوں کے لہو پسینے کی کمائی لاڈلے بیٹوں کے شوق پر اسی دور میں بے دریغ خرچ کی جاتی تھی نا۔

متوسط گھرانوں کے ذہین و شوقین نوجوانوں نے ابتدا میں شفن میاں کا خوب خوب مذاق اڑایا۔ کبھی لباس پر پھبتیاں اڑ رہی ہیں، کبھی جھک جھک کر تسلیمیں ہو رہی ہیں۔ حضور ہمارے لائق کوئی خدمت؟ کبھی اس کے گھر سے آئے ہوئے حلووں، اچاروں اور مٹھائیوں پر ڈاکہ ڈالا جا رہا ہے اور پھر آ کر چڑا رہے ہیں "حضور ہی کا کھاتے ہیں" کبھی اس کی چاندی کی

ڈبیہ اور کار چوبی بٹوے میں سے پان اور مسالہ اڑایا جا رہا ہے اور پھر ان کے قہقہے جو اچھے بھلے کو پاگل بنا دیں۔

ابتدا میں وہ بہت گھبرائے۔ امیر گھرانے کا لاڈلا بڑا بیٹا جس کے آگے پیچھے جی حضور کہنے والے مصاحب پھرا کرتے۔ اسکول میں داخل ہوئے تو لڑکے ہی تھے ماسٹر تک لحاظ و پاس کرتے کہ "میاں" کے صاحبزادے پڑھنے آئے ہیں تو گویا اسکول کی عزت افزائی ہوئی ہے اور یہاں یہ حال کہ پاس لحاظ تو رہا دور الٹا لوگ بناتے، چھیڑتے، ستاتے۔ اس کا کھلتے، اسی کو بے وقوف ثابت کرتے۔ ویسے کالج کی فضا اسے پسند تھی۔ یہاں باپ چچا کی ہر وقت کی روک ٹوک اور تنبیہ نہ تھی۔ جب جو جی چاہے کرو۔ جہاں چاہو آؤ جاؤ۔ ماں اور چچی کی بے جا ناز برداریاں نہ تھیں جن سے وہ عاجز آ چکا تھا، مصاحبوں کی "جی حضور" نہ تھی جن سے وہ چڑتا تھا۔ پھر بھی چند مہینے تک وہ اس ماحول میں کھپ نہ سکا۔ مگر غیر شعوری طور پر اس نے طے کر لیا کہ وہ یہاں سے گھبرا کر بھاگے گا نہیں بلکہ ان سب لوگوں کو زیر کر کے رہے گا۔

پھر چند مہینوں ہی میں وہ طالب علموں میں ہر دلعزیز ہو گیا۔ اس کی فیاضی اور محبت اور سب سے زیادہ ہنسنے ہنسانے والی عادت جس میں دوسروں سے زیادہ اپنے پر فقرہ بازی کر کے کھنکتا قہقہہ بلند ہوتا۔ نوجوانوں کو زیر کرنے کے لیے کافی تھا۔ استاد جو ابتدا میں اسے نرا رئیس زادہ سمجھتے تھے۔ اس کی ذہانت اور شوق و محنت سے متاثر ہوئے اور تعلیمی سال کے آخر میں جب وہ اپنے گھر جانے کی تیاریاں کر رہا تھا تو وہ بڑا مطمئن تھا۔ اسے زندگی میں پہلی بار کچھ سوچنے، کچھ سمجھنے، کچھ کرنے، کچھ بننے کا موقع ملا تھا — اس نے اسے بیکار نہیں کھویا۔

وہ اپنے قصبے میں پہنچا تو سب نے اس تبدیلی کو محسوس کیا۔ نو عمر جھینپو دبا سہما لڑکا ایک خود اعتماد، باوقار سمجھ دار نوجوان کا روپ دھار چکا تھا

عمو جان اس کے سنجیدہ انداز گفتگو سے متاثر ہوئے۔ ابو جان کو کتب بینی کے شوق نے خوش کر دیا۔ خاندان کے بزرگوں کو بڑا اطمینان ہو آکہ گھرانے کا سب سے پہلا لڑکا جو مغربی تعلیم پانے گیا ہے۔ ایک دن ضرور بڑا آدمی بن کر خاندان کا نام روشن کرے گا۔ کیا عجب کسی دن ڈپٹی کلکٹر بن جائے۔ ادیہ وہ دور تھا جب ہندستانی رئیسوں کی امیدوں کی معراج بیٹوں کو تحصیلدار یا ڈپٹی کلکٹر بنانا ہوا کرتا تھا۔

چھٹیوں میں اس نے اپنی بہنوں اور اپنی چچا زاد بہن کو اردو لٹریچر اور انگریزی کی ابتدائی کتابیں پڑھانی شروع کیں۔ ابو جان اور ان سے زیادہ عمو جان برسن کر بہت برہم ہوئے۔ بھلا شریف رئیس گھرانوں کی لڑکیوں کے لیے کیا یہ زیبا ہے کہ عشق و عاشقی بھرا اشعر و ادب اور بدیسی کافر زبان پڑھیں، لڑکوں کو تو ملازمت کرنا ہے۔ ان کا زیور تو یہ ہے کہ گھر داری سیکھیں، کروشیہ اور اون کی بنائی میں ماہر ہوں۔ عمدہ کھانا پکا سکیں۔ اور شوہر اور ساس سسر کی اطاعت کا سبق پڑھیں۔ بظاہر لڑکیوں کی تعلیم بند کر دی گئی۔ مگر وہ چھپ چھپ کر انھیں پڑھاتا رہا۔ اس کی چچا زاد بہن جس شوق اور تیزی سے بڑھ رہی تھی اس سے اسے بہت خوشی تھی۔ وہ الھڑ لڑکی تو نہ جانتی تھی مگر اسے معلوم تھا کہ بزرگوں نے اس کو شفن میاں کا شریکِ حیات بنانے کے لیے چنا ہے۔ واپس جاتے وقت اس نے وعدہ کیا کہ وہ بہت سی اور کتابیں کسی طرح ان کو بھیجے گا۔

دو سال میں اگرچہ ان میں ظاہری تبدیلی بھی تھوڑی بہت ہوئی مگر ذہنی اور اندرونی تبدیلی ایسی تھی کہ دوسروں کا کیا ذکر وہ خود بھی پوری طرح اس سے آگاہ نہ تھا۔ یہاں آنے سے پہلے سیاست دریاست سے وہ بالکل نابلد تھا۔ ملک میں کیا ہو رہا ہے یہ تو اس کے بزرگ بھی نہ جانتے تھے مگر کالج میں چند پُرجوش نوجوان اور کچھ پروفیسر ایسے بھی تھے جن کو سیاست سے گہری دلچسپی اور دیس کی آزادی کی لگن تھی۔ وہ جونیئر طالب علم تھا۔ ان لوگوں سے اس کی دوستی تو

کیسے ہوئی، مگر وہ ان کے ہیرو ضرور بن گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیس کی محبت اور اس آزادی کی خواہش چپکے چپکے دل میں جڑ پکڑنے لگی۔ پھر سیاست نے پلٹا کھایا۔ ۲۰ء میں تیسرے سال وہ کالج آیا تو ایک نیا جوش وخروش پھیلا دیکھا۔ ٹھو کارکنوں اور پالیسی و حاکموں کی لاکھ کوشش کے باوجود آزادی کی تحریک اور خلافت کی تحریک کے اثرات اس کے کالج میں بھی پہنچ چکے تھے اور سوچنے والے ذہن کچھ سوچ رہے تھے کچھ فیصلہ کر رہے تھے۔

پھر بدیسی چیزوں کے بائیکاٹ کے ساتھ ساتھ بدیسی اثرات میں دی گئی تعلیم کے خلاف بھی آوازیں اٹھنے لگیں۔ اور اس کے کالج میں ایک حق پرست مرد مومن کی کوشش اور ایما پر ایک نئے قومی و ملی ادارے کی بنا پڑ گئی۔ وہ لوگ جنھوں نے اس ادارے کو لبیک کہا۔ مردود سمجھ کر کالج سے نکال دیے گئے۔ ان سرفروش مہاجروں میں شفن میاں بھی تھے۔ گھر سے پہلے خط آئے، تار آئے، پھر لینے کے لیے آدمی بھیجے گئے مگر شفن میاں جانتے تھے کہ اس وقت جانا موت کے منھ میں جانا ہوگا۔ البتہ مہینے بھر بعد جب ان کا نیا ادارہ جم گیا، ان کا داخلہ طالب علم کی حیثیت سے ہو گیا اور تھوڑا انتظامی کام بھی انھوں نے سنبھال لیا تو وہ پھر ابا جان وغیرہ کے پاس لکھنؤ گئے جنھوں نے حال میں دیہات کی سکونت کو خیر باد کہہ کر شہر میں رہنا طے کیا تھا۔

پہلی نظر میں کسی نے اسے پہچانا ہی نہیں۔ مولانا محمد علی وغیرہ کے اثر میں رہ کر اس کی وضع قطع لباس سب کچھ بدل گیا تھا۔ بے حد موٹے کھدرے کھدر کا لمبا کرتہ اور تنگ مہری کا پاجامہ، چھوٹی سی داڑھی، کندھے پر رومال۔

"اے ہے۔ یہ کون موا زنانے میں گھسا چلا آ رہا ہے۔" امی جان نے دوپٹے کی آڑ کر کے ڈانٹا، مگر اس کی منگیتر کی کھلنڈری ہنسی نے جو اسے اس دھج میں دیکھ کر ہنسی کے مارے لوٹی جا رہی تھی، راز فاش کر دیا۔

اور پھر تو کئی دن گھر میں وہ ہنگامہ برپا رہا کہ خدا کی پناہ۔ خاندان کے دور پرے کے سبھی بڑے بوڑھوں نے ڈانٹا پھٹکارا۔ ابو جان نے بھرائی آواز

میں اپنی خاندانی عظمت و وقار کا واسطہ دے کر اس دیوانگی سے باز رکھنا چاہا جس سے ان کے خاندان کی صدیوں کی وفاداری خاک میں مل جائے گی۔ بدیسی حکمرانوں کی نظرِ عنایت عتاب میں بدلنے کا اندیشہ انھیں کھائے جا رہا تھا۔ عمو جان نے مستقبل کی مصیبتوں کا ایسا نقشہ کھینچا کہ کوئی اور ہوتا تو کانپ جاتا۔ انھوں نے کہا وہ اپنی اس حرکت سے باز آئے تو وہ اپنے اثر سے کام لے کر نہ صرف ناخدایانِ کالج سے اس کا قصور معاف کرا دیں گے بلکہ بدیسی حاکموں سے کہہ سن کر ان سے بھی معافی دلوا سکتے ہیں۔ وہ یہ سن کر اور بپھر گیا۔ وہ آزادی کی فوج کا سپاہی ہے۔ اس کا کام اپنے ملک کی غلامی کی زنجیریں توڑنا ہے خود بیڑیاں پہننا نہیں۔ ان بدیسی سامراجیوں ہی سے تو اسے اپنے ملک کو پاک کرنا ہے۔

پھر غصے کا طوفان آیا۔ عاق کرنے کی دھمکیاں دی گئیں۔ عمو جان نے اپنی اکلوتی بیٹی کی شادی ایسے سرپھرے نوجوان سے کرنے سے انکار کر دیا۔ ابو جان نے خرچ بند کرنے کا اعلان کیا۔ مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا وہ واپس جانے کی تیاریاں کرنے لگا ـــــ

اب آنسوؤں کا سیلاب اس کے راستے میں حائل ہوا۔ امی جان کی آنکھوں سے گنگا جمنا بہہ رہی تھی اور وہ اسے گلے سے لپٹا کر ایسے بین کر رہی تھیں جیسے ننھے میاں نئے کالج نہیں، اللہ میاں کے ہاں جا رہا ہو۔ چچی جان اس کے سر پر ہاتھ پھیر پھیر کر آنسوؤں کے ہار نچھاور کرتی جاتی تھیں اور کہتی جاتی تھیں "بیٹا میری سدو کا کیا ہو گا؟ کیوں اپنے ساتھ اسے بھی تباہ کرنے پر تلا ہے۔ سوچ ـــــ تو ـــــ تیرے عمو جان کیسے ضدی ہیں ـــــ"۔ بہنیں سسک سسک کر رو رہی تھیں اور ان کی البیلی سدو کی نرگسی آنکھوں میں موٹے موٹے موتی کانپ رہے تھے۔

ایک لمحے کے لیے وہ کانپ گیا ـــــ کیا ان سب محبوب ہستیوں کو چھوڑنا پڑے گا نہیں نہیں ـــــ یہ وہ کیسے سہار سکتا ہے ـــــ مگر اندر سے کوئی آواز اٹھ رہی تھی۔ حق کی محبت، دیس کی بیلوا، ہر محبت سے افضل ہوتی ہے ـــــ اس محبت کے شعلے میں تپ کر اور ساری محبتیں کندن بن جاتی ہیں۔

اس نے ماں کے آنسو پونچھے ——— بچی کو ہنسایا ——— بہنوں کو گدگدایا اور سدّو کا منھ چڑاکر قہقہہ لگاکر بولا:۔

"بس بس اب یہ رونی صورتیں ٹھیک کرو ——— اچھا بھئی ——— لو ہنہیں جاتے ———"

ہر طرف مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ اور اس گھر میں چہل پہل کا دورہ دورہ ہو گیا۔ پھر بزرگوں میں میسکوٹ ہوئی۔ اُسے ایسے بندھنوں میں جکڑ دو کہ ہل نہ سکے۔

رات کو قاضی آیا، کتنے کے بڑے بوڑھے جمع ہوئے۔ شفن اور سدّو عقد کے بندھن میں باندھ دیے گئے۔ رخصتی تعلیم ختم ہونے پر ملتوی کردی گئی ——— اور رات گئے گھر کے سب افراد بے فکر ہوکر غفلت کی نیند میں ڈوب گئے۔

صبح کا دھندلکا ہر طرف چھایا ہوا تھا۔ کوئی چیز صاف نظر نہیں آرہی تھی۔ پھر بھی جب شفن میاں ڈیوڑھی سے اندر دبے پاؤں داخل ہوئے تو انھیں یہ اندازہ کرتے دیر نہ لگی کہ صحن کے اس سرے پر بچی اماں کے پلنگ سے بھڑی ہوئی چارپائی اس کی نئی نویلی دلہن کی ہے۔ آہستہ سے اس نے سرہانے کھڑے ہوکر پکارا ——— سدّو ——— مگر سدّو لڑکپن کی نیند میں مدہوش تھی! نیم وا آنکھوں میں سپنوں کا خمار اور ہونٹوں پر کسی کے تصور میں میٹھی سی مسکراہٹ۔ ذرا دیر وہ مبہوت کھڑا اسی دلکش صورت کو تکتا رہا جو صبح کاذب کی روشنی میں اور بھی حسین نظر آرہی تھی ——— مگر وقت کم ہے ——— اس نے اپنا ہاتھ آہستہ سے اس کے ماتھے پر رکھا ——— سدّو!"

وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی اور پھر اسے پہچان کر لاج سے یوں دہری ہوگئی، جیسے وہ چھوئی موئی کا پودا ہو۔

"خدا کے لیے سدو ۔۔۔۔۔ وقت کم ہے ۔۔۔۔۔ میری دو باتیں سن لو ۔۔۔۔۔"
اس نے سرگوشی کی! وہ کچھ شرمائی، کچھ سہمی، کچھ خوش ۔ اسے عجیب ادا سے دیکھ رہی تھی ۔
"میں جا رہا ہوں سدو ۔۔۔۔۔ وہیں، جہاں سے آیا تھا ۔۔۔۔۔ آزادی کی جنگ میں حصہ لینے ۔۔۔۔۔ شاید اب خاندان والے میرا منہ نہ دیکھیں مگر تم ۔۔۔۔۔ تم ۔۔۔۔۔" اس کی آواز کانپ گئی ۔
"میں جس کی ہو چکی ۔۔۔۔۔ اس کی ہوں ۔۔۔۔۔ اور رہوں گی ۔۔۔۔۔ آواز باریک، دھیمی مگر پُرعزم تھی ۔
"اچھی طرح سوچ لو ۔۔۔۔۔ میں افلاس، کٹھنائیوں، مصیبت اور شاید جیل کی طرف جا رہا ہوں ۔۔۔۔۔ ہے حوصلہ؟ دے سکو گی ساتھ؟" اس نے جیسے چنوتی دی ۔
"ہمیشہ ۔۔۔۔۔ آخری سانس تک ۔" سدو نے چنوتی کو قبول کر لیا ۔۔۔۔۔

وہ الھڑ حسینہ اس وقت کیا جانتی تھی کہ وہ کیا عہد کر رہی ہے ۔ یہ تو اسے بعد میں پتا چلا کہ اس کے شوہر نے جو رستہ ۱۹۲۰ء میں چنا تھا تیس سال تک ۔۔۔۔۔ اپنے آخری سانس تک ۔۔۔۔۔ ثابت قدمی کے ساتھ وہ اس پر چلتا رہا ۔۔۔۔۔ عشق کی اس کٹھن راہ کا ہر کانٹا اس کے لیے پھول، ہر پتھر موتی، ہر مصیبت راحت تھی ۔۔۔۔۔ اس وقت تو وہ بس اتنا سمجھی کہ اسے اپنے نرالے مزاج شوہر کا ساتھ دینا ہو گا ۔ جب وہ اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر چند لمحے دارفتہ نظروں سے اسے دیکھتا رہا اور پھر ایک دم تیزی سے باہر نکل گیا تو اس کی آنکھوں سے اس جدائی کے احساس سے برکھا ہونے لگی! ۔۔۔۔۔ صبح کو بزرگوں کو پتہ چلا کہ شفن میاں بلے کہے سنے کہیں چلے گئے ۔۔۔۔۔ کہاں، یہ ظاہر ہی تھا ۔۔۔۔۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا؟ لڑکی کی قسمت تو پھوٹ ہی گئی تھی!

اور پھر چند دن بعد یہ خبر خاندان بھر پر بم کے گولے کی طرح گری کہ شفن میاں گرفتار ہو کر دو سال کے لیے جیل سدھارے۔

باپ چچا خاندانی وقار اور اپنی قسمت کا ماتم کر رہے تھے۔ ماں کی مامتا تڑپ رہی تھی، بہنیں بھائی کے جیل جانے کے تصور سے لرزاں تھیں۔ چچی اپنی بیٹی کی پھوٹی قسمت پر بین کر رہی تھیں اور ان کی بیٹی ان سب سے بے نیاز اخبار میں چھپی شفن میاں کی تصویر کو دیکھے جا رہی تھی، جس پر عزم و یقین کا وہ نور تھا جو صرف شہیدوں کے چہرے پر نکھرتا ہے اور ہونٹوں پر وہی مخصوص دلکش ہنسی! وہ ایک مجاہد کی شریکِ حیات ہے اور اس احساس کے ساتھ اس کے گلابی ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل گئی۔

ماں اور ساس نے روتے روتے سینے پر ہاتھ مارا "ہے ہے صدمے نے بچی کے دشمنوں کو پاگل کر دیا۔"

لکشمی

"نام؟"

"لکشمی"

"کتنے دن کا ہے؟"

"تین مہینے کا"

"بچے کے باپ کا نام"

"بابو — ایک ہو تو بتاؤں۔"

لہجے کی تلخی اور جملے کی کاٹ اس کے دماغ میں جا کر چبھ گئی۔ گھبرا کر اس نے سامنے دیکھا، اسے لگا مرجھایا پھول، ٹوٹے کھنڈر، کچلا حسن زندگی میں پہلی بار دیکھ رہی ہے۔ اس عورت کے چہرے کی معصومیت کو مصیبت نے دبا لیا تھا۔ کمان جیسے ہونٹوں پر لاتعداد ننھی ننھی لکیریں اور خراشیں پڑی تھیں۔ نتھنے پھڑک رہے تھے۔ آنکھوں سے جیسے چنگاریاں اٹھ رہی تھیں اور چہرے پر بیک وقت غم، غصے، طنز، حقارت، بے بسی اور مجبوری کے جذبات ناچ رہے تھے۔ کبھی یہ عورت، جسے لڑکی کہنا زیادہ صحیح ہوگا، بہت حسین ہوگی۔ مگر اب، کوئی گلاب کو دونوں ہتھیلیوں میں مسل کر پھینک دے، کوئی تاج محل کو مسمار کر دے، کوئی مڈوتا

کی تصویر پر گندے رنگ اچھال دے؛ لکشمی کے حسن کو بھی اسی طرح مسخ کر دیا گیا تھا۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ نیم باز آنکھوں سے جھنیں گھنی سیاہ پلکوں نے ڈھک رکھا تھا ایسے زہریلے تیروں کی باڑھ نکل رہی تھی کہ اسے اپنے سارے جسم میں سوئیاں سی چبھتی محسوس ہونے لگیں۔

اپنی پانچ سالہ مدتِ ملازمت میں اسے ایسے کئی کیسوں سے سابقہ پڑا تھا جو سماج کی ٹھکرائی، کسی درندے کی ہوس کا شکار یا اپنے جذبات کی رو میں بہہ کر حماقت سے اس گندے ماحول میں آ پھنسی تھیں جسے سماج اپنے جسم کا پھوڑا سمجھتا، ناسور کہتا ہے مگر اس کا مناسب علاج نہیں کرتا۔ مگر اس لڑکی کے ہونٹوں پر طنز و حقارت کی جو لہریں، آنکھوں میں غم و غصے کا جو طوفان اور سارے وجود پر بے بسی کی سی کیفیت طاری تھی ......

ایسے 'کیریکٹر' سے وہ آج تک دوچار نہ ہوئی تھی۔

اس نے جلدی جلدی کام نپٹا لیا۔ پھر آہستہ سے اٹھ کر لکشمی کے پاس آئی جو اب اکیلی بنچ پر بیٹھی اسے گھور رہی تھی۔

"لکشمی بائی ــ میں تم سے الگ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ .... اپنے گھر کا پتا ......"

"گھر؛ میرا گھر؛ ہنھ، ہم بدنصیب عورتوں کے گھر نہیں ہوتا مس صاحب وہ تو تم جیسی خوش نصیب لڑکیاں چھین لیتی ہیں۔"

"لکشمی بائی، تم جہاں کہو وہیں میں تم سے ملنے آجاؤں گی۔ مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔" اس نے غصے کو دبا کر لہجے کو نرم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"تم اونچے گھرانے کی پڑھی لکھی لڑکیاں! ان گندی نالیوں میں کیسے پیر دھروگی جہاں ہم جیسے موری کے کیڑے رینگتے ہیں ..."

"مگر لکشمی بائی میں جو کہتی ہوں ..."

"تم لوگ ہم ابھاگنوں پر اپنی نیکی اور پارسائی کا رعب جماتی ہو۔ بیسہ کمانے کے لیے سوشل سروس کا ڈھونگ رچا کر ہمیں احساس دلاتی ہو کہ دیکھو ہم کتنے نیک، کیسے شریف ــــ کتنے بلند ہیں تم سے، پھر بھی کتنے اچھے ہیں کہ تمھیں "بہن مجھ پر بھروسا کرو۔" وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکی۔ گلا بھر آیا تھا اور آنکھیں چھلک پڑی تھیں۔ لکشمی اسے دیکھتی رہی...... دیکھتی رہی.......

دھیرے دھیرے اس کے چہرے کا رنگ بدلنا شروع ہوا۔ ہونٹوں کے گوشے کانپے، آنکھوں میں آگ کی جگہ پانی نے لے لی۔ خلوص کی دو بوندوں نے اس کے چہرے پر سے ایک خول سے اتار دیا۔

"بائی ــــ میں یہ نہیں سہار سکوں گی کہ تم جیسی پوتر لڑکی اس کوڑے کے ڈھیر پر پیر دھرے ــــ نہیں نہیں بائی میں تمھیں اپنا گھر، نہیں دکھاؤں گی۔"

کانپ کر اس نے کہا:

"مگر میرا تو یہ کام ہی ہے لکشمی بہن ــــ میں تو ایسے محلوں میں جایا ہی کرتی ہوں۔"

"تم نے مجھے بہن کہا! بہن!! آہ تو بہن۔ بہن کا یہ حال کیسے دیکھ سکے گی؟"

"اچھا تم کل میرے گھر آنا۔"

"تمھارے گھر؟ جہاں تمھارے ماں باپ، بھائی بہن ہوں گے؟" اس کی آواز میں ایسی حسرت، ایسا درد تھا جیسے کلیجہ چیر کر نکال رہی ہو ــــ "تمھارے پاک مقدس گھر میں میرے گندے پیر ــــ نہیں نہیں بائی ــــ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو ــــ مجھے کسی کی ہمدردی نہیں چاہیے ــــ مجھے کسی سے کوئی بات کرنا نہیں ہے۔ یہاں سب خود غرض ہیں ــــ وحشی ہیں ــــ درندے ــــ بے درد ــــ ظالم ــــ ہوس پرست......"

وہ چیخ رہی تھی۔ دونوں ہاتھوں سے اپنے بال نوچ رہی تھی۔ یہاں تک کہ تھک کر بنچ پر گر پڑی۔ دیکھا تو بے ہوش تھی۔

اسے موقع مل گیا۔ اسپتال کے جنرل وارڈ میں اسے داخل کرا دیا۔ منتظموں کی خوشامد کی کہ اس سے فی الحال کچھ پوچھ گچھ نہ کی جائے۔ نرسوں کی منت سماجت کی کہ اس کا خاص خیال رکھیں اور ڈاکٹر سے کہا کہ اسے نیند اور سکون کی ایسی دوا دے کہ آٹھ دس گھنٹے آرام سے سو جائے۔

مگر جب وہ یہ سب کچھ کر کے گھر کی طرف جا رہی تھی تو اس کا سر بھاری، جسم شل اور دل بے چین تھا۔ گھر پہنچ کر نہ اماں ابا سے باتیں کیں نہ چھوٹے بھائی بہنوں کے ساتھ ہنسی کھیل، نہ اچھی طرح کھانا کھایا۔ رات کو دیر تک تو سو ہی نہ سکی۔ جب بہت دیر بعد آنکھ جھپکی تو بھیانک خواب دیکھتی رہی۔ ایک بار اس نے دیکھا کہ ایک عورت جس کے جسم پر گندے پھوڑے ہیں اور کیڑے رینگ رینگ کر زمین پر پھیل رہے ہیں اس کے برابر کھڑی ہے۔ وہ ڈر کر پرے ہٹتی ہے تو عورت بھیانک قہقہہ لگا کر کہتی ہے ——

"بچے کے باپ کا نام —— ایک ہو تو بتاؤں —— ایک ہو تو بتاؤں ——"

اور پھر اپنا منھ اس کے منھ کے قریب کر دیتی ہے۔

اس نے چلانا چاہا، مگر لگا جیسے کسی نے دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا دبوچ رکھا ہے۔ ایک گھٹی ہوئی چیخ اس کے گلے سے نکلی۔ عورت کی صورت خود اس جیسی تھی۔

اماں گھبرا کر اٹھ بیٹھیں —— "کیا ہوا بی بی —— ڈر گئی کیا؟ آ میرے پاس آ جا۔"

اور جب وہ اماں کے سینے پر سر رکھ کر لیٹی تو لکشمی کا دھیان کر کے اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

اگلے دن گیارہ بجے تک وہ اسپتال میں اپنے منصبی کاموں میں الجھی رہی۔ کئی کیس تھے۔ کسی کا یہیں اسپتال میں داخلہ کرانا تھا۔ ایک کو چھوت کی بیماریوں کے اسپتال میں داخل کرنے کا انتظام کرنا تھا۔ ایک

آپریشن کا کیس تھا۔ وہ ان کاموں میں لگی تھی مگر اس کے ذہن میں لکشمی ہی کا خیال پورے وقت رہا۔ اور جب وہ سب کام نبٹا کر اوپر کی منزل میں لکشمی سے ملنے گئی تو اس کا دل ایسے دھڑک رہا تھا جیسے کسی بچھڑی سہیلی سے ملاقات ہونے والی ہو۔

اس نے آہستہ سے پردہ ہٹایا۔ اس چھوٹے سے کمرے میں صرف دو بیڈ تھے جن میں سے ایک اس وقت خالی تھا۔ کھڑکی کے برابر بیڈ پر صاف ستھرے بستر پر گلے تک سفید چادر سے اپنا جسم ڈھانکے لکشمی لیٹی ہوئی تھی۔ سر ڈھلک کر تکیے سے نیچے آ گیا تھا۔ نفرت اور وحشت اور دکھ کے سیاہ سائے اس وقت اس کے خوابیدہ پُر سکون چہرے سے بہت دور تھے۔ ہاتھی دانت کے سے زردی مائل سفید چہرے پر سیاہ پلکوں کا سایہ اور جٹی بھویں کتنی بھلی لگ رہی تھیں۔ گمان جیسے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکان کا گمان ہو رہا تھا۔ وہ کچھ دیر کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ پھر پلنگ کے پاس پڑے اسٹول پر بیٹھ کر اس کا سبک نرم ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر سہلانے لگی۔

لکشمی نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں۔ چاروں طرف دیکھا پھر بند کر لیں۔ جیسے خواب سمجھ رہی ہو۔ ذرا دیر لی۔ گھبرا کر پھر آنکھیں کھول دیں۔ حیران حیران نظروں سے ہر طرف دیکھا، ہاتھ سے آنکھوں کو ملا۔ پھر نگاہیں آ کر اس پر ٹک گئیں ـــــ نگاہیں جن میں حیرانی، اجنبیت، درد، اور محبت کے رنگ یوں ملے جلے تھے جیسے آسمان پر قوس و قزح کے رنگوں کا امتزاج جن کو پہچانا جا سکتا ہے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

اور پھر لکشمی نے اپنی دونوں باہیں پھیلا دیں، دیا دی، اور وہ جھک کر اس کے گلے سے لپٹ گئی جیسے مدتوں بچھڑی بہنیں مل گئی ہوں اور ان دونوں کے بیچ ذات، پات، مذہب، نسل، ماحول، سماج، طبقے،

نیکی اور بدی کی جو دیواری کھڑی تھی وہ خود بخود مسمار ہو گئیں اور لکشمی کی بپتا سن کر وہ سناٹے میں رہ گئی۔ اس نے گناہ کے گڑھے میں گری بہت سی عورتوں کی کہانیاں سنی تھیں جن میں کچھ حماقت کا شکار تھیں، کچھ ہوس پرستی کی بھینٹ چڑھی تھیں، کچھ مفلسی کی ماری تھیں۔ کچھ کے رنگے سیار شوہروں نے انھیں روپیہ کمانے کی مشین بنا رکھا تھا۔ اور یہ سب سن سن کر وہ غصے سے لرز لرز اٹھی تھی۔ مگر لکشمی کی داستان نے تو اس کے دل و دماغ کو شل کر دیا۔ اف، دنیا میں ایسا بھی ہوتا ہے؟ باپ خود اپنی معصوم بیٹی کو یوں بھینٹ چڑھا دے۔

اس کا پاک دیس! تہذیب و تمدن کا یہ گہوارہ، روحانیت کا مامن، امنِ عالم کا علم بردار، ہزاروں سال کی سنسکرتی پر نازاں، اس کا یہ پیارا پرمقدس ——— اب بھی یہاں ایسی وحشت ناک رسمیں موجود ہیں؟ اب بھی رواج اور مذہب کے نام پر ایسے کھیل کھیلے جا سکتے ہیں؟ اس کا جی چاہتا تھا کسی بات کا یقین نہ کرے۔ مگر لکشمی مجسم اس کے سامنے تھی۔ وہ کیسے اپنے کو دھوکا دے؟

لکشمی کا ایک ایک لفظ اس کے دل پر نقش تھا۔

"دیدی کیوں پوچھتی ہو، کون ہوں؟ کہاں کی ہوں؟ بس یہی سمجھ لو کہ اس بمبئی کی کسی گندی نالی میں جنم ہوا ہوگا۔ یہاں ہی پل کر جوان ہوئی ہوں گی جہاں ہر روز ایک نئے مرد سے رشتہ جوڑتی ہوں۔ ہزاروں ان بدبخت بیسواؤں میں سے مجھے بھی سمجھ لو، جن کو بھانت بھانت کے مردوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ رنگ رنگ کے، طرح طرح کی زبانیں بولتے مردوے، وحشی، اجڈ، گنوار، جاہل مرد اور مہذب، تعلیم یافتہ، فیشن پرست مرد، خدا جانے کہاں کہاں کے مرد ——— دور دور دیسوں سے آئے غیر ملکی ——— سبھی آتے ہیں اور ہم جیسی بدبختوں سے دل

بہلا کر چلے جاتے ہیں۔ یوں سمجھو دیدی، ہم ایسی بنجر زمینیں ہیں جن پر کوئی
نرم دل کسان ہل چلا کر بیج نہیں ڈالتا، لہلہاتی کھیتی کی تمنا نہیں کرتا بلکہ ہوس
کے بنجارے، ظلم وستم کے پھاوڑے چلا کر ہمارے ذہن، جسم، دل اور دماغ
کو روند نے گذر جاتے ہیں اور مڑ کر نہیں دیکھتے ـــــ میں نہیں جانتی دیدی
یہ بد نصیب جان جو میری کوکھ میں پل رہی ہے۔ کب، کیسے، کہاں سے آئی ہے
یہ بد نصیب معصوم روح ـــــ جس کا کوئی باپ نہ ہوگا ـــــ کوئی گھر نہیں ہوگا۔
کوئی عزت نہیں ہوگی ـــــ آہ ـــــ جس کا اپنا کوئی دوش بھی نہ ہوگا۔"
پھر وہ تکیے میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ لیکن آج وہ
ارادہ کر کے آئی تھی کہ لکشمی کی کہانی سن کر اس کے دل کا بوجھ ذرا ہلکا کرکے
اور ہو سکا تو اس کی بہتری کی کوئی صورت نکال کر ہی واپس جائے گی۔ اور
آخر وہ کئی گھنٹے صرف کرنے کے بعد اس کوشش میں کامیاب ہوئی۔ اگرچہ
جب شام ڈھلے وہ واپس اپنے گھر کی طرف جارہی تھی تو اپنے دل کا
سکون لٹا چکی تھی۔ اس تیس سالہ کنواری شریف زادی کو اس دن یہ
محسوس ہوا تھا جیسے اس کی اپنی بیٹی اس کیچڑ میں ڈھکیل دی گئی ہو۔
بڑی کوشش کر کے میں نے اپنے ماضی کو بھلایا ہے۔ ان ناموں
کو ذہن سے کھرچا ہے جنھوں نے مجھے جنم دیا تھا۔ اس علاقے کو بھول
ہوں جہاں کی سوندھی پوتر مٹی میں گھروندے بنا کر بچپن بتایا تھا۔ دیدی
میں بھول جانا چاہتی ہوں کبھی میرا اپنا کوئی سندر گاؤں تھا جس کی سہانی رُت
میں، پیڑوں کی چھایا میں، میں نے سکھیوں کے ساتھ جھولے ڈالے تھے۔
میں ان پھولوں کی بو باس یاد کرنا نہیں چاہتی جن کو بالوں میں سجاتی تھی،
ان نادیوں کی جھنکار جن کے آئینے میں اپنے حسن کی بہار دیکھ کر لوٹ پوٹ
ہو جاتی تھی، ان پنچھیوں کے مدھر چہچہے اور للکار ہاں جن کو سن کر سپنوں
کے دلیس بساتی تھی ـــــ ہاں ہاں میں نہیں یاد کرنا چاہتی۔ اپنی پاپ بھرا

بڑی بہنوں کا لاڈ پیار، اس ابھاگن ماں کی ممتا جو مجھے سب سے زیادہ چاہنے کا ڈھونگ رچاتی تھی۔ اس پاپی باپ کے کندھے کی سواری جس سے مجھے اتنا پریم تھا اور جس کی بدولت آج اس حال کو پہنچی ہوں۔ اس ننھے منے بھائی کی موہنی صورت جس کے جنم لینے کی قیمت ایک کنواری، پوتر کنیا کی لاج سے چکائی گئی...... دیدی —— دیدی میں بھول گئی تھی اپنے لچھمن کی وہ پریم بھری نگاہیں، وہ شہد جیسے بول، وہ مضبوط و توانا جسم اور اس کی وہ ڈینگیں کہ وہ اپنی لچھمی کے لیے ساری دنیا کو چھوڑ سکتا ہے، ساری دنیا سے ٹکرلے سکتا ہے.... میں اپنے کو یہ یقین دلاتی رہی ہوں کہ وہ کوئی سپنا تھا، میرے تخیل نے کوئی افسانوی دنیا گھڑی تھی —— مگر ہائے، یہ پاپی من —— یہ تو کبھی نہ مانا —— اسی سورگ میں تمھاری بدنصیب لکشمی نے اپنا بچپن اور نوجوانی کا سندر دور گزارا تھا۔

"اپنے وطن کا نام نہ بتاؤں گی۔ سارے جہان کی رسوائیاں سہار کر بھی میں اس پیاری پوتر سرزمین کا نام بدنام نہیں کرنا چاہتی جہاں میں نے جنم لیا تھا۔ ہائے یہاں سے بہت دور، مہاساگر کے کنارے، کھجور اور تاڑ کے پیڑوں کی چھایا میں میرا سندر گاؤں اب بھی وہاں کی معصوم کنواریوں کا سورگ بنا ہوگا ——

"بڑا اونچا، بڑا پرانا پریوار تھا ہمارا —— چاند سورج سے ناتا جوڑنے والا، بڑی پرانی رسمیں اب بھی وہاں موجود تھیں۔ پھر بھی میرے باپ نے اپنی لڑکیوں کو دیسی زبان کے ساتھ ساتھ انگریزی پڑھوائی —— شاید اس لیے کہ بیاہ کے بازار میں اونچی قیمت لگ سکے۔

"ایک کے بعد ایک، ایک ایک دو دو سال کے وقفے سے ہم چھ بہنیں پیدا ہوئیں۔ میں سب سے چھوٹی تھی۔ میرا باپ ہر بار بیٹے کی آس لگاتا، تیاریاں کرتا، مرادیں مانگتا، اور ہر بار مایوس ہو کر

غصے سے پاگل ہو اٹھتا جس کا خمیازہ میری گئے جیسی بے زبان ماں کو بھگتنا پڑتا۔ بیٹیا جو لوک پر لوک ہیں اس کی نجات کرائے گا اسے نصیب نہ ہوا اور بیٹیاں جس کے لیے یہاں بھی نرک ہے اور شاید وہاں بھی نرک ہی نصیب ہو۔ ایک کے بعد ایک آتی چلی گئیں۔ وہ دعائیں اور دوائیں کرتا رہا مگر میرے بعد ماں کی کوکھ ہری نہ ہوئی۔

"اور آخر اس نے نیا بیاہ رچالیا۔ ساٹھ برس کے بڈھے کو دولت کے بل پر پندرہ برس کی کنیا مل گئی۔ اب تک وہ سب باتوں کے باوجود اپنی بیٹیوں کو بہت چاہتا تھا۔ مگر اب ——— اب نئی بیوی کے چاؤ چونچلوں اور بیٹے کی تمنا میں وہ سب کچھ بھول گیا۔ مگر کئی سال گزر گئے۔ نئی ماں کے کوئی بچہ نہ ہوا۔ باپ منتیں مرادیں اور زیادہ کرتا گیا۔ اور پھر ——— پھر......"

اس کی پھٹی پھٹی آنکھیں دیکھ کر وہ لرز اٹھی۔

"ایک بار یہ سب کہہ ڈالو لکشمی تو تمہارے دل کو سکون مل جائے گا۔"

"سکون؟ میرے دل کو سکون؟ پاپوں میں گلے گلے ڈوبی ہستی کو تو شاید تمہارا بھگوان بھی سکون نہ دے سکے۔"

دکھ بھری ہنسی کے ساتھ اس نے کہا اور خلا میں اس انداز سے تکنے لگی جیسے اسے کچھ نظر آیا ہو۔

"آخر نئی ماں کا پاؤں بھاری ہوا۔ باپ کی خوشی اور بدحواسی کی انتہا نہ تھی۔ کہیں اس بار بھی جنم جنم کی بیری، بیٹی نہ جنم لے اس فکر میں وہ گھلا جا رہا تھا ——— اور آخر اس نے کچھ ڈھونگی لوگوں کے سکھانے سے ایک بہت پرانی رسم کو تازہ کرنے کی منت مانی ——— بیٹے کے پیدا ہونے پر اپنی سب سے قیمتی، سب سے سندر، سب سے پیاری شے، بھگوان کو بھینٹ کرنے کی۔ سینکڑوں سال پہلے اس کے پرلوار

میں یہ رسم موجود تھی - پھر اب کیا حرج تھا اس کو کرنے میں بھلا؟ جانتی ہو وہ شے کیا تھی؟ ــــــ باپ کے بیٹا ہوا - ماں دن رات روتی، بہنیں گھرائی گھرائی نظر آتیں - مگر میں بہت خوش تھی - منا سا پیارا سا بھائی پیدا ہوا تھا! کیا جانتی تھی کہ یہ بھیا نہیں کالا ناگ ہے جو مجھے ڈسنے آیا ہے . . . .

" اور بھیا کے نام رکھنے کی شبھ گھڑی کے سمے باپ نے اپنی سب سے پیاری سب سے سندر بھینٹ چڑھا دی - وہ مجھے سب سے زیادہ چاہتا تھا تو پھر بھگوان کے چرنوں میں کوئی گھٹیا 'شے' کیسے بھینٹ کرتا؟ میں بدنصیب سب بہنوں میں سب سے سندر بھی تو تھی -

" سجا بنا کر ــــــ ہزاروں اینڈی بینڈی رسمیں کرنے کے بعد، حیران پریشان چودہ برس کی الھڑ، نادان چھوکری کو، ایک بدا نے کھنڈر کے راکھشش صورت کھوسٹ مرد کے سامنے لے جا کر مجھے بھینٹ کر دیا گیا -

" آہ دیدی ــــــ آج ــــــ اس حال کو پہنچ کر بھی - وہ شرم ناک اور بھیانک گھڑی نہیں بھول پائی ہوں ــــــ میں روئی، پیٹی، چیخی، چلائی، سب کو مارا کاٹا، اس راکھشش کو تو نیم جان ہی کر دیا - مگر کبھی سنا ہے تم نے کہ بھیڑیوں میں گھری ہرنی ان سے جیت پائی ہو -

" میرے باپ کو غیرت نہ آئی، میری ماں نے ڈوب کر کنواں گندہ نہ کیا، میرے منگیتر کا خون نہ کھولا، میری بہنوں نے شرم سے جان نہ دے دی، آسمان نہ پھٹا، زمین نہ دھنسی !

" پھر ایک دن میں وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی - اور جانے کہاں کہاں کی ٹھوکریں کھاتی، کیا کچھ سہتی یہاں تمہارے بمبئی پہنچی عزت کی روٹی - محنت کی کمائی ایسی جوان، ایسی حسین اور پھر ایسی بدبخت کے نصیب میں کہیں نہ تھی ــــــ مگر خوب جگہ ہے یہ تمہارا بمبئی بھی . . . . یہاں ہر چیز کا سودا ہوتا ہے، ہر شے کا بیوپار - یہاں عورت کی قیمت ایک دو روپے

اور تمہاری یہ ابھاگن لکشمی بھی لگتی ہے اور ہزاروں لاکھوں بھی ——— ہر قیمت پر بکی ——— اس کی لاج کے سودے کا لابھ ہمیشہ بیچ کے آدمی نے اٹھایا ہے۔ اس کے دکھ، شرم کا پہاڑ میں نے جھیلا ہے ——— پر آج سے پہلے کسی نے یہ نہ پوچھا تھا کہ تو کون ہے؟ کیوں کر یہاں آ پھنسی کیا تیرا کوئی مرتا جیتا نہیں جو یوں اپنا حسن، جوانی، اپنی صحت اور لاج بیچتی پھرتی ہے۔

"ہائے دیدی یہ سب مرد ایک سے ہوتے ہیں ——— لچھمن میرا عاشق، میرا منگیتر لچھمن، اس نے بھی تو مجھے ٹھکرا دیا جب میں اس نرک سے بھاگ کر نکلی تو سب سے پہلے اس کے پاس ہی تو گئی تھی۔ مگر وہ مجھے دیکھ کر ایسا گھبرایا، یوں بھاگا جیسے میں کوئی چھوت کی بیماری ہوں ——— دوسروں کے پاپوں کی سزا اس نے مجھے دی ——— اس کے ہم جنسوں کے کرتوتوں کا بدلہ خود اس نے مجھ سے لیا ——— دیدی ——— یہ ممتا ——— یہ پریم ——— یہ نیکی۔ بدی، ماں باپ سب جھوٹ ہے ——— جھوٹ ہے دیدی ——— جھوٹ ہے ———"

وہ سر جھٹک کر "جھوٹ ہے" کی گردان کرتی رہی ——— اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے، مٹھیاں بھنچ گئی تھیں۔ منھ سے جھاگ اڑ رہا تھا۔

اس نے لکشمی کو اپنے بازوؤں میں لے لیا اور زبردستی لٹا کر اس کا سر اپنے زانو پر رکھ کر اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ دھیرے دھیرے وہ سنبھلی اور پھر اس کے سینے میں منھ چھپا کر ننھے بچوں کی طرح سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔

اور وہ اسے تھپکے جا رہی تھی ——— "بس بس اب چپ

ہو جاؤ — شاباش۔ کیسی اچھی بچی ہے میری لچھی بیٹی — ہاں اب ہم اپنی لچھی کو نرس کی ٹریننگ دلوائیں گے — اور پھر بھئی وہ اسپتال میں کام کرے گی — مریضوں کی خدمت، دکھیوں کی سیوا میں وہ اپنا سارا دکھ درد بھول جائے گی — اور ہاں پھر منا آئے گا — اور وہ مزے سے اپنے بچے کے ساتھ رہا کرے گی۔ اور جب میں اس کے پاس جایا کروں گی تو خوب میری خاطر کیا کرے گی اور ہم تینوں مل کر خوب کھیلیں گے — خوب کھیلیں۔ خوب ہنسیں گے.... اور نہیں تو کیا...."

جانے کتنی دیر تک وہ اپنی گہری، مدھر، دھیمی آواز میں یہ لوری سناتی رہی — پھر جو جھک کے دیکھا تو لکشمی گہری میٹھی نیند کی آغوش میں تھی۔ شرم، دکھ، غم اور غصے کے سیاہ بادل چھٹ گئے تھے اور ننھے بچے کی سی معصومیت اور مسکراہٹ اس کے چہرے پر کھیل رہی تھی۔

وہ جھکی — ایک گہرا بھرپور بوسہ اس نے لکشمی کے ماتھے پر ثبت کیا تو اس کی آنکھوں سے کئی تارے ٹوٹے اور لکشمی کے چاند جیسے ماتھے پر پھسل پڑے۔

○

محرومی

آئی تو تھی وہ اپنے عزیز دوست کی آخری آرام گاہ پر آنسوؤں کا نذرانہ چڑھانے مگر حالت یہ تھی کہ آنکھیں خشک تھیں اور دل رو رہا تھا۔ زبان خاموش تھی اور دماغ میں خیالات کا طوفان برپا تھا۔ کیا ہے یہ قانون قدرت! دانہ پھوٹتا ہے بالی بن کر لہلہاتا ہے۔ ہزاروں لاکھوں زندگیوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ——— اور چورا چورا ہو کر زمین کی غذا بن جاتا ہے۔ کیوں؟

بیج ڈرتے ڈرتے زمین سے سر اٹھاتا ہے، سورج کی گرم روشنی ماہتاب کی خنک چاندنی کی گود میں، شبنم کا رس پی پی کر، نسیم کی گود میں جھول جھول کر پروان چڑھتا ہے اور ایک تناور درخت بن کر بھولے بھٹکوں کو اپنے سائے میں پناہ دیتا ہے، بھوکوں کو اپنے پھلوں سے سیر کرتا ہے اور ایک چوبِ خشک بن جاتا ہے، کیوں؟

کلی شاخ کے بطن میں پلتی ہے۔ پھر ننھی کونپل بن کر جھانکتی ہے، غنچہ بن کر مسکراتی ہے، پھول بن کر کھلکھلا پڑتی ہے اور پھر پتی پتی ہو کر بکھر جاتی ہے۔

اتنی ناپائیدار زندگی لے کر پیدا ہی کیوں ہوئی؟

اور انسان ——— اسی طرح اس کی زندگی بھی بنتی ہے، ابھرتی ہے، پھلتی پھولتی ہے، کمھلاتی ہے اور پھر خاک میں مل کر خاک ہو جاتی ہے ———

اور اس مشتِ خاک کی زندگی ـــــ کتنی بھرپور، کتنی مکمل، کتنی دلکش، کتنی حسین ہوتی ہے اور اس کی موت! آہ کتنی روح فرسا، کتنی دل شکن۔ کیا چیز ہے اس میں جو دوسروں میں نہیں؟ کیوں کائنات کی دوسری مخلوق کا خاتمہ ہمیں اس طرح نہیں تڑپاتا جس طرح اس کی جدائی؟ کیوں اے خالقِ کائنات! کیوں محبت کا یہ اتھاہ اور بے پایاں ساگر ـــــ غریب انسان کو تونے سونپا؟ کیا اس لیے کہ وہ عمر بھر درد جدائی کے صدمے جھیلتا فراق کے داغ اٹھاتا رہے؟

وہ جانے کب تک وہاں کھڑی رہی اور پھر جب دوسرے ساتھی جانے کے لیے مڑے تو وہ چپکے سے دوسری طرف کھسک آئی۔ اس کا جی یہاں سے جانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ جانے کیا چیز تھی جو اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کچھ بھول سی گئی ہے جیسے وہ یہاں کچھ ڈھونڈنے آئی تھی مگر پا نہیں رہی ہے.....

اسے یکایک سامنے ایک ننھی سی تازہ قبر نظر پڑی جس پر گلاب کے چند سرخ پھول کو کھ جلی ماں کے دل کے داغوں کی طرح جل رہے تھے۔ اس کے قدم جیسے زمین نے پکڑ لیے۔ درد کی ایک تیز لہر دھار دار چاقو کی طرح اس کے دل کو چیرتی ہوئی نکل گئی، دماغ میں ایک کوندا لپکا اور نظریں قبر پر جم گئیں۔ اسی کھوئی ہوئی دولت کا تو اس کا دل متلاشی تھا۔ آہ اس قبر کو دیکھنے کے لیے وہ آج تک زندہ تھی۔ پچیس برس۔ ہاں پچیس برس سے وہ اس قبر پر آنے کے لیے تڑپ رہی تھی..... آج چوتھائی صدی بعد اس کی زندگی کی سب سے بڑی تمنا پوری ہوئی تھی کہ وہ اپنے لختِ جگر کی آرام گاہ پر کچھ موتی نچھاور کر سکے۔ اس کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ وہ کھڑی نہ رہ سکی، پھسل کر مٹی کے اس تودے کے کنارے بیٹھ گئی۔ اس کی ویران نظریں ننھی تربت پر جمی ہوئی تھیں اور کانپتے دماغ میں خیالات کا طوفان، تڑپتے دل میں جذبات کا سیلاب جلتی آنکھوں میں آنسوؤں کے شعلے جمع ہو رہے تھے۔

"غوں ــــ غاں ــــ غیں!" بچہ اپنی بین الاقوامی زبان میں ماں سے باتیں کر رہا ہے ..... اور ماں اسی اندازِ معصومیت میں، اسی زبان میں، اسی لہجے میں جواب دے رہی ہے۔ دونوں کے چہروں پر ایک سا جذبہ، آنکھوں میں ایک سی چمک، ہونٹوں پر ایک سی مسکان ہے۔ یہ وہ زبان ہے جس کو صرف ماں اور بچہ سمجھتے ہیں۔ ہر ملک، ہر قوم، ہر ذات، ہر زمانے میں ایک ہی زبان رائج رہی ہے۔ ماں اور بچے کی محبت کی زبان ماں مامتا کی زبان اور وہ محبت سے بے چین ہو کر اپنی لاڈلی کے گلابی گلابی گال چوم چوم کر سرخ کر دیتی ہے یہاں تک کہ وہ عاجز آ کر گلا پھاڑنے لگتی ہے اور اسے چھاتی سے لگا لیتی ہے۔

"امی! امی! امی جان!" لپک کر اس نے پکارا اور گلاب کی ناشگفتہ کلی سا مسکراتا چہرہ اس کے سامنے تھا۔ "کہاں تھیں میری جان اتنی دیر سے؟" اس نے دونوں باہیں پھیلا دیں اور منی دوڑ کر آئی اور اپنے مٹی میں لت پت ہاتھ ماں کی گردن میں ڈال دیے اور تھوک و مٹی میں لتھڑا ہوا منھ ماں کے منھ پر رکھ دیا اور ماں کو اس نرم، گدگدے جسم کے لمس نے ایک انوکھی جنت میں پہنچا دیا ...... باہیں اور تنگ ہو گئیں۔ دو دلوں کی دھڑکن ایک ہو گئی۔ دو پھول سے چہرے اور زیادہ ایک دوسرے کے نزدیک آ گئے چار نازک پنکھڑیاں مل گئیں ــــ اور ماں کا عضو عضو مسرت سے ناچ اٹھا۔

"خالہ اماں! دیکھیے اس منی بچی نے میرے کاٹ کھایا۔" بھلجے نے آ کر بسورتے ہوئے کہا۔

"کیوں ری نالائق! بھائی کے کاٹتی ہے؟ ٹھہر تو جا۔" جھنجلا کر ماں نے منی کے دونوں ہاتھ زور سے ایک ہاتھ میں پکڑ لیے "کیوں اب بھی کرے گی ایسی حرکت بول!"

منی نے غصے بھری آنکھوں سے ماں کو دیکھا اور کوئی جواب نہ دیا۔
"اور اوپر سے گھورتی ہے بدتمیز!" اور ماں کا ایک بھرپور ہاتھ بچی کے گال پر پڑا جو سرخ گلاب کی طرح دہک اٹھا۔ کالی کالی آنکھوں میں ہیرے کی کنیاں تھرتھرائیں، گلابی ہونٹ لبسورنے میں باہر نکل آیا اور فضا میں احتجاجی آواز گونج اٹھی ......

ماں نے نظریں پھیر لیں۔ چند منٹ تک دل سخت کیے بیٹھی رہی مگر منی کی دبی سسکیاں، گرم گرم آنسو، سرخ گال دل اور آنکھوں میں آگ لگائے دے رہے تھے۔ "اف! ماں اتنی ظالم، ایسی کٹھور؟" وہ زیادہ دیر تک مامتا کی سرزنش نہ سہہ سکی، آہستہ سے اٹھی اور پیچھے سے بچی کو آغوش میں لے لیا۔ وہ مچلی "نہیں نہیں ——— جاؤ ہم تمھاری بیٹی نہیں ——— نہیں بولتے۔"

ماں بچی کے روٹھنے کا لطف اٹھاتی رہی اور بچی ماں کی مامتا کا ابال دیکھ دیکھ کر دل میں حیران ہوتی رہی۔ شاید یہ سوچ رہی ہو "ابھی یہ غصہ ابھی یہ محبت؟ ان بڑوں کو سمجھنا کتنا مشکل ہے۔" یہاں تک کہ منی نے اپنا آنسوؤں سے بھیگا چہرہ ماں کی چھاتی میں چھپالیا اور دونوں ماں بیٹی ایک ہی انداز سے آنسو بھری آنکھوں سے کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

"امی ——— امی پیاری کیسا جی ہے اب؟ منی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے اس کا دکھتا بدن دبانے لگی۔
اور جانے کون سی طاقت، کیسی بجلی تھی ان نرم نرم ہاتھوں میں کہ جیسے اس دکھ اور درد تھوڑی دیر کے لیے بالکل غائب ہو گیا ...... صرف یہ شیریں احساس باقی رہ گیا کہ اسے اپنی پیاری بچی کی محبت حاصل ہے اور اس نے مسکرا کر کہا "پریشان نہ ہو میری جان! میں اچھی ہوں۔" اور منی بہار کی صبح کے

تازہ پھول کی طرح مسکرا پڑی۔

"ہائے ماں ـــــ ہائے اماں ـــــ ہائے امی جی مری.......مری ......بہت درد ہے میرے، امی......" منی کی کراہیں اس کے دل میں میخوں کی طرح چبھ رہی تھیں۔ اگر وہ اپنی جان دے کر بھی اس کی تکلیف کم کر سکے تو سودا مہنگا نہیں...... کتنے دن اسے اس طرح تیمار داری کرتے گزر چکے ہیں۔ کتنی راتیں جاگتے بتا چکی ہے کتنے آنسو اس بارگاہِ حقیقی میں نذر کر چکی ہے اپنی بچی کی صحت کے لیے۔ بال بکھرے، کپڑے میلے، آنکھیں سوجی نہ کھانے کا ہوش نہ آرام کی خواہش......

مگر کتنی عجیب بات ہے، نہ اسے تکان ہے نہ بیزاری، نہ جھنجلاہٹ نہ الجھن۔ اتنی سخت محنت، اتنی فکر و پریشانی، بچی کی تکلیف کا اتنا شدید احساس اور پھر بھی ـــــ پھر بھی یہ انوکھی مسرت ـــــ یہ عجیب سا احساسِ طمانیت، یہ نرالا سا لطفِ زندگی کیا ہے؟ کیسا ہے؟ کیوں ہے؟ وہ کیا جانتی تھی کہ یہ پیاسی ممتا کی سیرابی کی مسرت۔ بچے کی ہر خدمت، ہر خوشی، ہر دکھ میں کام آنے کا لطف اور طمانیت ہے جو اس کے نہاں خانۂ دل کے خلا کو پورا کر رہا ہے۔

منی سالگرہ کی خوشی میں جھم جھماتے کپڑے پہنے، رنگین تتلی کی طرح ناچی ناچی پھر رہی ہے، کبھی ادھر کبھی اُدھر، کبھی اس سے تحفہ وصول کرتی ہے کبھی اس سے اور بار بار سالگرہ کی تیاریوں میں مصروف ماں کے گلے میں آکر جھول جاتی ہے۔ "امی شبو بھی آئے گی؟ اور ذکو بھی اور چھٹو بھی، گڈو بھی۔ امی! تم سب کو کھلونے دوگی؟ سب کو؟ اور وہ میرے لیے کیا لادیں گے امی؟...... امی چھوڑو سب کام۔ وہ جھم جھم کرتے کپڑے

"پہن لو میری امی پیاری ـــــ جو اس دن ماموں کے بیاہ کے دن پہنے تھے نا،
کیسی اچھی ہیں میری امی پیاری ـــــ ہیں نا ـــــ؟" وہ ماں کے گال پر
ایک اچٹتا سا پیار کر کے پھر اپنی سہیلیوں میں کھو جاتی ہے اور ماں کا دل
فخر و مسرت کے ساگر میں ڈولتا چھوڑ جاتی ہے ـــــ کتنی پیاری کتنی حسین
اور اس سے کتنی محبت کرنے والی بچی ہے اس کی!

عزیز اور دوست آ آ کر اسے مبارکباد دے رہے ہیں اور منی کو دعائیں
"تمہیں ایسی سینکڑوں سالگرہیں کرنی نصیب ہوں اس کی۔" اور خود اس کے
روئیں روئیں سے بھی بے آواز دعا بلند ہو رہی ہے۔ "میری بچی سلامت
رہے ہزار برس ـــــ ہزار برس ـــــ"

اس کا آخری وقت آ گیا ـــــ وہ سب سے اور اپنی منی سے جدا
ہو کر دور ـــــ بہت دور کسی انجانی دنیا میں جا رہی ہے ـــــ منی اس
کی پٹی سے لگی بیٹھی ہے۔ آنکھیں روتے روتے سوج گئی ہیں، چہرہ زرد،
بال بکھرے ـــــ بے قرار بدحواس اور مامتا بچی کو اس حال میں دیکھ کر
آخری وقت بھی تڑپ اٹھتی ہے ـــــ ہائے کیسے میری بچی میرے بغیر ـــــ
زندگی گزارے گی؟

"میری جان! صبر کر ـــــ خدا پر بھروسہ رکھ ـــــ ماں نہ ہو گی
پر اس کی دعائیں ـــــ ہمیشہ تیرے ساتھ رہیں گی ـــــ تیری..."

"امی ـــــ امی یہ نہ کہو امی ـــــ نہیں میں تمہارے بغیر زندہ نہ
رہوں گی ـــــ!" ایک چیخ کے ساتھ بچی کے منہ سے نکلتا ہے۔

"نہیں میری جان ـــــ ایسا نہیں کہتے ـــــ خدا تجھے رہتی دنیا
تک سلامت رکھے ـــــ ماں مرنے پر بھی نہیں مرتی میری بچی۔ اس کی محبت
زندہ رہتی ہے۔ اس کی روح اپنے بچوں کی نگہبانی کرتی ہے۔ وہ اپنے

بچوں کے دل میں زندہ رہتی ہے ـــــ ان کی سیرت میں ـــــ ان کی شخصیت میں باقی رہتی ہے۔"

منی روتے روتے بے ہوش ہو جاتی اور اس کی آنکھیں مُندنے لگتی ہیں.. ...... ہاتھ پاؤں کھنچنے لگتے ہیں۔ پر اس سمے بھی بچی کی محبت میں دو موٹے موٹے موتی بند آنکھوں سے لڑھک کر تکیے میں جذب ہو جاتے ہیں . . . . اور فضا میں ایک چیخ بلند ہوتی ہے۔

چیخ ـــــ کس کی چیخ ہے ـــــ یہ کون رو رہا ہے؟ اس نے مٹی کے تودے پر سے اپنے بھاری سر کو اٹھایا اور آنکھیں کھول کر چاروں طرف نظر ڈالی ـــــ آس پاس کوئی بھی نہ تھا ـــــ ہاں خود اس کی چیخوں کی گونج فضا میں ابھی تک باقی تھی ـــــ وہ کئی رات کی جاگی شاید سو گئی تھی. ننھی قبر پر اس کے آنسوؤں کا چھڑکاؤ سا ہو گیا تھا ـــــ سرخ پھول اپنی شادابی کھو کر کمہلا چلے تھے...... اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی کنپٹیوں کو تھام لیا تھا ـــــ کچھ نہیں ـــــ کچھ بھی تو نہیں ہے...... کچھ بھی تو نہ تھا

آہ..... اس کی پروازِ تخیل! ہائے یہ کرشمہ سازِ تصورات! اف یہ روح فرسا دھوکے!!! اس کی مامتا تو پیاسی تھی..... پیاسی ہے اور پیاسی رہے گی۔

منی نے تو پل بھر کے لیے دنیا میں آنکھیں کھولی تھیں، ہمیشہ کے لیے موندنے لینے کو ـــــ پچیس برس پہلے، اس کی بے تاب آنکھوں کی پیاس بجھانے سے قبل، اس کی بے قرار مامتا کو سیراب کیے بغیر ـــــ وہ اس سے روٹھ کر یہاں چلی آئی تھی۔ اس اجڑے بیابان کی مٹی سے کھیلنے کے لیے ـــــ کیا اس امید پر کہ اس کی ماں آئے گی اور اسے منالے جائے گی، وہ آج

تک روٹھی ہوئی ہے؟

اور ماں ___ اس پچیس برس میں ایک بار ___ ایک بار بھی تو اسے منانے نہ آئی۔

کتنی کٹھور ___ کتنی ظالم ماں تھی وہ ___ جس نے پچیس برس تک ادھر پلٹ کر نہ دیکھا ___ جس نے اس آرام گاہ پر دو پھول نہ چڑھائے۔ ___ چار آنسو نہ چھڑکے ___ وہ ننھی بے نشان قبر اس طویل مدت میں زبانِ حال سے کہہ رہی ہے

برمزارِ ما غریباں نے چراغے نے گلے
نے پرِ پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

اس کا روٹھنا بجا ہے ___ ایسی بے حس ماں ___ اور بھی ہوگی دنیا میں؟ ___ اس نے اپنے دل کو زور سے دونوں ہاتھوں سے بھینچ لیا۔ جیسے وہ کسی بچے کو سینے سے لپٹائے ہو...... اور بڑبڑانے لگی ___

"منی! تو کیا جانے ___ اس پچیس برس کی طویل شبِ فراق کی کوئی رات نہیں بیتی جب تیری ماں نے تیری بارگاہ میں موتی نہ نذر کیے ہوں۔ کوئی دن نہیں گزرا جب تیرے تصور نے دل میں لالے کے پھول نہ کھلائے ہوں ___ تو روٹھ گئی ___ پر تیری یاد اس کے دل کا انمول سرمایہ رہی۔ تیرا تصور تنہائی کا مونس، تیرا خیال مصیبت کا ساتھی، تیری خیالی محبت اس زخمی مامتا کی چارہ ساز رہی ہے ___ وہ روز تجھے تخیل میں دیکھتی رہی۔ ہنستے کھیلتے ___ پھلتے پھولتے ہوئے ___ دنیا میں عزت، شہرت، عیش ومحبت کے گہوارے میں جھولتے ہوئے ___ تیری اس یاد کو اس نے دوسرے بچوں کی محبت میں سمو دیا۔ ہر بچے میں اسے تیرا جلوہ نظر آیا۔ اسی لیے اس نے ہر ننھی معصوم کلی کو سینے سے لگایا ہے ___

میری جان ___ تو کیوں روٹھ گئی؟ ___ وہ تو روز تجھ سے ملتی ہے،

باتیں کرتی ہے اور پھر ــــــ پھر روز بچھڑ جاتی ہے۔"

وہ چونک پڑی۔

قبرستان میں ایک ہنگامہ سا برپا تھا۔ لوگ کسی نئے عادم کے مسافر کو اوّل منزل کرتے آرہے تھے ــــــ اس نے جھک کر اس ننھی قبر کی خاک پر بوسہ دیا ــــــ جو اس کے بچے کی نہ ہوتے ہوئے بھی اس کی قبر تھی۔ گلاب کی مرجھائی کلی کو اٹھا کر سینے سے لگایا اور دھیرے دھیرے گھر کی سمت روانہ ہوگئی

اور ٹیگور کی کبھی کی پڑھی ہوئی نظم کے کچھ ٹکڑے ایک ننھی سی سریلی آواز، اس کے دل میں گنگنا رہی تھی۔

" ماں تم اپنے بستر میں میری سرگوشیاں سنو گی۔ جب پتیوں پر بارش کے قطرے ٹپ ٹپ گرتے ہوں گے تو بجلی کی چمک کے ساتھ ساتھ کھلی کھڑکی میں سے تمہیں میری ہنسی کی کھنکناہٹ سنائی دے گی۔"

" ماں! جب تم رات گئے تک اپنی بچی کے بارے میں پڑی سوچتی اور جاگتی ہوگی تو میں ستاروں کی بلندیوں سے تمہیں لوری سناؤں گی۔ "سو جا ماں! سو جا۔" اور جب سو جاؤ گی تو چاند کی کرنوں پر سوار ہو کر آؤں گی اور چپکے سے تمہارے بستر میں گھس کر سینے پر لوٹ جاؤں گی۔"

" ماں! میں ایک سپنا بن کر تمہاری نیم وا آنکھوں میں گھس کر تمہاری نیند کی گہرائیوں میں گھل جاؤں گی ــــــ پر جب تم جاگنے پر گھبرا کر مجھے اِدھر اُدھر ڈھونڈو گی تو ــــــ تو میں جگنو کی طرح تاریکی میں غائب ہو جاؤں گی۔"

" ماں! جب تہوار پر بچے آکر گھر کے آس پاس کھیلیں گے تو میں بانسری کی سریلی تان بن کر دن بھر تمہارے دل میں دھڑکتی رہوں گی اور ماں جب تہوار پر خالہ پیاری تحفے لے کر آئیں گی اور پوچھیں گی،

بہن! ہماری منی کہاں ہے؟ ___ تو ماں تم نرمی سے ان سے کہنا:

وہ میری آنکھوں کی پتلیوں میں ہے۔ وہ میرے جسم و جان میں ہے۔ وہ میری روح میں ہے۔"

اور اس رات ماں نے پہلی بار ___ پچیس برس بعد ___ اپنی منی کو خواب میں دیکھا جو ویسی ہی سریلی، شیریں، پیار بھری آواز میں جو اس نے تخیل میں سنی تھی اس سے کہہ رہی تھی ___

"ماں! میں تیری روح میں ہوں، جان میں ہوں، تیری آنکھوں کی پتلیوں میں ___ تیرے دل کے درد میں ___ تیری اس محبت کی تہہ میں جو تو ہر بچے سے کرتی ہے ___ اس پیار میں جو تجھے انسان سے ہے۔ تو کیوں روتی ہے ماں ___ میں تو کائنات کے ہر ذرے میں ہوں۔"

صبح وہ جاگی تو اس کے دل کا خلا بھر چکا تھا اور ایک روحانی مسرت اور طمانیت اس کے وجود پر چھائی ہوئی تھی۔

●

ڈائن

اسٹریچر ایک جھٹکے سے آگے بڑھا، نرس نے ساتھ آنے والوں
کو اشارے سے منع کیا، کچھ رک گئے، کچھ ڈرتے ڈرتے ساتھ چلتے
رہے ـــــ سمیع جس کا چہرہ سفید، آنکھیں سوجی اور بال بکھرے سے،
اسٹریچر سے جیسے بندھا چلا جارہا تھا ـــــ امید کی ایک ذرا سی کرن
ابھی تک باپ کے دل میں روشن تھی۔ شاید "پروین بچ جائے ـــــ شاید بچ
جائے۔" دادی کے چہرے کی جھریاں اور گہری ہوگئی تھیں، آنکھوں کی
بینائی اور کم ہوگئی تھی اور ہاتھ کی تسبیح کی گردش کچھ اور زیادہ تیز اور
آنکھوں سے تسبیح کے دانوں سے بھی زیادہ موٹے موٹے آنسو سفید
ململ کے دوپٹے میں جذب ہوجاتے۔ ان کی بے قراری سے مانگی دعائیں آس
پاس والوں کا کلیجہ ہلائے دے رہی تھیں ـــــ ڈاکٹر تک متاثر تھے ـــــ
بس نرسوں کے چہرے حسبِ دستور بے حس، اور ہونٹ مصنوعی مسکراہٹ
سے آراستہ ضرور تھے! اور اب دو دن اور رات موت اور زیست کی
کی کشمکش کے بعد، ایک آخری کوشش پروین کو بچانے کی ڈاکٹر کرنے
والے تھے ـــــ باپ سے یہ لکھوا کر کہ اس کی موت کی ذمے داری ان پر نہ ہوگی۔
آپریشن ـــــ بے حد نازک آپریشن ـــــ مگر امید کا یہ ننھا سا تارا باپ

اور دادی کو باندھے ہوئے تھے ـــــ کیا خبران کی دو سالہ چہکتی مینا بچ ہی جائے!

اور انوری؟ بے حس و حرکت ایک کونے میں بیٹھی یہ نیم دیوانی سی عورت؟ کیا وہ گوشت پوست کی بنی انسان ہے یا پتھر کی مورتی؟ اسے دیکھ کر ہر ایک کے دل میں یہ سوال پیدا ہو رہا تھا۔ اس کونے سے اٹھانے کی ہر شخص اسے کوشش کر چکا تھا، بھائی، بہن، ساس، میاں، نندوئی، ماں اور وہ سوتیلا باپ جس کی صورت دیکھ کر اسے جنون چڑھتا تھا اور جانے کون اور کون ـــــ مگر انوری کی پتھریلی آنکھوں میں کوئی جذبہ پیدا نہ ہوتا ـــــ ہاں چہرے پر ایک خونخوار شیرنی کا سا غصہ ضرور پل بھر کو آتا اور لوگ گھبرا کر پیچھے ہٹ جاتے ـــــ پاگل عورت! ڈائن ـــــ جوانی ہی بیٹی کو کھا گئی اس کا کیا ٹھیک ہے بھلا! کتنی زبانوں نے زیر لب یہ جملہ کہا تھا، کتنی آنکھوں میں یہ جملہ ناچ رہا تھا، کتنے چہروں پر یہ جملہ جلی حرفوں پر لکھا ہوا تھا " ماں ہے یا ڈائن ـــــ ماں ہے یا ڈائن ـــــ ماں ہے یا ـــــ "

بس سمیع اور اس کی ماں ـــــ دو انسان، دو چہرے ایسے تھے جن پر صرف دکھ اور غم کا گہرا بادل تھا... کبھی کبھی سمیع کے ہونٹ ہلتے اور بے آواز یہ جملہ سب دہراتے " ہائے بدنصیب ـــــ ہائے بخت" اور پھر آنکھیں برسنے لگتیں، انوری کی ساس تو پوتی پر جان ہی دیتی تھیں دونوں سے ان کی جان پر بنی ہوئی تھی... لیکن بہو کو انھوں نے کچھ بھی تو نہ کہا تھا ـــــ نہ تیز نظر سے دیکھا تھا ـــــ وہ تو لگتا تھا۔ دعا مانگنے کے سوا ہر قوت، ہر حس سے بے گانہ ہو چکی ہیں...

جیسے ہی اسٹریچر آگے بڑھا انوری کے شل ہاتھ پاؤں میں ایک دم سے گرمی اور حرکت پیدا ہو گئی.... لڑکھڑاتی ہوئی وہ کھڑی

ہوئی۔ چاروں طرف حیران حیران نظروں سے دیکھا پروین کے خالی بڈ پر نظر پڑی تو آنکھوں میں آگ سی دہکی اور وہ تیزی سے کمرے سے نکل کر برآمدے سے بھاگتی اسٹریچر کے پاس پہنچ گئی ——— پیچھے سے ایک نرس نے اس کے کندھے پر اپنا مضبوط ہاتھ رکھا "آہستہ ——— آہستہ ——— بچی کو چھونا نہیں ———" انوری ٹھٹکی ——— دونوں ہاتھوں کو بلند کر کے چہرے کے سامنے لائی اور پھر گھبرا کر اپنے دوپٹے سے ہاتھ پونچھنے لگی .... پھر نظریں آپریشن تھیٹر کی طرف جاتے ہوئے اسٹریچر کا تعاقب کرنے لگیں .... ننھی پروین کا سارا جسم سفید چادر سے ڈھکا ہوا تھا ——— پھول سا چہرہ جو اب بالکل زرد ہو چکا تھا کھلا تھا ——— آنکھیں بند، دو ہونٹ ادھ کھلے، ناک میں آکسیجن اور بازو میں گلوکوز لگا ہوا ——— ننھی جا رہی ہے ——— جا رہی ہے ——— اب ——— اب وہ کبھی نہ آئے گی۔ وہ اب اپنی بچی کو کبھی نہ دیکھے گی ———" اس کے سُن دماغ نے جو دو دن سے کچھ بھی نہ سوچ سکا تھا تیزی سے کام کرنا شروع کر دیا تھا......

آپریشن تھیٹر کا بڑا دروازہ کھلا، اندر سفید لباس میں ملبوس منہ پر سفید ماسک چڑھائے کئی ہیولے نظر پڑے ——— "یم دوت۔ فرشتۂ موت" کسی نے اس کے کان میں کہا...... "نہیں نہیں" وہ چیخی مگر تھیٹر کا دروازہ بند ہو چکا تھا۔ ایک پل کے لیے ایسا لگا جیسے انوری اپنی بچی کو یم دوت سے چھین لینے کے لیے دروازہ پر حملہ کرنے والی ہے۔ اس کی آنکھوں میں وہ خونخواری تھی جو اس شیرنی کے ہوتی ہے جس کا بچہ شکاری چھین لے گیا ہو ——— اور پھر ——— پھر جیسے ساری قوت جواب دے گئی! دھم سے وہ گری اور اس کی پیٹھ تھیٹر کے دروازے پر ٹک گئی!

"اب کیا کبھی میں پروہ کو نہ دیکھوں گی؟ وہ روٹھ گئی؟ نہیں منے گی؟ ٹھیک ہی تو روٹھی ہے ـــــ میں نے کبھی اسے ماں کا پیار نہیں دیا ـــــ پیٹ بھر دودھ نہیں پلایا، محبت سے چوما نہیں ـــــ میٹھا بول نہیں بولا۔ اس کے توتلے پیارے پیارے بولوں پر ہنسی ان منحوس ہونٹوں پر نہیں آئی ـــــ سینے میں مامتا کا دیا نہیں جلا ـــــ ہر کسی کا غصہ اس پر اترتا، ہر کسی سے لڑنے کے بعد میں اس کو مارتی ـــــ دورے کے بعد اس کو جھڑکتی ـــــ خالہ اماں اور ان کا بدلہ اس سے لیتی ـــــ کیوں؟ کیوں؟ اس معصوم کا کیا قصور تھا ـــــ خدایا میں ماں نہیں ہوں کیا؟ میں ڈائن ہوں۔ ڈائن ہوں ـــــ اسے کھا گئی ـــــ ڈائن ـــــ ڈائن ـــــ آخری لفظ ایک بھیانک چیخ کے ساتھ اس کے منھ سے نکلے۔ دم گھونٹنے والے سناٹے میں ارتعاش سا پیدا ہوا ـــــ سمیع نے جو اس کے پیچھے کھڑا تھا اپنا ہاتھ اس کی پیٹھ پر رکھ دیا اور آہستہ آہستہ جیسے بے ارادے ہی اس کے منھ سے نکلا ـــــ "انوری ـــــ میری انوری۔ حوصلہ ـــــ ہمت ـــــ خدا ہمیں ہماری بچی واپس دے دے گا۔۔۔۔"

اور کئی آنسو انوری کے الجھے بالوں میں گم ہو گئے، انوری کی ساس نے اپنی تسبیح بہو کے سر پر رکھ دی اور یاغفورو یارحیم دیا کریم کا ورد اور زیادہ شدت سے کرنے لگیں! دوسرے عزیز رشتے دار اور پڑوسی چپکے چپکے کھانے پینے یا آرام کرنے کے لیے کھسک چکے تھے ـــــ جانے یہ آپریشن کب تک چلے ـــــ اور پھر اس کا نتیجہ تو ظاہر ہی ہے ـــــ کوئی کہاں تک ان لوگوں کی طرح بھوکا پیاسا رہ سکتا ہے بھلا؟

بھڑکتے دماغ، تپکتے ذہن اور سلگتے دل کو ایسا محسوس ہوا جیسے ٹھنڈے پانی کا پھایا زخم پر رکھ دیا گیا ہو۔ اس نے میاں اور ساس کے درد بھرے چہروں پر جیسے پہلی بار نظر ڈالی! آہ! یہ اس کی وجہ سے

پھر آنکھیں خود بخود جھک گئیں ـــــ بند ہو گئیں ـــــ سر دروازے سے جا ٹکا
میاں نے اس کے گرتے جسم کو سہارا دیا اور اس کا سر اپنے شانے سے لگا لیا۔
درد و دکھ کی یہ وہ منزل تھی جو بزرگوں کا خیال، ماں کا ادب، "آئے گئے" کی
شرم، سمیع جیسے جھینپو انسان کو بھی بے خبر کر دیتی ہے! النوری سو گئی ہے
شاید اسی طرح اس کو سکون مل جائے۔

مگر وہ سو نہ رہی تھی بے ہوش بھی نہ تھی۔ ہوش میں بھی نہ تھی جسم بے حس
تھا مگر دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا ـــــ مگر اس وقت اس کی سوچ کا
رخ نہ مال کی طرف تھا نہ مستقبل کا بھیانک روپ نظروں یا ذہن میں گھوم
رہا تھا بلکہ ماضی کی پرچھائیاں اس کے چاروں طرف رقص کر رہی تھیں ـــــ
زندگی کی پہلی یاد ـــــ کتنی کرب ناک تھی جس نے کبھی اس کا پیچھا نہیں
چھوڑا...... ماں نے اس کے منھ سے دودھ چھین کر اسے پلنگ پر
پٹخ دیا ہے... وہ روتی چلاتی، گھسٹتی ماں کے پیچھے پیچھے جاتی ہے تو
اس کا باپ سیدھا سیدھا لیٹا ہے اور اس کے سر سے لال رنگ بہہ رہا ہے
اور کتنے لوگ رو رہے ہیں، چیخ رہے ہیں ـــــ اس کی گھگھی بندھ جاتی ہے،
کانپنے لگتی ہے.... پھر اسے کوئی گود میں اٹھا کر اپنے سینے سے لپٹا لیتا
ہے اور وہ بے خبر ہو جاتی ہے ـــــ یہ تو اسے برسوں بعد جا کر پتا چلا
تھا کہ اس کے باپ کا ایکسی ڈنٹ ہو گیا تھا اور اسے چھاتی سے لگانے والی
اس کی خالہ اماں تھیں جن کی بچوں سے محبت خاندان بھر میں مشہور تھی....

النوری کے سخت چہرے پر ایک پل کے لیے ذرا سی نرمی آئی ـــــ
ایسا لگا مسکرا پڑے گی ـــــ مگر ہونٹ بھر بھنچ گئے.......

اس کے بعد کی تصویریں بہت گڈمڈ سی، مدھم مدھم سی تھیں...
ایک دو لفظ البتہ اسی کے کانوں میں ہر وقت بڑے صاف سنائی دیا کرتے
تھے ـــــ ڈائن، منحوس باپ کو کھا گئی... ماں کی مار پیٹ، لعن طعن،

خالہ کی شفقت اور دلداری دونوں یادیں ایک دوسرے سے الجھی ہوئی تھیں۔ ماں کا لال لال کپڑے پہن کر کسی اور گھر جانا ـــــ اس کو ریشمی کپڑے پہننے کو ملنا ـــــ ماں کے پلو سے بندھے بندھے گاڑی میں بیٹھنا اور اس کے ساتھ اترنا ـــــ بہت سی عورتیں، ڈھول، ہنگامہ ـــــ ایک اجنبی مرد کا اسے گود میں اٹھا کر پیار کرنا ـــــ ہائے یہ بال سارے اس کے گالوں میں چبھ رہے ہیں ـــــ وہ چیخ پڑتی ہے .... مرد ہنستا ہے ..... ماں کہتی ہے ـــــ اِسے چھوڑ دو یہ تو جنگلی بلی ہے... وہ اور زور سے ہنستا ہے ـــــ خوفناک ہنسی، خوفناک چہرہ وہ لرز کر روتی ہے اور ماں سے لپٹ جاتی ہے! سوتے سے اس کی آنکھ کھلتی ہے تو وہی مرد اسے ماں کے پہلو سے نوچ کر کہیں لے جا رہا ہے۔" ماں ماں ماں" مگر اس کی چیخیں بے کار ہیں وہ ایک مضبوط گرفت میں ہے۔ اس کے دانت آپ ہی آپ مرد کے بازو میں گڑ جاتے ہیں ـــــ ایک زور کا تھپڑ اس کے گال پر پڑتا ہے اور پھر ـــــ پھر اسے کچھ خبر نہیں رہتی ....

انوری کی مٹھیاں بھینچ گئی تھیں، بند آنکھوں کے گرد کے حلقے اور گہرے ہو گئے تھے، ماتھے کی شکنیں اور چہرے کی سختی اور بڑھ گئی تھی..... سمیع گھبرا رہا تھا ـــــ اسے ہسٹیریا کا دورہ نہ پڑ جائے ـــــ یہاں ـــــ آپریشن تھیٹر کے باہر.....

پرچھائیاں اب زندہ انسانوں میں بدلتی جا رہی تھیں، دھند چھٹنے لگی تھی - ماں ہر وقت اس پر ڈانٹ پھٹکار کرتی، کبھی کبھی مارتی بھی سوتیلے باپ کو اس سے پہلے دن سے جو نفرت بیٹھی تو کبھی نہ گئی - اس کے چھوٹے چھوٹے بھائی بہن پر ماں اور باپ محبت کی برکھا کرتے، وہ ماں کے سینے سے لگ کر سوتے، باپ کے کندھوں پر اچھلتے، گلے میں لٹکتے

اور وہ گھر سے ... پلنگ پر لیٹی آنسو بہاتی، جلتی کڑھتی .... بہن بھائی اسکول جاتے اور وہ ان کی کتابوں کو حسرت سے دیکھتی ـــــــ ہاتھ لگاتی تو مار پڑتی ـــــــ وہ اچھے سے اچھا پہنتے اور کھاتے اور یہ پرانے کپڑوں اور بچے کھچے کھانے پر زندہ رہنے پر مجبور تھی اور دن رات گھر بھر کی خدمت کرتی رہتی تھی۔ محبت کے ایک بول، تعریف کے ایک جملے، ہمدردی کی ایک نظر اس پر کوئی نہ ڈالتا۔ ہر ایک اسے بدزبان، بدتمیز، پھوہڑ لڑاکو کہتا .... اور آج ـــــــ آج پہلی بار اسے احساس ہوا کہ سچ مچ وہ بہت بدتمیز و بدزبان بن گئی تھی .... اور پھر جانے کیسے اسے دورے پڑنے لگے ـــــــ ہسٹیریا کے دورے ـــــــ اور اَن جانے ہیں جیسے ذہن نے یہ بات اسے سجھادی کہ جب وہ چیختی اور بدتمیزی کرتی ہے۔ جب اسے دورہ پڑتا ہے تو ماں ہی نہیں باپ بھی ڈر جاتا ہے .... محبت تو اسے نہیں ملی مگر اس کی زخمی انا کو کچھ تسکین تو مل ہی جاتی تھی.. وہ بال نوچتی، کپڑے پھاڑ دیتی ـــــــ لوگوں کو مارنے دوڑتی۔ کسی نے کہا اوپری اثر ہے، کسی نے کہا جن کا سایہ ہے۔ کسی نے کہا شادی کر دو۔ کبھی ماں کا تھپڑ اسے ہوش میں لاتا، کبھی باپ کی بھیانک ڈانٹ۔ وہ اندر ہی اندر سلگ رہی تھی ـــــــ بھٹک رہی تھی مگر کوئی اس کے زخم پہ پھاہا رکھنے والا نہ تھا ـــــــ

اور ـــــــ پھر ایک اور تصویر دماغ کے نہاں خانے سے نکل کر سامنے آ گئی .... خالہ اماں کی جو کبھی کبھار ہی اس کی ماں کے ہاں آتی تھیں ـــــــ مگر ان کے آتے ہی ماں سہم کر اپنا رویہ بدلتی، باپ بے تعلقی کا اظہار کرتا ـــــــ ایسے میں دورہ پڑتا تو خالہ اماں کی آغوش میں اسے ہوش آتا اور وہ ان سے لپٹ کر دکھ کے، پشیمانی کے، غم کے، محبت کے آنسو بہا کر کتنا سکون پا جاتی تھی ذرا دیر کو، پھر جب خالہ چلی جاتیں

تو زندگی ویسی ہی ہو جاتی۔ بنجر، ویران۔ دوزخ۔ ڈاکٹر ٹھیک کہتے اس کا بیاہ کر دو — مگر ایسی بدمزاج، لڑاکا، اور بددماغ لڑکی کون سمیٹتا —
صورت لاکھ پیاری سہی مگر بہو کے تو گن، دیکھے جاتے ہیں روپ نہیں۔
انوری نے آنکھیں کھولیں اور سمیع کے چہرے پر گاڑ دیں — وہ اس کو سہارا دیے پریشان نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا — دوسری طرف خالہ اماں آنسو بھری آنکھیں آسمان کی طرف اٹھائے دعائیں مصروف تھیں۔ ... پل بھر وہ انھیں دیکھتی رہی اور پھر آنکھیں بند ہو گئیں ...

آہ! وہ پہلی حسین و دلکش یاد — پہلی خوش رنگ، خوشنما تصویر۔
خالہ اماں نے اپنی بدنصیب بھانجی کو بہو بنا لینے کا فیصلہ کیا تو ہر کوئی حیران رہ گیا — جب وجیہہ و حسین سمیع نے سر پر پھولوں کا سہرا ڈالے، گلابی کپڑوں میں جگمگاتی اس حسین گٹھری کو گود میں اٹھا کر موٹر میں بٹھا دیا تھا — خالہ اماں بہو پر واری نثار جا رہی تھیں ......
سسرال کے گھر میں آؤ بھگت، تحفے تحائف، زیور کپڑے اتنے ملے کہ ساری محرومیاں جیسے کھو گئیں بھول گئیں! سمیع نے دیکھا اس کے ہونٹوں پر ایک شرمیلی، میٹھی، پیار بھری مسکراہٹ کھل اٹھی ہے۔
وہ مسکراہٹ جو شادی کے چند مہینوں کے لیے۔ پھر اسے دیکھنی نصیب نہ ہوئی تھی!

کون کہتا ہے کہ دکھ بھول جاتے ہیں؟ محرومیوں کے زخم بھر جاتے ہیں — جانے یہ سانپ کہاں جا کر چھپ گئے تھے — پھر کیسے انھوں نے پھن اٹھایا اور اسے ڈس لیا — کس نے یہ زہر بھر دیا اس کے دماغ کہ خالہ اماں، ماں ہی کی بہن ہیں .... اور پھر ان کی ہر بات کو وہ اسی رنگ میں دیکھنے لگی — وہ اسے روک ٹوک کیوں کرتی ہیں؟ — کیوں سکھاتی ہیں؟ سمیع پیسہ ماں کے ہاتھ میں کیوں دیتا ہے .... ماں کا

اکلوتا بیٹا تھا وہ اس پہ قربان تھیں اور بیٹا بھی ماں کو بے حد چاہتا تھا ——— وہ تو نتھا ہی سیدھا سادا شریف مرد جس کی زندگی کا محور گھر ہوتا ہے۔ محبت کا مرکز ماں ہوتی ہے، بیوی ہوتی ہے، بچے ہوتے ہیں!

پھر اس کا مزاج بدلنے لگا ——— غصہ، بدمزاجی، دورے! میاں تو سہم گیا مگر ساس بگڑیں "اے لڑکی ہوش میں رہنا یہاں۔ یہ چالیں میں نہیں سہوں گی ... یہ شریف بہو بیٹیوں کے وطیرے نہیں ہوتے ——— میرے گھر میں کوئی جن یا سایہ نہیں ہو سکتا ——— اس گھر میں کلام الٰہی پڑھا جاتا ہے ..... انوری کو پھر جانے کیا ہوا کہ دورہ تو نہ پڑا ——— مگر ساس کے دل میں جو گرہ پڑ گئی تھی اس میں کمی اور گرہوں کا اضافہ ہو گیا .....

پھر .... پروین پیدا ہوئی ——— میاں اور ساس نے تو جیسے اسے پان اور پھول کی طرح پھیرا! مزاج میں کچھ نرمی آئی۔ محبت پر پھر کچھ اعتماد پیدا ہوا ——— اور جب موت اور زیست کی کشمکش کے بعد اس نے اپنی بچی کا پیارا پیارا مکھڑا دیکھا تو لگا سارے دکھ اور غم دور ہو گئے .... مگر یہ جانے کب اور کیسے اور کیوں ہو گیا؟ کیا بچی سے سمیع کی والہانہ الفت نے اسے ٹھیس پہنچائی تھی؟ کیا خالہ اماں کی روک ٹوک اور پوتی کے عشق کی وجہ سے وہ بچی سے جلنے لگی تھی یا اس کی ضد میں اور غصہ اسے اپنا بچپن اور بچپن کے دکھ یاد دلا دیتی تھیں ——— یہ سب سوچا کس نے تھا ——— بس وہ تو اس سے چڑنے لگی ——— وہ روتی تو یہ چمکارنے کی جگہ اسے مارتی، وہ گلے میں باہیں ڈالتی تو یہ جھٹک دیتی اور سمیع ایک بچی کو اپنی آغوش میں سمیٹ لیتا تو اور سلگ اٹھتی ——— ساس سے جھگڑا ہوتا تو ان کو جلانے کو بچی کو خوب کوسنے دیتی .... "تو مر کیوں نہیں جاتی" یہ تو تکیہ کلام بن گیا تھا کہ ساس اس جملے سے تڑپ اٹھتی تھیں .... وہ ڈرنے والی نہ تھیں ——— مگر میاں سہما سہما الگ الگ رہنے لگا .... اور اس کا غصہ اور جنون بڑھتا

میرا کوئی نہیں ـــــ کوئی نہیں .... نہ ماں نہ خالہ ــــ نہ میاں اور نہ اب یہ بچی ــــ یہ بھی دشمنوں ہی کی لاڈلی ہے!

اور ایک دن ــــ پرسوں ــــ کچھ ایسے ہی ہنگامے کے بعد وہ غصے میں بیٹھی کھول رہی تھی اور جلتے جلتے آنسو آنکھوں سے بہہ رہے تھے .... کہ پروین اس کے پاس آئی "امی جی ـ روتی ـــ روتی ہو ــــ" اور اس کی نظر کے سامنے وہ سین پھر گیا جب ماں نے اسے جھٹک کر پھینک دیا تھا جب باپ نے اسے تھپڑ مارا تھا ــــ تو ــــ یہ بد نصیب بھی میری طرح عمر بھر روئے گی ــــ "تو پیدا کیوں ہوئی کمبخت۔ مرتی کیوں نہیں ....." بچی کچھ بھی نہ سمجھی دونوں ہاتھ پھیلائے ماں کی طرف بڑھی ۔ ماں نے دھکا دے دیا ــــ بچی تخت کے نیچے گر پڑی ....

اف خدایا ــــ خدایا ــــ خدا !

اس کے جسم پر زلزلہ سا طاری ہو گیا تھا .... پروین کا خون بھرا چہرہ ساس کی بھیانک چیخیں، میاں کی بدحواسی، محلے والوں کا ہجوم ... "ماں ہے یا ڈائن ــــ ماں ہے یا ڈائن کی آوازیں .... اسپتال کا آنا ــــ ڈاکٹروں کی دوڑ دھوپ .... نرسوں کی بھاگ دوڑ ــــ میاں کا زرد چہرہ، ساس کی کرب ناک آہیں .... اور اب ــــ اب بچی کا آپریشن .... "وہ مر گئی ـ وہ مر گئی ــــ میں ڈائن ہوں ــــ ڈائن ــــ اپنی بچی کو کھا گئی ــــ"

اس کے منہ سے پھین نکل رہا تھا، ہاتھ پیر اینٹھ گئے تھے اور سر دیوار میں مار مار کر لہو لہان کر لیا تھا۔ سمیع سے سنبھالے نہیں سنبھل رہی تھی ــــ وہ کھسیانی، روہانسی آواز میں اسے پکارے جا رہا تھا "انوری ــــ انوری ــــ انو ــــ ہوش میں آؤ ــــ پروین زندہ ہے ــــ وہ اچھی ہو جائے گی ــــ سنبھلو انوری یہ اسپتال ہے ــــ" خالہ اماں دھیرے دھیرے چلتی اس کے پاس آئیں اور زخمی سر کو کھینچ کر اپنے بوڑھے سینے پر ٹکا لیا۔

میری بچی ــــــ میری انو ــــــ دعا کر ــــــ دعا ــــــ اس رحیم کریم سے جو ہم سب کو بخشش دیتا ہے ــــــ دعا کر تیری مامتا ٹھنڈی رہے ۔ تیری بچی سلامت رہے ــــــ میری بیٹی ــــــ سنبھل جا ــــــ" یہ کس کی آواز ہے ــــــ یہ مامتا کی کیسی ٹھنڈی چھایا ہے ــــــ! انوری ایک دم شانت ہوگئی ...... تین دن میں پہلی بار اس کی آنکھیں بھیگ گئیں اور شاید زندگی میں پہلی بار یہ آنسو محبت کے آنسو تھے ......" ماں مجھے دعا دو ماں ــــــ پرو نیچ جائے ــــــ" وہ خالہ کے پیروں سے لپٹ کر بلک پڑی ۔

اسی وقت آپریشن تھیٹر کا دروازہ کھلا، ایک نرس تیزی سے خون بھرے کپڑے اٹھائے پاس سے گزر گئی ــــــ انوری کا سارا جسم سن ہوگیا۔ بڑا ڈاکٹر ماتھے سے پسینے کے قطرے صاف کرتا ہوا ان کے پاس آکر کھڑا ہوگیا۔ اس کے چہرے پر بڑی ہی دل نشیں مسکراہٹ تھی!

" مبارک ہو ماں جی! آپریشن کامیاب ہوا ــــــ آپ کی بچی بچ جائے گی۔" اس نے کہا ...... اور تین سر ایک دم زمین پر جھک گئے ۔

۵

سوتیلی

دو دن دو رات انھیں بیٹھے گزر گئے تھے۔ کھانا سامنے آتا اور ویسے ہی اٹھا لیا جاتا، نماز کا وقت آتا اور نکل جاتا ... آنکھوں میں نیند بھرتی اور بھاگ جاتی!

جس نے عمر بھر خدمت اور تیمار داری کی تھی ... آج وہ اس کی خدمت کر رہے تھے ..... تیمار داری کر رہے تھے ... جس کی بیماری کی انھیں خبر بھی نہ ہوتی تھی ... اپنے دوا علاج کی جو ذرا بھی فکر نہ کرتی تھی اور ان کا رونگٹا گرم ہوتا تو بے چین ہو جاتی۔ ڈاکٹر حکیم ذرا سی بیماری میں بلا لیتی آج اسے یہ بھی خبر نہ تھی کہ وہ دو دن میں کتنے ڈاکٹر بدل چکے ہیں ... آج انھیں پتا چلا تھا کہ تیمار داری کرنا کتنا کٹھن کام ہے ـــــ بیمار کے سرہانے بیٹھے رہنے میں دل پر کیا بیت جاتی ہے، اپنے پیارے کو موت و زیست کی کشمکش میں دیکھنا کتنا کرب ناک ہوتا ہے ... وہ خود بیمار پڑتے یا خاندان کے دوسرے لوگ بیمار ہوتے، محلے پڑوس والے تک، تیمار داری کے لیے ریحانہ کو بلاتے تھے اور وہ کس طرح استقلال مضبوطی برداشت اور خندہ پیشانی سے یہ کام کرتی تھی۔ جیسے زندگی کی ساری مسرتیں اسے مریضوں کی خدمت میں حاصل ہو جاتی ہوں! عورت کا یہ

کتنا پیارا، کتنا کمیاب، کتنا حسین روپ ہے ـــــ اس پر انھوں نے کبھی غور کیوں نہ کیا تھا ـــــ وہ تو یہی محسوس کرتے کہ بیوی کا فرض ہے میاں کی خدمت کرنا، اس میں تیمارداری بھی آجاتی ہے...... اور ریحانہ کو شوق ہے اس کا۔ ان ہی کی کیا اپنوں غیروں مخالفوں، دشمنوں سبھی کی کرتی ہے۔ وہ تو تازہ ہوا کا جھونکا، ٹھنڈے پانی کا گھونٹ تھی ـــ
کون ہر وقت یہ سوچتا ہے کہ تازہ ہوا اور ٹھنڈا پانی زندگی کی کتنی بڑی نعمتیں ہیں ......

اس کے بے رنگ چہرے پر نظریں گاڑے بیتی زندگی کی کتنی یادوں کے کتنے کارواں ان کے دماغ کے پردے پر ابھرتے اور دھندلاتے جا رہے تھے ..... کتنا پیار تھا اسے بچوں سے ـــــ کتنا آنند ملتا تھا ننھے بچوں کی خدمت میں .... کتنی عورتوں کے جاپے میں وہ خوشی خوشی گھروں میں یا اسپتالوں میں جا کر ماں اور بچے کی خدمت ساری ساری رات جاگ کر کرتی، بچے کے ننھے ننھے کپڑے سیتی .... جس کسی کو ضرورت پڑتی بے تکلف "چھوٹی آپا" کو بلا بھیجنا! جن کی بھابی تھی وہ بھی اسے آپا ہی کہتے تھے نا۔ وہ یوں کھل جاتی جیسے بڑا اعزاز مل رہا ہو ـــــ اس کی ماں بہن خالہ تو الجھتی ہی تھیں اس عادت سے کسی کسی وقت تو وہ خود جھلا پڑتے...

آخر یہ مصیبت کیا ہے، ساری دنیا کا کیا تم نے ٹھیکہ لیا ہے؟" وہ مسکراتی ـــــ دھیمی، مدھر، دل نشیں مسکراہٹ "کسی کا کام مجھ سے نکل جاتا ہے ـــــ آخر اس میں ہرج کیا ہے ـــــ دنیا میں اگر لوگ ایک دوسرے کے کام نہ آئیں تو ....." وہ جملہ ادھورا چھوڑ دیتی، اور کہنے والے اپنا سا منھ لے کر رہ جاتے .....

انھوں نے کبھی اس کے دل کا درد کیوں نہ سمجھا؟ کیوں یہ بات خیال میں نہ آئی کہ اپنے بچوں کی محبت اور خدمت سے محروم اس دل نے

زخموں کی ٹیک کا یہ مرہم تلاش کیا ہے۔ ..... وہ تو ہمیشہ یہی سمجھتے رہے کہ اسلم کو اس کی گود میں دے کر انھوں نے اسے وہ جواہر دیا جس کے بعد کسی چیز کی خواہش، کوئی تمنا باقی ہی نہیں رہ سکی! آہ مرد کا یہ دل۔ کیا وہ کبھی عورت کے دل کو نہ سمجھ سکے گا؟

اور اب یہ بیمار پڑی ہے۔ ان عزیزوں اور بچوں کا کیا ذکر جن کو اس نے اپنی محبت اور پیار کے خزانے میں سے تھوڑا سا حصہ دیا تھا — وہ تھوڑا سا حصہ جس نے ان کی زندگیاں بنا دی تھیں — دوسروں کا کیا گلہ — جب اپنا ہیرا ہی پتھر نکل گیا .....

ان کا دل جو کئی دن سے پتھر کی طرح سخت ہو گیا تھا ایک دم ایسا لگا جیسے پگھلا جا رہا ہے اور پھر شمع کے سے بے آواز آنسو ان کی بوڑھی آنکھوں سے نکل نکل کر سفید داڑھی کے بالوں میں گم ہوتے رہے... وہ ہوش میں ہوتی.... تو ان آنسوؤں کو اپنے دل میں چھپا لیتی — آج کون تھا جو دل کے اس سفید لہو کی قیمت پہچانتا؟

اور پانی کی اس چادر میں سے ایک دم ایک البیلی شرمیلی، دبلی پتلی حسینہ کا شرم سے لال سندر مکھ جھانکا، حیا سے جھکی سیاہ آنکھیں ان کی نظروں سے ٹکرائیں اور جھک گئیں.... لمبے لمبے سیاہی مائل بھورے بال چاند کے گرد ہالہ کیے ہوئے تھے ..... بھرے بھرے ڈیل پر بیاہ کا جوڑا ایسا سج رہا تھا کہ بس دیکھے جاؤ..... مگر..... آہ..... انھوں نے آنکھیں جھکا لیں — رُباب کی سانولی سلونی صورت سنجیدہ چہرہ اور بھرپور جوانی کی دردناک موت کی یادوں میں کھو گئے!... اور شاید عمر بھر وہ ان یادوں ہی میں کھوئے رہے اور یہ نہ دیکھا۔ یہ نہ سوچا... یہ نہ پرکھا کہ ان کی اور ان کے بچے کی خدمت اور محبت میں یہ بھرپور جوانی بڑھاپے کی آغوش میں کھو گئی، یہ حسین چہرہ جھریوں کے جال میں چھپ گیا۔

یہ سیاہ بال سفید ہو گئے ——— پر..... اب بھی اتنے ہی گھنے ——— اتنے ہی لمبے ہیں..... یہ تو ——— انھوں نے حیران ہو کر بستر پر بکھرے ان سفید تاروں کے جال کو دیکھا جو ریحانہ کے چہرے، تکیے، شانے اور پیٹھ پر پڑا تھا..... انھوں نے اور ان کے بیٹے نے کیا دیا اس حورِ ارضی کو..... دکھ۔ غم، محرومی، اسلم کا کیا گلہ ——— خود انھوں نے ——— انھوں نے کب اسے اپنا بھرپور پیار دیا؟ صرف لینا جانا ——— دینا نہیں!

انھیں خبر نہیں کب تک وہ ذہن کے اس کرب میں مبتلا رہے، کرب جس میں آج پہلی بار راحت بھی مل رہی تھی، غم اور درد جس میں مسرت کی چھٹکی بھی شامل تھی!

" میاں " آہ ——— وہی شیریں آواز ——— وہی لہجہ ——— چونک کر انھوں نے ریحانہ کی طرف دیکھا..... آہستہ آہستہ اس کی آنکھیں حرکت کر رہی تھیں..... پھر جیسے بڑی مشکل سے دریچے وا ہوئے..... میاں کی آنکھوں سے آنکھیں ملیں اور ان میں رہی نیس برس پہلے کی چمک نظر آئی "میاں" لب ہلے اور مسکرائے! وہ انھیں ہمیشہ اسی لقب سے پکارتی تھی ——— اور کیا نہ تھا اس ایک سادہ سے لفظ میں ——— پیار، اپنائیت ——— ادب، پریم ——— ہاتھ میں ذرا سی حرکت ہوئی..... انھوں نے جلدی سے اس کا ہاتھ تھام لیا ——— اور دونوں کو یہ محسوس ہوا کہ تپتے صحرا سے کسی نے ٹھنڈے سبزہ زار میں انھیں پہنچا دیا ہے۔

سب اسے بے ہوش سمجھ رہے تھے ——— مگر وہ بالکل بے ہوش، بالکل بے خبر تو نہ تھی..... بیچ بیچ میں ضرور ایسا ہوتا کہ وہ اندھیرے میں کھو جاتی مگر ویسے اسے پتا تھا "میاں" برابر اس کے پاس بیٹھے ہیں۔ مگر بولا نہ جاتا تھا، آنکھیں نہ کھلتی تھیں، ہاتھ پیر میں جان ہی نہ محسوس ہوتی تھی ——— مگر ذہن بیدار تھا، بیتی زندگی کی چلتی پھرتی تصویریں بند

آنکھوں کے سامنے سے ناچتی ہوئی گزر جاتی تھیں ..... وہ جاگ کر، ہوش میں آکر، آنکھیں کھول کر ان پیاری تصویروں، ان حسین مرقعوں کو کھو تو نہ بیٹھے گی ـــــ شاید لاشعور اس کو سہا رہا تھا . . . .

کنوارپنے کی الھڑ زندگی کی بکھری بکھری یادیں .... ابا غریب ماسٹر تھے، وہ سب سے چھوٹی ہونے کے ناتے ان کی بڑی لاڈلی تھی ـــــ اماں ڈانٹ ڈپٹ کرتیں مگر چاہتی بھی تو کتنا تھیں ـــــ بڑی آپا تو بیٹی ہی سمجھتیں ـــــ اور بھائی جان بچارے تو اتنے سیدھے کہ وہ ان کو کتنا ہی ستائے ـــــ سوا پیار محبت کے کچھ اور کر ہی نہیں سکتے تھے اور چھوٹا بھیا ـــــ وہ تو اس کا کھلونا تھا ـــــ جسے ہر وقت کوٹھے پہ لادے لادے پھرنا اس کا محبوب مشغلہ تھا . . . .

جانے کب، کیسے اس کی منگنی ہو گئی .... کس سے ؟ یہ وہ نہ جانتی تھی ـــــ سترہ برس کی لڑکی اپنے کو ننھی بچی ہی تو سمجھتی تھی. مگر جب اسے زندگی کی بھاری گاڑی میں جوت دیا گیا تو وہ ایک ذمہ دار عورت بن گئی ـــــ کیسے ؟ یہ تو خدا ہی جانے ـــــ سلیم میاں خاندان ہی کے تھے ـــــ اس سے بارہ چودہ برس بڑے ۔ ان کی بیوی رباب بڑی پیاری لگتی تھیں اسے ـــــ اور جب وہ مریں تو کتنا روئی تھی وہ ! پھر سلیم میاں سے اس کا بیاہ کر دیا گیا ۔ وہ جو بیوی کو اتنا چاہتے تھے ـــــ صرف اپنے ڈھائی سالہ بچے کی خاطر دوسرا بیاہ کرنے پر تیار ہوئے تھے ـــــ وہ سنجیدہ، بُردبار، خاموش اور اُداس طبیعت کے مالک تھے . . . . اپنی ملازمت کے علاوہ انھیں یا خدا کی عبادت سے شوق تھا یا بچے کی فکر . . . مگر ریحانہ کے من مندر کے آسن پر تو پہلے ہی دن سے "میاں" کی مورتی سج گئی تھی ۔

دوسری طرف کس جانب کی کمی ہے اس کو ریحانہ کا الھڑ ذہن سمجھ ہی نہ سکا۔
اور پھر تو عادت پڑ گئی سرد مہری کے اس برتاؤ کی جو عمر بھر میاں نے کیا۔۔۔
رخصتی کے وقت ماں نے بیٹی کو گلے سے لگا کر آنسو پیتے ہوئے
کہا تھا ـــــ " میری بچی بہت بڑی ذمے داری خدا نے ڈالی ہے تجھ پہ
ہم نے تجھے کڑے امتحان میں ڈال دیا ہے میری جان ـــــ ایک ٹوٹے دل
کو ہاتھ میں لینا ہے ـــــ ایک بے ماں کے بچے کی ماں بننا ہے تجھے۔۔۔۔
سچی ماں ـــــ سوتیلی ماں نہیں ـــــ سگی ماں۔۔۔ " بات ایسے وقت کہی
گئی تھی جب لڑکی کا دل موم ہوتا ہے اور ہر چیز نقش ہو جاتی ہے ـــ
اچھی ہو یا بری! سہاگ رات " میاں " نے ننھے اسلم کو اس کی گود میں
دے کر بھی یہی کہا تھا " لو ریحانہ آج تک یہ میرا بچہ تھا ـــــ اب تمہارا
ہے ـــــ میری محبت یہی ہے کہ تم اس معصوم کو پیار کی وہ دولت
دے ڈالو جس سے قسمت نے اسے محروم کر دیا ہے ـــــ " اس
نے دونوں ہاتھ پھیلا کر بچے کو لیا اور اپنے سینے سے لگا لیا ـــ
اور اس دن سے " میاں " اور بچے کی خدمت اور محبت کو عبادت
کا درجہ دے دیا ـــــ یہ جانے بغیر کہ خدا کی محبت کی راہ بندوں
کے دلوں میں سے ہو کر گزرتی ہے!

سچ مچ پندرہ سال کی عمر تک اسلم کو یہ پتا چلا ہی نہیں کہ ریحانہ
اس کی ماں نہیں۔ شاید ریحانہ کی گود ہری ہو جاتی تو اس کی محبت
میں فرق آجاتا مگر وہ ویران ہی رہی اور ممتا کا سارا خزانہ اسلم میں
لٹتا رہا ـــــ یہ بات تو فطرت کے اصول کے خلاف ہوتی اگر اس کو اس
بات کا دکھ یا احساس نہ ہوتا مگر یہ دکھ ـــــ یہ غم صرف اس کا تھا ـــ
جس میں شاید وہ خدا کو بھی شریک کرنے کی روادار نہ تھی ـــــ اسلم اس
کی جان تھا ـــــ ہر جگہ وہ اس کے ساتھ جاتا۔ اور کسی کا کیا ذکر میاں؟

کسی بھی یہ مجال نہ تھی کہ اسے کڑی نظر سے دیکھیں یا ذرا سی سختی کریں...
اس راہ میں کتنی کٹھنائیاں اسے جھیلنی پڑی تھیں — یہ تو میاں بھی نہ جانتے تھے — میکے کے لوگوں نے — محلے پڑوس والوں نے جو خدا جانے کیوں دلوں میں محبت کے ابلتے سوتے گوارا نہیں کر سکتے کس کس طرح اس کے کان بھرے تھے — پرایا بچہ کبھی اپنا نہیں ہوتا — سوکن کی اولاد سانپ بچھو سے کم نہیں ہوتی۔ بڑا ہو کر یہ تمہیں پوچھے گا بھی نہیں! وہ ایک کان سے سنتی اور دوسرے سے نکال دیتی کتنے تنگ دل ہیں یہ لوگ! ادھر سسرال والوں اور بعض اور "خیر خواہوں" کی کوشش رہی کہ میاں کو بیوی سے بدگمان کر دیں... بچے پر بھی یہ جتلانے کی کوشش ہوتی کہ یہ تیری اپنی ماں نہیں۔ اسلم کے ننھیال والے چاہتے کہ اسے اپنے پاس رکھیں اور سلیم میاں سے اس کے بہانے روپے اینٹھیں — مگر ریحانہ نے سب کو شکست دیدی۔ شروع کے چند سالوں میں سلیم میاں نے اس پر کڑی نظر رکھی — وہ بچے سے سوتیلی ماں والا سلوک تو نہیں کرتی ہ، کبھی کبھی دونوں میں بدمزگی اور جھڑپ بھی ہو جاتی — مگر دو تین سال کے اندر ہی خدمت خلوص اور محبت نے انھیں زیر کر لیا۔ اب تو کسی کی مجال بھی نہ ہوئی کہ ریحانہ کے خلاف ان سے کچھ کہہ سکے۔ اسلم کو برسوں انھوں نے ننھیال نہیں بھیجا کہ وہ لوگ سوت سوتیلے کا مسئلہ نہ اٹھائیں اور بچے کے دل میں برائی نہ ڈالیں۔ اس طرح ننھا اسلم اس زہر سے بچ گیا جو لوگ اس کی رگوں میں داخل کرنا چاہتے تھے! بارہ تیرہ سال کی عمر تک ریحانہ اپنی مامتا کی پیاس اسلم کے پیار کی چھاؤں میں بجھاتی رہی... میاں سے جو والہانہ محبت اسے نہ مل سکی تھی اس کی کسر اسلم کی محبت نے پوری کر دی تھی۔

مگر بیوی کے لاڈ پیار اور محبت میں بچہ بگڑا جا رہا تھا۔ پڑھنے

لکھنے میں ذرا کسی استاد نے سختی کی اور ریحانہ آپے سے باہر ہوئی ——
آخر تیرہ سال کی عمر میں انھوں نے دلی کے ایک معیاری اسکول میں اسلم
کا داخلہ کرا دیا —— ماں بیٹا رو رو کر ایک دوسرے سے جدا ہوئے،
دونوں ریحانہ میاں سے بولی نہیں۔ ... خیر یہ تو وقتی بات تھی۔ اب بیٹے کی
چھٹیوں کا انتظار عید کے چاند کی طرح ہوتا رہتا —— وہ آتا تو ناز
برداری خاطر داری میں لاڈ پیار میں وقت ایسے گزر جاتا کہ پتا ہی نہ چلتا
اور جدائی کی گھڑی سر پر آ کھڑی ہوتی .... اسلم ماں سے ایسے لاڈ کرتا
جیسے ننھا سا بچہ —— سلیم میاں کبھی ہنس پڑتے کبھی ٹوک دیتے ——
مگر خود ان کا دل ہاتھ بھر کا ہو جاتا —— جس کا ایسا بیٹا اور ایسی بیوی
ہو! اسے دنیا میں اور کیا چاہیے۔

زمانہ گزرتا رہا۔ اسلم نے میٹرک کر لیا، علی گڑھ میں داخلہ ہوا،
بی۔ اے کیا اور اس سال ایم۔ ایس۔ سی بھی کر لیا تھا۔ دونوں ماں باپ
بیٹے کی قابلیت اور اخلاق و کیریکٹر پر بڑے نازاں تھے —— اس کی
سعادت مندی پر باپ کو بڑا غرور تھا کہ وہ مجھ سے زیادہ ماں کو چاہتا
اور حکم مانتا ہے۔ وہ جانتے تھے کہ اسلم کے ننھیال والوں نے اسے بتا دیا
ہے کہ ریحانہ اس کی ماں نہیں —— یہ بھی جانتے تھے کہ اسلم اکثر چھٹیوں
میں ننھیال جاتا ہے مگر یہ بات نہ انھوں نے بیوی کو بتائی نہ بیٹے پر ظاہر ہونے
دی تھی!

جب اسلم دور چلا گیا تو ریحانہ نے محبت کی دولت پڑوسیوں،
دور کے عزیزوں اور دیہات کے لئے ماں باپ کے بچوں پر لٹانی شروع
کر دی —— ان ننھے منوں کی پوپلی مسکراہٹ، ان کی معصوم صورت، ان
کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ پیروں کا مارنا، ان کا رونا چلانا تک اس کے دل
کو ایک انوکھی مسرت سے بھر دیتا تھا ... رات رات بھر وہ انھیں گود میں

لیے بیٹھی رہتی، دن دن بھر ان کے کام کیا کرتی ـــــ اور جب ہفتوں یا مہینوں بعد بچے کی ماں اسے لے کر اپنے ٹھکانے چلی جاتی یا خود ریحانہ دس بیس دن مصیبت بھگت کر گھر واپس آتی تو آنکھیں اداس، چہرہ زرد، دل ویران سب ناراض ہوتے خوامخواہ اپنے کو تھکا مارتی ہے ـــــ اور وہ دل کے درد کو سینے میں چھپا کر میاں کی خدمت اور "اپنے بچے" کی واپسی کے انتظار میں لگ جاتی ... دل کا درد غائب ہوجاتا ـــــ زندگی مسکرانے لگتی!

مگر پچھلے ہفتے کے حادثے نے اس کا سب کچھ چھین لیا ... امیدیں، آرزوئیں ... پیار کی دنیا لٹ گئی! ممتا کا دیپک بجھ گیا ـــــ دل کی بستی اجڑ گئی ـــــ وہ کسی کی ماں نہیں ـــــ اسلم اس کا نہیں سوت کا بیٹا ہے اس نے صحرا میں ہل چلایا تھا ... بنجر زمین میں پیار کے بیج بوئے تھے ....

کس چاؤ سے اس نے اپنی چھوٹی بھتیجی سے اسلم کی منگنی کی تھی۔ دونوں ساتھ کھیلے تھے ـــــ ایک دوسرے سے بہت مانوس تھے ـــــ منگنی پر اسلم بڑا خوش بھی تھا ـــــ ہاں یہ شرط رکھی تھی کہ شادی ایم۔ اے کرنے اور نوکر ہونے کے بعد کرے گا ..... اور اب ریحانہ بڑے چاؤ سے شادی کی تیاریوں میں لگی ہوئی تھی!

مگر اسلم امتحان ہونے کے مہینے بھر بعد گھر آیا ـــــ اکھڑا اکھڑا، پریشان نہ ماں کے پاس زیادہ بیٹھتا نہ بات کرتا۔ بیاہ کے ذکر پر تیوری پر بل آجاتے اٹھ کر باہر چلا جاتا ـــــ مگر ممتا اندھی ہوتی ہے ـــــ ریحانہ سرشم پر اس کی ہر بات کو محمول کرتی رہی۔ لیکن سلیم میاں نے دنیا دیکھی تھی۔ لڑکے کے انداز دیکھ کر وہ کھٹک رہے تھے .....

پھر ایک دن باپ بیٹے میں کچھ باتیں ہوئیں ـــــ اور ریحانہ نے

دیکھا کہ دونوں کو چپ لگ گئی ہے۔ تیسرے دن وہ ضبط نہ کر سکی۔

"یہ تم دونوں کا منہ کیوں پھولا ہے آخر؟"

سلیم میاں چپ رہے۔ اسلم اٹھ کر جانے لگا ـــــ ماں نے ہاتھ زور سے پکڑ لیا۔

"چلا کہاں ـــــ بات بتا کیا ہے؟" اسلم مجبوراً بیٹھ گیا۔ سلیم میاں نے بمشکل اتنا کہا "تمہارا لاڈلا شادی سے انکار کر رہا ہے ـــــ"

"شادی سے انکار؟ ارے ـــــ یہ کہتا ہوگا کہ نوکر ہو جانے پر کروں گا۔ باولا ہے ـــــ ارے یہ سب کچھ تیرا ہی تو ہے میرے بچے ـــــ ہمارا تیرے سوا اور کون ہے" اور جوشِ الفت سے بے قرار ہو کر اس نے بیٹے کا سیاہ بالوں سے ڈھکا سر چوم لیا۔

"نہیں! اسے تمہاری کی نسبت منظور نہیں ـــــ وہ کسی اور لڑکی سے شادی کرے گا!" سر زور سے چکرایا اور وہ بیٹے کے کندھے سے ٹک گئی ...... کسی .... اور سے ..... کیوں ..... "

"اسی سے پوچھو!"

"بتا ـــــ بتا تا کیوں نہیں ـــــ" زندگی میں پہلی بار رجانہ کو بیٹے پر غصہ آیا اور اس نے اسلم کو جھنجھوڑ ڈالا ـــــ "بتا یا سمین میں کیا برائی ہے؟"

"کوئی نہیں .... ماں ـــــ مگر .... مجھے .... وہ ـــــ میں کسی اور لڑکی سے بیاہ کرنا چاہتا ہوں۔"

"کس سے؟"

"آپ اسے نہیں جانتیں!"

"مگر ..... یہ منگنی چار پانچ سال سے ہے تو نے اسی وقت انکار کیوں نہیں کیا تھا؟" غصے میں وہ کانپ رہی تھی۔

"اس وقت مجھے سمجھ نہ تھی!"

"اخاہ! اب بڑے سمجھ دار ہو گئے ہیں —— بے وقوف - بچہ ہے اب تک!"

"میں بچہ نہیں ماں —— ستائیس برس کا جوان مرد ہوں" اکڑ کر اسلم نے جواب دیا اور ریحانہ نے بے اختیار بلائیں لے لیں "چشم بد دور —— حف نظر —— پر احمق میرے لیے تو، تو بچہ ہی ہے ...."

اسلم چپ رہا۔ ریحانہ نے چاپلوسی کی "بیٹے یاسمین ہزاروں میں ایک لڑکی ہے —— پھر اتنی پرانی منگنی کیسے ٹوٹ سکتی ہے بھلا —— ایسی بیوی تو ساری دنیا میں چراغ لے کر ڈھونڈے گا تو نہ ملے گی میرے لال ——"

"ماں میں اپنا برا بھلا، پسند، ناپسند، خوشی راحت کا خود ذمے دار ہوں ....."

"صاف کیوں نہیں کہتا کہ تو رافعہ کو قول دے چکا ہے —— ماموں کی بیٹی کو ——" باپ نے غصہ سے کہا۔

"میں تو آپ سے سب کچھ صاف صاف کہہ چکا ہوں ابّو!" اسلم نے سرکشی سے جواب دیا!

"اچھا تو بابا بیٹے میں پہلے ہی مسکوٹ ہو چکی ہے؟ کون ہے یہ رافعہ۔ کیسی ہے! یاسمین سے زیادہ خوبصورت ہے کیا؟" ریحانہ کی آواز ٹوٹی جا رہی تھی!

"ماں یاسمین اور رافعہ کا کوئی مقابلہ نہیں —— وہ ایم اے پاس ہے ..... اور ....."

"مگر میں اس کی اجازت نہ دوں گی .... تو میرے منہ میں کالکھ نہیں لگا سکتا ...... میں تیری ماں ہوں —— تیری ماں ——"

ٹوٹی آواز میں ریحانہ کہہ رہی تھی!

"ماں کبھی بیٹے کا دل نہیں توڑتی ـــ"

"میرے لال میں نے کب تیرا دل توڑا! میری جان تجھ پر قربان ـــ مگر یہ عزت کا معاملہ ہے۔ ـــ ایک کنواری معصوم لڑکی پر گالی چڑھ چکی ہے...."

"میں ان باتوں کا قائل نہیں۔ ـــ صرف یہ جانتا ہوں ماں بچے کی ہر ضد پوری کرتی ہے!"

"میں نے ہمیشہ تیری ہر جا بے جا ضد اٹھائی ہے ـــ"

"اٹھائی ہوگی ـــ مجھے نہیں معلوم ـــ" رکھائی سے جواب ملا۔

"اسلم!" سلیم میاں تیز لہجے میں بولے "تم میرے سامنے اپنی ماں سے اس طرح بات نہیں کر سکتے ـــ"

"ابو میں کسی کی ضد پر اپنی زندگی کی خوشیاں قربان نہیں کر سکتا ـــ"

"تیری یہ مجال!" ـــ سلیم میاں ساری جان سے کانپ رہے تھے۔

"ارے ارے! آپ کو کیا مطلب" آپ ماں بیٹے کے معاملے میں کیوں بول رہے ہیں ـــ!"

"مجھے آج معلوم ہوا ابو ـــ میں بے ماں ہی کا نہیں ـــ باپ بھی میرے نہیں رہے...."

"ناخلف ـــ نمک حرام ـــ احسان فراموش...." سلیم میاں گرجے۔

ایک دردناک چیخ ریحانہ کے منہ سے بلند ہوئی ـــ "بے ماں ـــ کا!!"

"ہاں ـــ بے ماں کا ـــ" اسلم غصے سے کانپ رہا تھا!

"میرے لال میرے بچے ـــ میری جان ـــ میں تیری ماں

عرف تیری ماں ۔"

ہوں "ہوں ! ماں ہیں ـــــ مگر سوتیلی .....؟ زہر کی پھنکار کی طرح بیٹے کے منہ سے نکلا ....

"سو ـــ تے ـــ لی ـــ" تتلا کر ریحانہ نے کہا ـــ کھڑے کھڑے دو تین ہچکولے کھائے ـــــ دونوں باہیں خالی فضا میں پھیلائیں ـــ س ـــ و ـــ ت ـــ ے ـــ ل ـــ ی ـــ" اور تڑاخ سے زمین پر گر پڑی !

اسلم اسی دن اسی رات چلا گیا ـــــ اور ایک ہفتے سے ریحانہ اسی حالت میں پڑی تھی ـــــ دو دن سے تو موت اور زیست کی کش مکش اور تیز ہو گئی تھیں .....

سلیم میاں نے بیوی کی پٹی سنبھال لی تھی ـــــ دنیا کا ہر کام چھوڑ دیا تھا ـــــ پچیس برس کی رفیق حیات کی ہر خوبی، ہر خدمت، ہر قربانی مجسم ہو کر سامنے آ رہی تھی !

انھوں نے اسی کی قدر نہ کی ـــــ اس کو محبت کی دولت نہ دی ـــــ اسی کی دوستی کی نعمت سے رہنے کو محروم رکھا ـــــ کتنے بدنصیب ہیں وہ ـــــ اگر ـــــ اگر ـــــ ریحانہ ..... ان سے روٹھ گئی تو ..... اور وہ ساری جان سے لرز گئے ۔

ریحانہ نے بند آنکھیں کھولیں ـــــ یہ موٹے موٹے شفاف قطرے گوشوں سے لڑھک کر تکیے میں کھو گئے !

"ریحانہ ـــــ میری جان ـــــ میری روح ـــــ شکر ہے ـــ

تمھیں ہوش آگیا!"

ان کی آوازمیں پیار ــــــ وہ کھنک، آنکھوں میں محبت کی وہ جوت
چہرے پر پریم کا وہ رنگ تھا جس کے لیے ریحانہ کی روح پچیس برس سے
کلپ رہی تھی..... اس نے اپنا سر ذرا سا ہلایا اور ان کے زانوں پر رکھ
دیا..... اور بوڑھے سلیم میاں نے اسی کے سفید الجھے بالوں پر اپنے ہونٹ
جھکا دیے......

اور وہ دونوں سب کچھ بھول کر ایک نئی دنیا ــــــ انوکھی مسرت
میں کھو گئے۔

●

خالہ اَلّو

رشتہ داری تو ہماری ان کی بہت دور کی تھی مگر وہ جو مثل ہے کہ اپنے دور پڑوسی پڑے — ان کا گھر ہمارے گھر سے ملا ہوا تھا اور وہ سگی پھوپی یا خالہ سے زیادہ ہمارے گھر میں دخیل تھیں — اسی لیے ہم ان سے جلتے تھے — اماں ہمیں کبھی اتنا نہ ڈانٹتیں، خالہ اماں، چچی اماں، کبھی اس قدر برا بھلا نہ کہتیں مگر یہ ہماری خالہ یا پھوپی الّو — ارے صاحب کچھ نہ پوچھیے لڑکیوں اور لڑکوں کو اٹھتے بیٹھتے ٹوکنا، برا بھلا کہنا، لعنت ملامت کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ اور ہم کسی کی بھی بات پر ناک بھوں چڑھا لیں، منہ بسور لیں، کبھی کبھار الٹ کر جواب بھی دے لیں مگر خالہ الّو کی زہریلی باتیں شہد کے گھونٹ کی طرح سہنی پڑتی تھیں نہیں تو اماں کا غصہ اور ناراضگی کون سہتا؟ —

اس وقت ہماری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر ہماری اماں اور خالہ اماں اور چچا ابا کو ان چڑچڑی بد دماغ بڑھیا کا اتنا پاس لحاظ کیوں ہے؟ ہمیں تو ان میں کوئی بات دلکش اور دل پسند نظر نہ آتی۔ مگر ہمارے بزرگوں کا یہ حال کہ جب وہ آجائیں تو "الّو ادھر بیٹھو، الّو کھانا کھا لو، — الّو بی جی کیسا ہے! الّو بی الّو ارے کا کوئی خط آیا —؟" بچھے جا رہے ہیں۔ اور الّو بی ہیں کہ کسی سے سیدھے منہ بات نہ کریں — اور تو اور ہمارے چچا ابا اور بڈھے چچا جان

جن سے سبھی ڈرتے اور حد سے زیادہ ادب سے بات کرتے تھے۔ ان کو بھی وہ دس باتیں سنا ڈالتیں اور وہ ہنس ہنس کر سنتے۔

زمانہ گزرتا گیا ۔۔۔ وہ گھر وہ عزیز، وہ شہر چھوٹ گیا ۔۔۔ اپنے پرائے ہو گئے ۔۔۔ غیر اپنے بن گئے ۔۔۔ بہت سی بچپن کی تلخ یادیں دشیریں یادوں کے ساتھ خالہ الّو کی یاد بھی ماضی کا بھلایا افسانہ بن گئی۔......

مگر آج جانے کیوں مجھے ان کی بے طرح یاد آرہی ہے۔ ان کی سیرت و شخصیت کا حسن میرے ذہن کے آئینے میں نکھر آیا ہے ۔۔۔ آج میں سمجھ سکتی ہوں کہ ہمارے حساس دور درد مند بزرگ ان چڑچڑی بد دماغ بڑھیا کی عزت کیوں کرتے تھے!!

اس کا اصلی نام کیا تھا یہ تو شاید وہ خود ہی جانتی ہوں ۔۔۔ ہم نے تو ہر بڑے چھوٹے، آئے گئے، مرد عورت کو ان کے اسی لاڈ کے نام سے پکارتے سنا ۔۔۔ بچے خالہ پھوپی نانی وغیرہ آگے پیچھے لگا لیتے تھے ۔۔۔ مرد بی بی کا اضافہ کر دیتے تھے۔

اپنے نام ہی کی طرح وہ بے حد مختصر تھیں۔ کوئی سوا چار فٹ کا قد، دبلی ایسی کی پھونک مارو تو اڑ جائیں ۔۔۔ سوکھے جھریوں بھرے ہاتھ پیر ۔۔۔ البتہ آنکھیں بہت بڑی اور چمکدار تھیں ۔۔۔ جب وہ ان آنکھوں سے لڑکیوں کو گھورتیں تو جان نکل جاتی ۔۔۔ آج میں سوچتی ہوں کہ ان کی ساری شخصیت ان آنکھوں ہی میں تھی ۔۔۔ پتلی چونچ جیسی ناک بھی خاص چیز تھی۔ وہ ہمیشہ سفید موٹی ململ کا دوپٹہ کرتا اور چھینٹ کا تنگ مہری کا پھنسا ہوا پاجامہ (جی ہاں وہی جو آج کل جدید ترین فیشن ہے) سفید لٹیں ایسی جمی ہوئی کہ کیا مجال ایک بال اِدھر سے اُدھر ہو جائے۔ بیٹھی ایڑی کی جوتیاں! (وہی جو آج کل الٹھرا ماڈرن لڑکیاں بڑے فخر سے پہنتی ہیں) سر پر اکثر ایک کالا رومال جسے "قصابہ" کہتے تھے،

بندھا رہتا۔ انگلیوں کے پوروں اور پاؤں کے ناخنوں پر مہندی اکثر لگاتی تھیں
—— ان کا عقیدہ تھا کہ بے مہندی لگے ناخونوں کے ہاتھ سے مانگی دعائیں
اللہ میاں قبول نہیں کرتے۔

ہم نے انھیں ہمیشہ اسی حلیے میں دیکھا۔ مگر سنا ہے کہ جوانی میں جب
وہ میاں کی لاڈلی اور ساس سسر کی چہیتی تھیں تو۔ زیوروں سے گوندنی
کی طرح لدی رہتی تھیں اور اچھے سے اچھا ریشم اور زری کے کپڑے پہنتی تھیں
اور بڑی بڑی رئیس زادیوں کو خاطر میں نہ لاتیں نہ سیدھے منہ بات کرتیں
بزرگوں کے قحط کے زمانے کے خریدے چھوکرے چھوکریوں پر جن کو سب
لوگ نوکر، وہ خود لونڈی غلام سمجھتی تھیں، ایسے ظلم ڈھاتیں کہ سن کر
رونگٹے کھڑے ہوجاتے۔ کسی کا ہاتھ دہکتے سے داغ دیا کسی کو بید سے اتنا
مارا کہ بے ہوش ہوگیا—— مگر مزے کی بات یہ کہ پھر وہی ہاتھ مرہم لگاتے
سینکائی کرتے اور ان بدنصیبوں کو (جنھیں اس وقت نہ اپنے حق کی خبر تھی نہ اس
کا احساس کہ انسان ہونے کے ناتے سب برابر ہیں) اتنا دیتیں کہ وہ شکایت
کرنے کی جگہ الٹے ان کی تعریفیں کیا کرتے—— خیر یہ سب تو سنی سنائی باتیں
ہیں—— مگر اپنے ایک پرانے ملازم اور اس کی کم سن بیوی کو مارتے اور گالیاں
دیتے ہم نے خود دیکھا تھا—— اس لڑکی کو خالہ اماں سے دلی نفرت تھی اور ہم
لڑکیوں کے پاس بیٹھ کر ان کو جی بھر کر برا کہتی اور ہم لوگ دل و جان سے
اس کی ہمدردی کرتے اور ہاں میں ہاں ملاتے تھے—— کچھ دن بعد وہ چپکے سے
اپنے میکے بھاگ گئی مگر ان کا ملازم جسے انھوں نے بیٹوں کی طرح پالا تھا آخر
دم تک ان کے ساتھ رہا۔

وہ غریب ماں باپ کی بیٹی تھیں مگر شادی کم سنی ہی میں ایک کھاتے
پیتے گھر میں ہوگئی تھی۔ ان کے میاں، جو عمر میں ان سے کافی بڑے تھے۔ کسی
چھوٹی سی تحصیل میں تحصیلدار تھے۔ جن کی اوپر کی آمدنی۔ خیر سے اتنی تھی

کہ رئیسوں میں ان کا شمار ہونے لگا تھا۔ خالہ تو جب تک نا سمجھ رہیں زیوروں ریشمی کپڑوں اور مرغن کھانوں سے بہلائی جاتی رہیں اور سمجھتی رہیں کہ ان کے میاں ان پر دل وجان سے فدا ہیں ۔۔۔ مگر چند سال کے اندر ہی ان پر میاں کا پردہ فاش ہو گیا۔ چند سال انھوں نے خون کے گھونٹ پی پی کر یہ سب سہارا ۔۔۔ مگر جب انھوں نے یہ سنا کہ میاں نے ایک طوائف کی لڑکی سے نکاح کر لیا ہے تو ان کی برداشت کی قوت ختم ہو گئی۔ انھوں نے زیور نوچ کر پھینک دیئے، چوڑیاں سل کے بٹے سے توڑ ڈالیں، رنگین دوپٹہ اتار کر سفید دوپٹہ اوڑھ لیا اور اعلان کر دیا "وہ بندی رانڈ ہو گئی ۔" اس زمانے کی بیویاں کوئی بری بات کسی کی نقل کرتیں تو میں کی جگہ "وہ بندی" کا لفظ استعمال کیا کرتی تھیں) اور اپنے چار سال کے بچے کو لے کر میکے کی پرانی ٹوٹی پھوٹی حویلی میں آ گئیں ۔۔۔ سنا ہے سارے خاندان نے زور ڈالا، لاکھ سمجھایا، خود ان کے میاں نے ہاتھ پیر جوڑے کہ وہ معاف کر دیں۔ اور اپنے گھر چل کر رہیں ۔۔۔ خاندان پر ان کی حکمرانی رہے گی، سیاہ سفید کی وہ مالک ہوں گی ۔۔۔ مگر وہاں تو ایک ناں منھ سے نکل گئی تو بس نکل گئی ۔۔۔ دوسری بار جب میاں آئے تو انھوں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا ۔۔۔ " میں کسی نامحرم سے سامنا نہیں کرنا چاہتی ۔"

لوگ تو پہلے ہی ان سے خار کھائے تھے۔ اقتدار اور اختیار کے زمانے میں جو لوگ خوشامد کرتے وہی ان کے میاں کو بھڑکانے میں پیش پیش رہے نتیجہ یہ ہوا کہ میاں نے نہ صرف خرچ بند کر دیا، مہر نہیں دیا، بلکہ بچہ بھی چال بازی سے ان سے چھین لیا گیا ۔۔۔ اور اب پچھلے تیس سال سے وہ اس اجاڑ حویلی میں تن تنہا رہتی ہیں ۔۔۔ جس کی کھڑکی ہمارے گھر میں کھلتی تھی۔ !!

چند سال بعد ان کے میاں مر گئے اور ان کی چھوڑی دولت نابالغ لڑکے کو ملی جو ددھیال میں پل رہا تھا۔ اور کبھی کبھار ماں سے ملنے آجاتا تھا۔

دیوار پر ایک چھوٹے سے ہاتھ کا روشنائی میں بھرا نقش (جو اب بہت دھندلا پڑ چکا تھا) ہمیشہ نظر آتا تھا ـــــ گھر پر جب بھی قلعی ہوتی وہ حصہ خالہ انو کے حکم مطابق چھوڑ دیا جاتا ـــــ کئی بار ان کے گھر سے آتے جاتے ـــــ اصل میں ان کے گھر میں سے ہو کر ایک رستہ نانا ابا کے گھر کو جاتا تھا ـ اور چوں کہ رستہ بہت چھوٹا پڑتا تھا اسی لیے ہم بچے ان کی ڈانٹ ڈپٹ کے باوجود وہاں سے گزر کر جایا کرتے ـــــ بیچ صحن میں لوہے کی جالی سے گھری ایک پکی قبر تھی ـ جس پر جمعرات کی جمعرات چراغ جلا کرتا تھا ـــــ خالہ انو کا حکم تھا کہ بچے جب وہاں سے گزریں سلام کر کے جائیں چنانچہ ہم لوگ کھڑکی میں سے صحن میں آتے اور پورا گلا پھاڑ کر "شہید صاحب سلام، شہید صاحب سلام" کہتے تیزی سے دروازے کی طرف بھاگتے ـــــ ایسے میں کبھی کبھار ہم نے یہ دیکھا کہ وہ دیوار کی طرف منہ کیے اسی نشان کو بیٹھی تک رہی ہیں اور ان کی بڑی بڑی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو ڈھلک رہے ہیں مگر جیسے ہی وہ ہم لوگوں کی آواز سنتیں جانے آنسو کہاں غائب ہو جاتے اور وہ اپنی نصیحت فضیحت کے تیر برسانا شروع کر دیتیں اور ہم کوشش کرتے کہ جلد سے جلد اس میدان جنگ کو پار کر کے حفاظت کی جگہ پہنچ جائیں .....

بیٹا جوان ہوا تو اپنے باپ سے بھی چار ہاتھ آگے نکلا ـ ماں کو دھوکا دینے میں اس کا جواب نہ تھا ـ لکھ پڑھ کر خاک نہ دیا، دھڑا دھڑ فیل ہوتا اور ماں سے کہتا سب اسکول کے ماسٹر میرے دشمن ہیں ـ میری دولت اور قابلیت سے جلتے ہیں اور مجھے فیل کر دیتے ہیں ـ مصاحبین اور ارباب نشاط پر روپیہ لٹاتا ـــــ ماں سے کہتا فلاں یتیم خانے میں، فلاں اسکول، فلاں بیوہ کو اتنا روپیہ دے دیا ہے ـــــ اور وہ بیٹے کی باتوں پر آنکھ بند کر کے یقین کر لیتیں ـ چچا ابا جو دور کے رشتے سے ان کے بھائی بھی تھے اور سرپرست بھی، ان کو لاکھ سمجھاتے مگر بیٹے کا کوئی عیب انھیں نظر نہ

آتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک دن وہ تیس چالیس ہزار روپے میں سب جائیداد بیچ باچ کسی اور دیس نکل گیا اور بد نصیب ماں ہمیشہ کے لیے اکیلی رہ گئی!! جس طرح میاں کی بے وفائی کے بعد وہ ان سے بے تعلق ہو گئی تھیں، بیٹے کی اس سنگ دلانہ حرکت کے بعد پھر انھوں نے اس کا نام بھی نہیں لیا۔

یہی زمانہ تھا جب ہم نے انھیں دیکھا تھا۔ زندگی کا ہر سہارا ٹوٹ چکا تھا ہر امید ختم ہو چکی تھی۔ غرور خاک میں مل گیا تھا۔ نہ باپ، نہ بھائی، نہ شوہر، نہ بیٹا، نہ پیسہ، نہ جائیداد۔ غریب باپ کی تھوڑی سی زمین تھی جس کا اناج سال کے سال آجاتا۔ اس کا کچھ حصہ بیچ کر جو روپیہ ملتا اسی سے ان کا خرچ چلتا باقی روکھی روٹی کھانے کا سہارا تو تھا ہی!

مگر آن بان اور طنطنہ وہی تھا۔ کسی عزیز سے مدد لینے پر تیار نہ تھیں چار وقت کا فاقہ گزر جائے مگر کیا مجال کہ محلے پڑوس والوں کے کان میں اس کی بھنک بھی پڑ جائے!

یوں وہ دن دن بھر ہمارے ہاں رہتیں اس لیے کہ ہماری اماں کو وہ بہت چاہتی تھیں اور اگر کسی کی بات کبھی مانتی تھیں تو وہ اماں کی! کبھی کبھی اماں اپنی چادر یا دوپٹے میں کچھ چھپا کر ان کے گھر جاتیں تو میں بھی ساتھ ہو لیتی ــــ (میں اتنی چھوٹی تھی کہ شاید وہ دونوں یہ سمجھتی تھیں کہ یہ کچھ نہیں جانتی اور سمجھتی) ــــ اور پھر میں دیکھتی کہ اماں ہزار ہزار خوشامد کر کے ان کو اپنے ہاتھ سے نوالہ بنا بنا کر کھلا رہی ہیں اور خالہ اللو کے تیوری پر بل ہیں، آنکھوں سے آنسو ڈھلک رہے ہیں اور نوالا اس طرح چبا رہی ہیں جیسے کوئی کڑوی زہریلی چیز! ان کی خودداری اگر کبھی ہار مانتی تو بس انھیں سے پچپن میں یہ ہم نہ سمجھ پائے تھے کہ انھیں کم سن لڑکے لڑکیوں سے کیا بیر ہے ــــ ممکن ہی نہ تھا کہ وہ کسی نو عمر لڑکی یا لڑکے خاص کر لڑکی کو دیکھیں اور ٹوکیں نہیں ــــ "چال تو دیکھو ــــ زمین ہلائے دے رہی ہے ــــ اری ذرا

دھیرے چلا کر — جوان لڑکیاں یوں کدکڑے لگاتی نہیں پھرا کرتیں۔"

"اے ہے — آواز آہستہ کر، باہر غیر مرد سنیں گے۔"

"او بی بیوی اپنے حواسوں کا صدقہ دو — یہ دوپٹہ کہاں جا رہا ہے۔"

"آنکھیں نیچی کر کے بات کر —"

ارے صاحب اب تو یاد بھی نہیں کیا کیا نصیحتیں ہم سب کو ہوتی تھیں — ہمارے گروپ کے دو ایک لڑکے بڑے شریر تھے اور ان کو ستانے کی اسکیمیں بنانے رہتے تھے۔ ان سے خالہ الّو کو سچ مچ کا بیر ہو گیا تھا — ہائے — کیسے کیسے کڑاکے کے کوسنے اور گالیاں وہ ان معصوم بچوں کو دیتی تھیں — مگر صاحب ان کے رعب اور طنطنہ کا کیا کہنا کہ وہ مائیں جو بچوں کو خود ٹیڑھی نظر سے نہیں دیکھتی تھیں۔ کوئی ذرا کچھ کہدے تو مرنے مارنے پر آمادہ ہو جاتی تھیں۔ وہ خالہ الّو کے کوسنوں اور گالیوں کو دودھ کے گھونٹ کی طرح پی جاتیں اور الٹا اپنے لاڈلے کو ڈانٹتیں "نامراد — کیوں ستا رہا ہے — یا لاؤں تیرے باوا کو۔"

گالیاں ان کی زبان پر بری طرح چڑھی ہوئی تھیں — ان کے ایک رشتے کے بھائی بڑے مولوی اور عالم سمجھے جاتے — ان کے ہم عمر اور ساتھ کے کھیلے تھے — ان بہن پر ان کو رحم بھی بہت آتا اور غصہ بھی۔ مولوی آدمی تھے — بڑے بارعب اور نمازی پرہیزگار — جیسے ہی وہ آتے سب بڑے اور بچے باادب ہو جاتے — مگر واری ہماری خالہ الّو — ان کو وہ وہ باتیں سناتی تھیں کہ توبہ بھلی! — ان مولوی بھائی کا شروع سے اصرار تھا کہ وہ نکاح ثانی کر لیں — مگر خالہ الّو نے اس تجویز یہ اپنی اور ان کی جان ایک کرنے کی ٹھان لی —

اب تو خیر وہ محض ان کو چھیڑنے کو کہتے تھے۔! جانے ان بڑے میاں کو

بہن کی گالیاں کھانے کا کیا شوق تھا۔۔۔ اچھی بھلی سنجیدہ باتیں ہو رہی ہیں کہ انھوں نے شوشہ چھوڑا۔۔۔ "الو ۔۔۔ تو نکاح کیوں نہیں کر لیتی۔" بیچ جیسے کسی نے بارود میں دیا سلائی دکھا دی ۔۔۔ ان کی آنکھوں سے شعلے اور منہ سے گالیوں کی انگارے جھڑنے لگتے ۔۔۔ جب اس پر بھی مولوی چچا برا نہ مانتے تو وہ اور اوچھے ہتھیاروں پر اتر آتیں "اپنی بھنیا کا نکاح کرا ۔۔۔ میاں کا کرا ۔۔۔" واضح رہے کہ یہ بوڑھی کھوسٹ میا بھنیا خود ان کی خالہ اور بہن تھیں ۔۔۔ مولوی صاحب ہنس کر کہتے ۔۔۔ "شرع میں شرم کیا ۔۔۔ وہ بھی کر لیں تو کیا ہرج ہے" ۔۔۔ ان کے آگ ہی لگ جاتی۔ "بے شرم ۔۔۔ بے غیرت ۔۔۔" اور آخری ہتھیار ان کا یہ ہوتا۔ "اچھا تو بلا مولوی ۔۔۔ میں تو تیرے سے نکاح کروں گی ۔۔۔"

وہ ان کو بالکل سگا بھائی سمجھتی تھیں اور اپنے خیال میں اس سے بڑی گالی وہ انھیں نہیں دے سکتی تھیں ۔۔۔ مولوی صاحب گردن نیچے کر کے ہنستے اور اماں سے کہتے "بھاوج ۔۔۔ اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے ۔۔۔"

اور اماں ان کو میٹھی جھڑکی دیتیں ۔۔۔ "کیا ہو گیا ہے تمھیں ۔۔۔ کیوں اسے باؤلی بنا رہے ہو ۔۔۔" اور ایک دم شعلے پانی بن جاتے اور خالہ الو کی آنکھوں سے جھر جھر آنسو بہنے لگتے اور سب دم بخود رہ جاتے تھے ۔۔۔

اور ان خالہ الو نے بیوگی اور بے سہارگی کے پچیس تیس سال اسی آن بان کے ساتھ کاٹ دیے۔

یہ تھی خالہ الو کی ذرا سی جھلک آج سننے میں وہ عجیب و غریب قسم کی

عورت معلوم ہوتی ہیں مگر وہ اس دور کی پیداوار تھیں جب عورت کو جان سے زیادہ آن پیاری ہوتی تھی ——— حیا اور خودداری اس کا زیور اور بدمزاجی اس کے وہ ہتھیار تھے جن سے یہ نہتی بے سہارا عورت اپنی لاج کی حفاظت کرتی تھی اگلے وقتوں کی یہ وہ ہستیاں تھیں جن کی کمزوریوں میں خوبیاں، جن کی سختی میں نرمی چھپی رہتی۔ جن کے افلاس اور مصیبت میں بھی خودداری اور خود اعتمادی کی دولت میسر تھی۔!

یہ سانچے اب ٹوٹ گئے ——— یہ حقیقتیں اب کہانیاں بن گئیں!

وہ رکشا والا

ٹیکسی کشادہ و وسیع سڑکوں پر دوڑ رہی تھی۔ دونوں طرف قدیم و جدید حیدرآباد کی عمارتیں اپنی زبانِ بے زبانی سے داستان پارینہ اور جدید افسانے دونوں کی تفسیر کرتی معلوم ہوتی تھیں۔ دور حُسین ساگر کا پانی آفتاب کی کرنوں سے ہیرے کی کنی کی طرح چمک اٹھتا تھا۔ رنگین پھولوں سے لدے پیڑ اور سرسبز جھاڑیاں آنکھوں کو تراوٹ بخش رہی تھیں، اُن گرد ھ اینڈی بینڈی سیاہ پہاڑیوں کے چھوٹے بڑے پتھر ایک عجیب انوکھی شان سے اپنا توازن قائم کیے ہوئے تھے۔ پیڑوں پر سے کوئل کی کوؤ۔ کو۔ کوؤ، جیسے اس کے دل کے تاروں کو چھیڑ رہی تھی۔ برسات کی پہلی بارش نے بھاگ متی کے بھاگ نگر کی خوبصورتی کو نکھار دیا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا ہے سہ

کہ زمیں ہو گئی ہے سر تا سر   روکشِ سطحِ چرخ مینائی

نیلے آسمان پر دوڑتے سفید و بھورے بادل، ٹھنڈی ہوا کے روح پرور جھونکے ہر ہر چیز — سارا شہر جیسے اسے خوش آمدید کہہ رہا تھا۔ کتنا مختلف تھا آج کا یہ منظر دو سال پہلے کی اس کیفیت سے جب یہی حسین شہر اسے کاٹنے کو دوڑ رہا تھا...... اُف وہ زمانا!

بھوکی پیاسی، جسم پر صرف ایک ملگجی سی ساڑھی پہنے۔ بغیر کسی سامان کے جس وقت

وہ نام پلی اسٹیشن پر اتری تو دنیا اس کی سیاہ تھی۔ بے سوچے سمجھے نکل تو آئی ــــــ مگر اب ہو گا کیا؟ کہاں جائے گی؟ جس بھروسے پر آئی ہے وہ سہارا نہ ملا تو پروفیسر صاحب راضی ہو گئے اور بیوی نہ ہوئیں تو؟ عورتیں اس معاملے میں بہت شکی ہوتی ہیں نا؟ پھر وہ ان کا گھر کیسے ڈھونڈے گی؟ ٹیکسی تو ٹیکسی رکشا تک کے پیسے اس کے پاس نہیں ہیں۔

ہائے یہ اس نے کیا کیا۔ اب تو نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن) کیا کرے؟ چلتے وقت رنج و غصے میں اندھی ہو کر اس نے یہ سب کیوں نہ سوچا تھا۔ گھر میں جھگڑے ہوتے ہی ہیں۔ کیا کوئی ایسی حماقت کرتا ہے؟ اب تو واپس بھی نہیں جا سکتی۔ ٹکٹ کے پیسے ہی نہیں ہیں ــــــ اور واپس گئی بھی تو؟ ماں تو زندہ گاڑ دیں گی کہ کہاں تھی اتنے دن سے۔ باجی طعنے دے دے کر کھائیں گی۔

ہائے جانے کتنی بدنامی ہو رہی ہو گی اور اب اب، اس انجان اتنے بڑے شہر میں۔ وہ اکیلی ناتجربہ کار ــــــ کنواری نوجوان لڑکی۔ یوں بے سہارا ...... کتنے سوال بچھو کی طرح اس کے دماغ میں ڈنک مار رہے تھے ..... کہ ایک کرخت آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی ــــــ بے ٹکٹ ہو، اس نے گھبرا کر نظر اٹھائی۔ ٹی۔ ٹی کھڑا عجیب نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ ایسی نظریں جو اس کے کپڑوں کو چھیدتی جسم کے پار ہوئی جا رہی ہیں۔ وہ کانپ سی گئی ــــــ ٹی ٹی کے ہونٹوں کی مسکراہٹ اور خوفناک ہو گئی۔ "ٹکٹ ٹکٹ" اسے ہوش آگیا۔ غصے میں کانپتے ہاتھوں سے اس نے اپنا چھوٹا سا پرس کھولا۔ ٹکٹ جس پر اس نے اپنی ساری پونجی ختم کر دی تھی۔ اور اب اس پرس میں آٹھ آنے ــــــ ایک قلم ــــــ ایک رومال، دو خط اور ایک نوٹ بک پڑی تھی۔ ٹکٹ اس نے ٹی۔ ٹی کے ہاتھ پر رکھا، غصے میں اسے گھورا اور پیر پٹکتی اسٹیشن سے باہر نکل آئی۔ مگر اب کیا کرے؟ کہاں جائے؟ کیسے جائے؟ اتنے میں ایک رکشا والا اس کے پاس آکر کھڑا ہو گیا "کہاں جانا ماں" اس نے دیکھا سیاہ رنگ، چھوٹا قد، گٹھا ہوا

جسم ۔ چہرے پر ایک عجیب نرمی اور شرافت ! دل نے کہا اس پر اعتبار کیا جاسکتا ہے ۔ وہ خدا کا نام لے کر اس کی رکشا پر بیٹھ گئی اور نوٹ بک میں سے پتا دیکھ کر بڑی مشکل سے اسے سمجھایا ۔ اس کا لب و لہجہ رکشا والے کی سمجھ میں آ ہی نہیں رہا تھا ۔ اس نے تو سنا تھا یہاں ہر ایک اردو بولتا ہے ۔ سمجھتا ہے ۔ مگر یہ کوئی اور اردو ہے شاید !

بنجارہ ہل پر پہنچتے پہنچتے اسے بہت دیر لگ گئی ۔ رکشا چھوٹا نیچا اور بہت تکلیف دہ تھا ۔ مگر خیر ۔۔۔ اب تو وہ منزل پر پہنچنے ہی والی ہے ۔ مگر اس خوبصورت کوٹھی پر پہنچ کر معلوم ہوا کہ گھر پر نہ صاحب ہے نہ بیگم صاحب !

پروفیسر صاحب کہاں ہیں ؟ اس نے ملازم سے پوچھا ۔

کالج گئے ماں ، جواب ملا ۔

اور بیگم صاحب ؟

وہ اسکول گئے اپنے ۔"

بڑی خوشامد سے ملازم سے اس نے بیگم صاحب کے اسکول کا پتا معلوم کیا اور رکشا پھر اس سڑک پر چل پڑا جدھر سے آیا تھا ۔ اسکول پہنچی تو بارہ بجنے والے تھے مگر کسی نے اسے اندر ہی گھسنے نہیں دیا ۔ بڑی خوشامد کے بعد چپراسن اس پر راضی ہوئی کہ اپنا نام لکھ کر دے تو وہ پہنچا دے گی ۔ اس نے نوٹ بک میں سے کاغذ پھاڑا ۔ قلم نکالا اور لکھا " آپا جان ۔ مجھے آپ سے ایک بہت ضروری کام ہے ۔ خدا کے لیے مجھ سے مل لیجیے ۔۔۔ " نام کیا لکھے ۔۔۔ وہ سوچ میں پڑ گئی ۔۔۔ پھر اس نے جو پہلا نام خیال میں آیا لکھ دیا ۔ آپ کی خادمہ " نبّن " اور پروفیسر صاحب کی بیگم کا نام جو اس نے بھائی جان سے سنا تھا لکھا اور چپراسن کو پرچہ دے دیا ۔ پندرہ منٹ انتظار کے ، اسے گھنٹوں سے زیادہ معلوم ہوئے ۔ چپراسن واپس آئی تو اور زیادہ بیزار تھی ۔

" نکو ماں ۔ وہ تمھیں نہیں پہچانتی ہیں ۔"

"مگر بائی جی۔ میں تو جانتی ہوں انھیں۔"

اس نے اپنی دکنی اردو میں جو بھی تقریر کی اس سے وہ بس اتنا سمجھی کہ
——— اس نام کی دو استانیاں اسکول میں ہیں اور دونوں نے انکار کر دیا کہ ہم اس نام کی کسی عورت کو نہیں جانتے اور کہا کہ اس کو واپس کر دو۔ ——— رہی سہی امید بھی ٹوٹ گئی ——— اب وہ کیا کرے ؟ اس پر چپراسن کا یہ کہنا "جاؤ ——— جاؤ ——— اپنے گھر ——— لڑکی لوگاں یوں ماری ماری نہیں پھرتے ۔" اور آس پاس کھڑے اسکول کے چوکیدار اور چپراسیوں کی مسکراہٹ جیسے اس کے دل پر آرے چلانے لگی ———

چلو ——— رکشا والے ——— جلدی چلو۔ رکشا والے نے بھی کچھ بھانپ لیا تھا۔ وہ تیزی سے پھاٹک سے نکل کر سڑک پر آگیا۔

"اب کہاں چلنا ماں" مگر اس نے مڑ کر دیکھا تو لڑکی ہچکوں پہچکوں رو رہی تھی۔" نکوں ماں ——— نکوں ماں ——— روتے نہیں۔" اور پھر جیسے خود ہی اس نے سوچا" اس پہلے والے کوٹھی چلنا نا ماں ———" "ہاں ——— وہیں چلو رکشا والے" اس نے روتے روتے کہا۔ شاید پروفیسر صاحب آگئے ہوں ——— شاید ان کو اس پر رحم آجائے ——— جب رکشا دوبارہ کوٹھی میں داخل ہوئی تو دوپہر ڈھلنی شروع ہو گئی تھی تکان، پریشانی، بھوک اور پیاس سے وہ نیم جان ہوئی جارہی تھی پچھلے تیس گھنٹوں میں اس نے راستے میں صرف دو بار کچھ کھایا تھا۔ ایک بار دو آنے کے بھنے چنے ——— اور دوسری بار کل رات ایک اسٹیشن پر موٹی موٹی ٹکڑیاں بکتی دیکھ کر وہ اپنی جمع پونجی کا ایک حصہ قربان کرنے کے لالچ کو نہ روک سکی تھی۔ اور باقی سارا سفر اسٹیشنوں کا مفت گرم پانی پی پی کر کاٹا تھا۔ جب دوبارہ رکشا کوٹھی میں داخل ہوئی تو ملازموں کے ماتھوں پر بل پڑ گئے۔ یہ کون عورت ہے کیوں بار بار آتی ؟

"میں بیگم صاحب سے ملنا چاہتی ہوں بھائی"۔ خوشامد سے اس نے کہا۔

"بیگم صاحب آرام کرتے ———" رکھائی سے جواب ملا۔

"تو پروفیسر صاحب ہی کو میرا پرچہ دے دو۔"

"صاحب نہیں آئے۔"

"اللہ میں کہاں جاؤں۔" اس نے سوچا اور آنسو بہنے لگے۔ رکشا والا آگے بڑھا اور کسی ان جانی زبان میں جس کا ایک لفظ بھی نہ سمجھ پائی تھی نوکروں سے باتیں کرنے لگا۔ اتنا وہ جانتی تھی کہ ذکر اسی کا ہے۔ ایک طرف سے دو نو عمر بچے کھیلتے ہوئے آئے دو منٹ کھڑے ہو کر ملازموں کی باتیں سنیں اور بھاگتے ہوئے اندر گھس گئے۔ ذرا دیر میں ایک لمبی سی خوبصورت خاتون سوئی ہوئی آنکھوں کے ساتھ بچوں کے ساتھ باہر نکل آئیں۔

"کیا ہے ماں۔"

"بیگم صاحب ——— بڑی دور سے آپ کی تعریف سن کر آئی ہوں۔ مجھے اپنے قدموں میں جگہ دیجیے۔ بیگم صاحب۔" ایک بار اس کی ماں کے پاس ایک عورت آئی تھی تو اس نے یہی جملے کہے تھے اور اماں کا جی پگھل گیا تھا۔ اس وقت وہی جملے اس کے منہ سے نکل گئے۔

"جونم ——— بچاری مصیبت کی ماری لگتی ——— پلیز ——— جونم اسے رکھ لیجیے" ——— خوبصورت نو عمر لڑکی نے ماں سے کہا ——— "ہاں ہاں جونم ——— ہم اسے ضرور رکھیں گے ——— بہت پریشان دکھتی بیچاری ———" اس سے چھوٹے لڑکے نے اور زیادہ زور سے سفارش کی۔

"کیا بولتے بیٹے ——— جانے کون ہے ——— کہاں کی ہے۔" ماں نے شبہ کا اظہار کیا ——— "تمہارے بابا ہوتے تو میں ان سے پوچھتی۔"

"نہیں نہیں جونم ——— اس وقت تو اس کو ٹھہرا ہی لیجیے۔ دیکھیے نا ——— کتنا روتی ہے۔ بیچاری" لڑکی کی اپنی آواز بھرا گئی۔ وہ جلدی سے رکشا سے اتر پڑی!

"رکشا والے۔" اس نے کانپتی آواز سے کہا۔ "میرے پاس بس یہ اٹھنی

ہے ___ مجھے تمھیں کئی روپے دینے چاہیے تھے ___ سارا دن تم نے مصیبت اٹھائی ہے بھیا ___ پر کیا کروں ___ میرے پاس بس یہی ہے ___ "شرم سے وہ نظر نہ اٹھا سکتی تھی ___ رکشا والے نے کہا "نکوں ماں ___ نکو ___ تو خود مصیبت کی ماری دکھتی ہے۔ تیرے پاس تو کچھ نہیں ماں کچھ نہیں ___ " اور وہ خود رونے لگا۔ وہ حیران ہو کر اسے دیکھنے لگی اور رکشا والا آنسو پونچھتا ___ گیٹ سے باہر نکل گیا۔

"ارے لڑکی ___ رکشا کیوں واپس کر دی؟"

"بیگم صاحب ملامت کے لہجے میں کہہ رہی تھیں۔ اس نے دونوں ہاتھ ان کی سمت اٹھائے "میری مدد کیجیے ___ میں ___ میں بہت ___ بھوکی ہوں ___" وہ کہنا چاہتی تھی کہ میں بہت مصیبت زدہ ہوں۔ مگر پیٹ کی مار سب سے بڑی مار ہوتی ہے۔ یہ لفظ بے ارادے اس کے منہ سے نکلے اور ساتھ ہی اسے لگا۔ وہ کہیں نیچے ___ نیچے ___ گرتی جا رہی ہے۔

اُسے ذرا ذرا ہوش آ رہا تھا۔ اس نے دیکھا ایک ادھیڑ عمر کے مہربان صورت مرد اس پر جھکے کہہ رہے ہیں "بی بی لڑکی مصیبت ماری دکھتی ہے۔ ہمیں اس کو پناہ دینی چاہیے۔ ایسا نہ ہو کسی غلط آدمی کے ہاتھ پڑ جائے ___"

"مگر جی۔ جانے کسی مجرم گروہ سے....."

"نانا ___ بی بی ___ ایسی بات نہیں کہتے ___ صورت سے شریف دکھتی ہے"

"خیر جیسے آپ کہیں۔ پر پولیس کو ضرور اطلاع دینا۔ بعد کو کوئی ایسی ویسی بات......"

اس وقت یہ باتیں تیر کی طرح اس کے دل پر لگی تھیں۔ بیگم صاحب سے بڑی بدگمانی پیدا ہوئی تھی۔ مگر بعد میں پروفیسر صاحب سے بھی زیادہ بیگم صاحب ہی نے ان کا خیال کیا۔ بالکل اپنے بچوں کی طرح سمجھتیں، کھانے پینے کا خیال رکھتیں اپنے کپڑے پہننے کو دیے ___ خرچ کے لیے پیسے دیئے ___ تین چار مہینے وہ اسی

طرح اس گھر میں رہی جیسے ان کی کوئی قریبی عزیزہ ہو۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے دونوں مربیّ اس کی بتائی کہانی پر یقین نہیں رکھتے ہیں۔ "میرے ماں سوتیلی ہے!— باپ مرچکا ہے— ماں کے ظلم سہار نہیں سکی آپ کا نام کسی سے سنا تھا— چلی آئی۔" بھلا اتنی دور سے کوئی یوں چلا آتا ہے؟ مگر کیا کرتی کچھ اور سمجھ میں بھی تو نہ آیا تھا۔ مگر اس کی خدمت اور خاموش محبت نے ان کا دل جیت گیا تھا۔ اس نے کئی بار سنا بیگم صاحب سے صاحب نے کہا۔

"بی بی— بنّن کا پتا نشان لگاؤ۔"

"کیا کرنا جی— لڑکی اچھی ہے— کام کی— محبت کی— کیوں اُسے ستائیں۔"

"بی بی مجھے لگتا ہے— میں نے اُسے کہیں دیکھا ہے۔"

"اجی کیا کہنے— وہ ہندستان کی رہنے والی— تم نے اُسے کہاں دیکھا ہوگا—" وہ بے اختیار ہنس پڑی تھی۔ یہاں کے لوگ کس معصومیت سے شمالی ہند کو ہندستان کہتے ہیں۔ جیسے دکن ہندستان میں نہیں کہیں اور ہے۔

ایک دن بیگم صاحب نے اُسے کچھ لکھتے دیکھ لیا۔ "تم کہاں تک پڑھی ہو بنّن۔"

"میں نے میٹرک کا امتحان دیا تھا بیگم صاحب۔"

"پاس ہوگئیں تھیں؟"

وہ ایک دم چپ ہوگئی— اسے اس دن کا سارا منظر یاد آگیا جب اس کے فیل ہونے کا حال سن کر ماں بہن نے سختی سے لعنت ملامت کی تھی۔

"پچھلے سال بھی فیل ہوگئی— تجھے پڑھنا نہیں تو پیسا کیوں برباد کرتی ہے۔" ماں نے کہا تھا۔

"ان کو سیر تفریح سے فرصت ملے تب نا— اپنے چہیتے کو خط لکھنے ہی سے چھٹی نہیں ملتی— کورس کیا پڑھیں گی۔"

بہن نے آگ پر تیل چھڑکا ــــ مانا کہ وہ بہت ذہین اور تیز ہیں۔ ہر سال فرسٹ کلاس آتی ہیں ــــ مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ اسے ذلیل کریں ــــ گھر میں ہمیشہ سبھی نے ــــ اور سب سے زیادہ ان آپا نے اس کے ساتھ ذلت کا برتاؤ کیا تھا۔ بس ایک بھائی جان تھے ــــ جو اُسے چاہتے تھے۔ مگر ہائے اس کی قسمت۔ وہ بھی آج اتنی دور ہیں ــــ اس کی آنکھوں میں آنسو بہتے دیکھ کر بیگم صاحب چپ ہوگئیں۔

کچھ دن بعد کا ذکر ہے وہ رات کو اپنی کوٹھری میں بیٹھی دھیمے بلب کی ناکافی روشنی میں انگریزی کی کتاب پڑھ رہی تھی۔ اس کم بخت انگریزی ہی نے تو اس کی لٹیا ڈبوئی تھی۔ سکینہ بی بی کی کتابوں میں اُسے اپنے کورس کی دو ایک کتابیں مل گئی تھیں۔ اور رات گئے تک وہ ان کو پڑھتی اور انگریزی لکھتی رہتی تھی اس کا اردو انگریزی دونوں کا خط بڑا خوبصورت تھا جیسے موتی ٹکے ہوں! اور اس کی صورت! اُنھ ــــ گھر میں تو کبھی کسی نے اُسے خوبصورت نہ کہا تھا۔ کالی۔ کلو اسی کا لقب تھا۔ مگر یہاں! یہاں تو سبھی کہتے "کتنی پیاری دکھتی دلہن ــــ" کیسے تیکھے نقش ہیں اس کے" سکینہ بی بی کو اس کی آنکھیں بہت پسند تھیں اور الو میاں اس کے چھوٹے چھوٹے گھونگھریالے بالوں کی تعریف کیا کرتے تھے۔ بیگم صاحب کہتیں دلہن میں بڑا نمک ہے۔ پروفیسر صاحب ہنس کر اس کی طرف دیکھتے" اور چارم بھی" وہ شرما جاتی اور جب موقع ملتا بیگم صاحب کے بیڈروم کی سنگار میز کے سامنے جا کر کھڑی ہو جاتی۔ ہائے اللہ۔ اس کے تین تین لمبے شیشوں میں سے وہ ہر زاویہ، ہر طرف سے اپنے کو کتنی اچھی طرح سے دیکھ سکتی تھی! پہلی بار اُسے یقین آیا تھا۔ کہ سلیم سچ مچ اس کو پسند کرتا تھا نہیں تو ــــ اس نے ہمیشہ یہی سوچا کہ خواہ مخواہ مجھے بنایا جا رہا ہے ــــ مگر اب ــــ اب اُسے کبھی سلیم سے ملنے کا موقع ملے گا تو۔ مگر وہ اب اُسے قبول کرے گا؟ اب تو شاید صورت سے نفرت ہو گئی ہو! ہائے اللہ جانے لوگ کیا کیا کہتے ہوں گے۔ جب بھی وہ پڑھنے بیٹھتی یہ خیالات اس کو گھیر لیتے۔ اس وقت بھی وہ کچھ جاگتے

کچھ سونے انھیں باتوں میں الجھی ہوئی تھی کہ دروازے پر آہٹ ہوئی اس نے گھبرا کر نظر اٹھائی ___ پروفیسر صاحب ریشمی ڈریسنگ گاؤن پہنے ہوئے سامنے کھڑے عجیب نظروں سے اُسے دیکھ رہے تھے۔ ہونٹوں پر ایک نرالا تبسم ہے ___ زمین و آسمان گول گول چکر کھانے لگے۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا آگیا۔

"تو ___ وہ ___ وہ ___ اس دن ___ جو ___ جو ___ پڑوسن لڑکی۔ اس سے کہہ رہی تھی کہ ___ کہ ___ یہ مہربانیاں ٹھیک نہیں۔ ذرا اپنے پروفیسر سے ___ ہوشیار ___ ہوشیار رہنا ___ تو کیا ___ تو کیا ___؟" بے اختیار اس کا ہاتھ بلند ہوا جیسے کسی وار کو روک رہی ہو۔" نہیں ___ نہیں ___ نہیں" گھٹی ہوئی چیخ اس کے منہ سے نکلی۔

ارے ارے ___ مبن ___ تمھیں کیا ہوا ہے ___ ڈر کیوں رہی ہو ___ میں ہوں ___ میں ___" شیریں لہجے میں پروفیسر صاحب کہہ رہے تھے۔

"آپ ___ آپ ___ یہاں ___ اس وقت ___ چلے جائیے ___ چلے جائیے ___ پروفیسر صاحب ___ آپ میرے ___ میرے باپ کی جگہ ہیں ___"

اس کی آواز سسکیوں میں گھٹ کر رہ گئی!

"وہ تو ہوں ہی بیٹی ___ مگر تجھے کیا ہو گیا ہے آج ___"

"تم بھی تو بس ___ آدھی رات کو پوچھنے چلے آئے ___ ڈرے گی نہیں تو اور کیا۔" پیچھے کھڑی بیگم صاحب کی آواز اس کے کھوئے ہوئے حواس واپس لے آئی اپنی بدگمانی اور معاملات پر وہ ندامت سے زمین میں گڑی جا رہی تھی۔

پروفیسر صاحب نے آگے بڑھ کر ایک گروپ فوٹو اس کے سامنے رکھ دیا۔

"اس میں سے کسی کو پہچانتی ہو؟"

مگر اس کی ہمت ہی نہ تھی کہ نظر اٹھائے، زبان کھولے۔

اندھیرا ہے جی ___" اور پروفیسر صاحب کی ٹارچ کی روشنی پہلے اس کے چہرے اور پھر تصویر پر پڑی ___ گروپ فوٹو کی ایک تصویر پر انھوں نے

انگلی رکھی — "اسے جانتی ہو!"

"میرے بھائی جان —" بے اختیار اس کے منہ سے نکلا اور اس نے تصویر اٹھا کر کلیجے سے لگالی اور آنکھوں سے برکھا ہونے لگی۔

"میں نے کہا تھا نا بی بی — کہ اس لڑکی کو میں نے دیکھا ہے — اصل میں یہ بالکل نسیم کی صورت ہے۔" پروفیسر صاحب نے ہنس کر کہا "یہ فوٹو تم رکھ سکتی ہو —" بی بی کا ہاتھ پکڑ کر باہر چلے گئے اور وہ گم سم حیران پریشان ساری رات بیٹھی رہی!

اسے خیال تھا کہ اگلے دن اس سے پوچھ گچھ ہوگی اور آخر اُسے اپنا سچا حال سنانا پڑے گا مگر وہ دونوں بالکل انجان بن گئے۔

بیگم صاحب نے اُسے اپنے اسکول کی اسپیشل کلاس میں داخل کرا دیا تھا اب وہ اس کی بھی جو تم تھیں اور پروفیسر صاحب بابا — یہ راز کھلنے کے بعد کہ وہ ان کے شاگرد محمد نسیم کی بہن ہے۔ دونوں ہی اس سے اپنے بچوں کا سا ہی سلوک کرنے لگے تھے۔

کچھ دن اور گزر گئے۔ ایک دن وہ اسکول سے واپس آئی تو دیکھا برآمدے میں پروفیسر صاحب کے برابر کرسی پر ایک نوجوان بیٹھا ہے، سانولا رنگ، پتلی ناک، چوڑی پیشانی، گداز ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ اور سیاہ آنکھوں میں آنسوؤں کی دمک۔ اُسے دیکھ کر وہ کھڑا ہو گیا۔" ارے..... ہے...... یہ کون —!"

اور دوسرے ہی لمحہ بھائی بہن ایک دوسرے سے لپٹے محبت کے مسرت کے آنسو بہا رہے تھے۔

بھائی جان ہی نے پروفیسر صاحب کو اس کی کہانی سنائی۔

"مہرو ہمارے گھر میں سب سے چھوٹی ہے۔ یہ میری اور ابا کی جتنی لاڈلی تھی اتنی ہی اماں اور بڑی بہن اس سے خفا رہتیں۔ دراصل ہمارے لاڈ پیار نے

اسے گستاخ اور ضدی بنا دیا تھا۔"

"ہاں بہن تو سوتیلی ہیں نا؟" بیگم صاحب نے مسکرا کر اُسے دیکھا اس کا سر شرم سے جھک گیا۔

"ہیں تو سگی ہی۔ مگر اس نے سوتیلا ہی سمجھا۔۔۔ اُن کا سلوک ہی اس سے ایسا ہی تھا۔ ابا کے انتقال کے بعد سے اس کے ذہن کی ایسی حالت ہو گئی کہ پڑھنے لکھنے کی طرف سے بالکل جی اچاٹ ہو گیا۔۔۔ پروفیسر صاحب۔ میرے چچا اس زمانے میں یہاں تھے جب میں عثمانیہ میں پڑھتا تھا۔ اسی لیے یہاں آ گیا تھا میں۔ اس وقت یہ بہت چھوٹی تھی مگر مجھ سے آپ کا اور بیگم صاحب کا ذکر بڑے شوق سے سنتی۔۔۔ کھود کھود کر سب کا حال پوچھتی اور حیدرآباد دیکھنے اور آپ سے ملنے کے لیے بیقرار رہتی۔ مگر اماں کبھی راضی نہ ہوئیں کہ میں اسے یہاں لاتا۔"

"تو حیدرآباد دیکھنے کے شوق میں گھر سے بھاگی" بیگم صاحب نے بات کاٹی۔ یہ میٹرک میں فیل ہو گئی اماں کا کہنا ہے کہ انھوں نے ذرا سی تنبیہہ کی بہن سے شاید اس کی لڑائی بھی ہوئی۔ اور اگلے دن یہ گھر سے غائب تھی۔ وہ لوگ تو رو پیٹ کر بیٹھ رہی تھیں کہ سب کو یقین تھا کہ اس نے خودکشی کر لی ہوگی۔ آپ کا خط کئی ہفتے اِدھر اُدھر بھٹکنے کے بعد بمبئی مجھے ملا تو میں اماں کو اطلاع دے کر سیدھا بھاگا آیا ہوں۔۔۔ یہاں۔ اس گدھی کو لینے۔"

وہ بلک بلک کر رونے لگی "میں اماں کے پاس نہ جاؤں گی۔"

"پاگل ہوئی ہے۔۔۔ اماں تیرے غم میں نیم جان ہو گئی ہیں۔ بچاری اور وہ احمق سلیم۔۔۔ جوگ لیے بیٹھا ہے۔" اس نے بھائی جان کی گود میں سر چھپا لیا۔ دل دھڑک رہا تھا۔ جانے کیا ہو؟

اور اب دو برس بعد وہ سلیم اور اپنے سال بھر کے بچے کو لے کر اپنے محسنوں کا شکریہ ادا کرنے دوبارہ حیدرآباد آئی تھی۔ ٹیکسی کوٹھی کے دروازے میں

داخل ہوئی اور گھر، باغ، لان ہر ایک چیز اُسے اپنی اور کھینچ رہی تھی۔ یہ کوٹھری ہے جس میں وہ رات گئے تک پڑھا کرتی تھی۔ یہ جونم کا بیڈ روم ہے جس کے شیشے میں وہ اپنے آپ کو دیکھتی رہتی تھی۔ یہ "بابا کی اسٹڈی ہے جہاں وہ دن بھر لکھا پڑھا کرتے تھے۔ یہ سکینہ بی بی اور رالو میاں کا کمرہ جن کے ساتھ کیرم اور تاش کھیلا کرتی....

"ارے سو گئیں کیا۔ اترو نا" سلیم محبت سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

سامنے ہی کچن سے بیگم صاحب نکلیں۔

"میری جونم" مسرت سے چیخ کر اس نے کہا اور بیگم صاحب سے لپٹ گئی اس سے پہلے وہ کبھی ان سے اس بے تکلفی اور اپنائیت سے لپٹ نہ سکی تھی۔ ایک جھجک، ایک رکاوٹ۔ ان کے درمیان رہتی تھی۔

"اجی سنتے ہو —— ہماری نبن آئی ہے"

سلیم نے حیران ہو کر اُسے دیکھا۔ یہ نبن کون ہے؟ مگر اس نے مسکرا کر نظریں پھرا لیں۔ پروفیسر صاحب اپنی اسٹڈی سے نکلے تو پہلی نظر میں وہ ان کو پہچان نہ سکی۔ ان کے خوبصورت شاندار چہرے پر لمبی سی داڑھی نے انھیں ٹیگور سے مشابہ کر دیا تھا۔

"تسلیم بابا" اس نے سر جھکا کر کہا اور اپنے بچے کو ان کے قدموں کی طرف جھکا دیا۔ "قدم چوم میرے بابا کے" اور انھوں نے دونوں کو پیار سے گلے لگا لیا۔

"اور یہ —— یہ ہیں۔"

"اس کا دولہا ہے جی۔" بیگم صاحب نے کہا اور سب ہنس پڑے۔ دونوں کی خوب خاطر مدارات ہوئی چلتے وقت بچے کو روپے اور اُسے ساڑی ملی۔ اور رخصت ہوتے وقت اُسے لگا وہ اپنے ماں باپ سے مل کر آئی ہے اس کے اپنے چاہنے والے ابا جنت کو سدھار چکے تھے اور ماں کا پیار تو اُسے کبھی نصیب ہی نہ ہو سکا تھا۔

اپنے محسنوں سے مل کر ان کا شکریہ ادا کر کے وہ کتنی خوش تھی۔ شکریہ جس نے الفاظ کا روپ نہ دھارا تھا وہ احساسِ احسان مندی جو لفظوں کا بار نہیں اٹھا سکتا۔ وہ جذبہ جو صرف اپنے محسن کو ایک نظر دیکھ کر آنکھوں کی زبان، چہرے کی حالت اور دل سے ابلنے والی کیفیت ظاہر ہوتی ہے! کچھ ایسا ہی حال ہوا تھا اس کا اپنے بابا اور جونم سے مل کر۔ مگر اب بھی اس کے دل میں ایک کانٹا ایک خلش تھی۔ اُسے ابھی اپنے سب سے بڑے محسن کا شکریہ ادا کرنا ہے۔ اس دن اس نے اس کی مدد نہ کی ہوتی۔ اتنی بڑی قربانی نہ دی ہوتی تو اس کا کیا انجام ہوتا۔ یہ سوچ کر آج بھی وہ ساری جان سے کانپ جاتی تھی۔! یہ دونوں بزرگ بھی ضرور اس کے محسن ہیں۔ مگر وہ رکشا والا۔ اس کا احسان بہت بڑا تھا۔ وہ غریب بے مایہ انسان جس کے گھر میں شاید اس رات چولھا نہ جلا ہو کہ اس نے ایک بے سہارا لڑکی کی مدد کی تھی۔ شاید اس رات اس کے بچے روتے روتے بھوکے سو گئے ہوں گے شاید اُسے اپنی بیوی کی گالیاں کھانی پڑی ہوں گی! کتنا مہان تھا وہ۔ اس کی زبان نہیں جانتا تھا۔ اس کا ہم مذہب نہ تھا........ صرف ایک انسانیت کا رشتہ تھا ان دونوں کے درمیان جا رہ پانچ گھنٹے تیز دھوپ میں وہ اُسے لادے لادے حیدر آباد کی سڑکیں ناپتا رہا۔ اس کی کمزور پتلی ٹانگیں پیڈل پر گردش کرتی رہیں، خاک آلودہ بالوں سے سیاہ ماتھے پر پسینہ بہتا رہا۔ پھٹی قمیص چمکدار کالی چمڑی پر چپک گئی۔ سانس دھونکنی کی طرح چلتا رہا۔ اس دن وہ اپنی مصیبت کے احساس میں اتنی مبتلا تھی کہ ان باتوں کی طرف زیادہ دھیان نہ دے سکی تھی۔ آج جیسے یہ سارا منظر اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ اور پھر اس کا وہ آنسوؤں سے بھیگا چہرہ۔ اور درد میں بھرائی آواز۔ نکوں ماں ــــ نکوں ماں تو آپ دکھیا دکھتی ہے۔ تیرے پاس کچھ نہیں ماں" آہ وہ انسانیت کے نور سے چمکتا چہرہ، وہ منہ سے نکلے پُر خلوص میٹھے بول! کیا زندگی بھر وہ انھیں بھول سکے گی!

اس چار دن میں کہاں کہاں اس نے اپنے محسن کو تلاش نہ کیا تھا۔ سیر و تفریح کے بہانے ہر خوبصورت جگہ پر رکشاؤں کے اڈے جا جا کر دیکھے تھے۔ ہر شاپنگ سنٹر پر خریداری کا شوق ظاہر کر کے گئی تھی، کتنے اسکول اور کالجوں کے پھاٹکوں پر اُسے ڈھونڈا تھا مگر وہ کہیں بھی تو نہیں ملا۔ اور اب وہ مایوس ہو کر سکندر آباد اسٹیشن کے سامنے کھڑی تھی۔ میاں بچے کو اور سامان کو لے کر اندر جا چکا تھا۔ آج وہ واپس چلی جائے گی اور پھر شاید — کبھی — کبھی بھی اس کے درشن نہ ہوں گے!

"ماں کہاں جانا —" ایک آشنا آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ وہ پلٹی — سامنے اس کا مرکزِ آرزو کھڑا تھا۔ اور نہ زیادہ دبلا اور نہ زیادہ سیاہ۔ چہرے پر دکھ کی وہی پرچھائیاں" آنکھوں کے گرد بھوک اور محنت کے گہرے حلقے۔ مگر آنکھوں میں قناعت اور رحم دلی کی وہی چمک آواز میں وہی گرمی اور گھلاوٹ!

"ارے تم —" بے خودی میں اس نے بڑھ کر رکشا والے کا ہاتھ تھام لیا۔

"کیا بولے ماں — کہاں جانا۔ کتنے لوگاں ہیں؟" رکشا والے نے حیران ہو کر پوچھا اور ہاتھ چھڑا لیا وہ اپنی جلد بازی اور جذباتیت پر شرمندہ سی ہو گئی۔

"بابا — تمہیں یاد ہے نا — تین سال پہلے نام پلی اسٹیشن سے تم ایک لڑکی کو لائے تھے؟"

رکشا والے نے کچھ اس انداز سے اُسے دیکھا جیسے پاگل سمجھ رہا ہو۔ روز ہی ہزاروں سواریاں لاتا لیجاتا ہوں اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے۔

"بابا تم نے اُسے کئی گھنٹے! ایک کوٹھی اور اسکول کے بیچ میں گھمایا تھا۔ یاد ہے نا رکشا والے کی آنکھوں میں کچھ چمک سی آئی" اور بابا — تم نے اس سے کرایہ نہیں لیا تھا۔ اس کے پاس کچھ تھا ہی نہیں۔ تم نے کہا تھا۔ تم مصیبت زدہ ہو۔ تمہارے پاس خود کچھ نہیں ہے۔ میں تم سے کچھ نہیں لیتا۔ وہ یہ بھول گئی کہ رکشا والا دس بیس جملے دکنی اردو کے تو بول اور سمجھ سکتا ہے۔ مگر اس کی فصیح اردو اس کے پلے نہیں

پڑ رہی! پھر بھی وہ اُسے پہچان ضرور گیا۔ اس کے سفید دانت یوں چمکے جیسے سیاہ بادلوں میں بجلی تڑپ جائے۔

"ماں تم وہی لڑکی۔"

ہاں بابا۔ ہاں۔۔۔ میں تمہاری قرض دار ہوں بابا۔"

"نکو ماں۔۔۔ نکو۔"

"بابا تم کیسے ہو۔۔۔ تمہارے بال بچے کیسے ہیں"۔ اس کا جی چاہ رہا تھا وہ اس سے خوب باتیں کرے۔ اس کے گھر کی خاندان کی۔ گاڑی چھوٹ جائے گی اس کا اسے احساس ہی نہ رہا تھا۔

بچے۔۔۔ آہ۔۔۔ بچے"۔ ایک سرد آہ اس کا کلیجہ چیر کر نکل گئی!

"بچے لوگاں۔۔ بیمار ہے ماں۔"

"بابا میں تمہارا احسان زندگی بھر نہیں چکا سکوں گی۔ اس دن تم نے مجھ پر رحم نہ کھایا ہوتا تو جانے میرا کیا انجام ہوتا۔۔۔ بابا۔ یہ کرایہ قبول کرو۔ مگر میں تمہارے"۔ وفورِ جذبات سے اس کا گلا رندھ گیا۔۔۔ پرس سے اس نے سو کا ایک نوٹ نکالا اور بڑے پیار، بڑے احترام سے دونوں ہاتھوں پر رکھ کر اُسے پیش کیا۔۔۔ اسے قبول کرو بابا۔۔۔" رکشا والا چونک کر ایسے پیچھے ہٹا جیسے کسی نے اُسے گالی دے دی ہو۔ "بابا۔ یہ تمہارے بچوں کے لیے۔۔۔۔۔

اس نے نوٹ اسی کے ہاتھ میں ٹھونسنا چاہا۔ "نکو ماں۔۔۔ نکو۔۔۔"

اور رکشا والے نے مہرو سے اپنا ہاتھ چھڑایا سائیکل پر بیٹھا اور بالکل اسی طرح جیسے دو سال پہلے کیا تھا، تیز تیز چلتا یہ جا۔۔۔ وہ جا۔۔۔ وہ مبہوت کھڑی اس معمولی رکشا والے کو دیکھتی رہی یہاں تک کہ سامنے سڑک کے موڑ پر وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

بس دو شفاف موتی اس عظیم انسان کی یاد کی نذر کر سکی جو آنکھوں سے ڈھلک کر پلکوں میں جذب ہو گئے۔

دکھ سکھ کا میلا

اف! کتنی تکان۔

دماغ کتنا الجھا ہوا۔

ذہن منتشر۔

دل پریشان۔

خود بدحواس۔

ہر چیز رکھ کر بھول جاتی۔ دوائیں خریدنے جاتی تو کبھی ٹیکسی یا بس والے کو ایک کی جگہ دس کا اور کبھی کیمسٹ کو دس کی جگہ سو کا نوٹ بخش آتی اور پھر گھنٹوں حساب کتاب میں سر کھپاتی کہ روپے ہوئے کیا۔ خدا بھلا کرے نوٹوں کے سائز بدلنے والوں کا جس سے بے ایمانوں کو فائدے پہنچتے ہیں۔ اور غریب خریدار مارے جاتے ہیں۔ یہ محدود آمدنی اور لامحدود خرچہ! یہ بے پناہ گرانی جو ہر ماہ بڑھتی ہی جاتی ہے، یہ گرتی ہوئی صحتیں!! اُف وہ سوچ سوچ کر پاگل ہو جاتی۔ "مفلسی میں آٹا گیلا"۔ ایسے ہی موقع پر کسی دل جلی گھروالی کے منہ سے نکلا تھا۔

اعصاب تنے ہوئے، بلڈ پریشر بڑھا ہوا، بھوک غائب، نیند تو ہمیشہ ہی سے کم آتی تھی! یہ حال رہا تو اپنے مریض کی تیمار داری کیسے کر پائے گی؟ یہ فکر اور اُسے پریشان کیے رہتی تھی۔

"خیر خدا کا شکر و احسان ہے یہ وقت بھی کٹ گیا۔"

اس نے سکونِ قلب کے ساتھ سوچا۔

دن چڑھ چکا تھا۔ مریض کو ڈسچارج کرنے کی کارروائی میں حسبِ دستور دیر ہو رہی تھی۔ ہمارے ہاں ہر جگہ کتنی بے عملی، اور لاعلمی، کتنی غیر ذمہ داری اور بے اصولی ہے، اس کا تجربہ قدم قدم پر ہوتا رہتا ہے۔ کوئی نئی بات نہ تھی آج۔ مگر اس وقت ایک ایک پل گراں گزر رہا تھا۔ کہیں جلدی سے یہاں سے وہ اپنے مریض۔ (خدا نہ کرے اب تو وہ تندرست ہے) کو لے کر یہاں سے روانہ ہو۔

دن چڑھ چکا تھا۔ سب سامان باندھ کر رکھ دیا گیا تھا۔ اب وہ بے کار کھڑی اندر سے باہر اور باہر سے اندر آنے جانے والوں کے لامتناہی سلسلے کو کھڑکی کے سامنے سے گزرتے دیکھ رہی تھی! نوجوان لڑکے، ادھیڑ مرد، بوڑھی اور جوان عورتیں، بعض کم عمر بچے تک ہاتھوں میں کچھ تھیلے یا ناشتہ دان یا ٹوکری لٹکائے تیز تیز آتے، دربان کی خوشامد کر کے اندر چلے جاتے یا پھر اپنی پونجی اُس کے سپرد کرتے اور اسی تیزی سے واپس بھاگتے ـــــ صبح کو آنے والے یہ لوگ ان غریب کم حیثیت مریضوں کے رشتہ دار یا دوست ہیں جو جنرل وارڈ میں داخل ہیں ـــــ اس وقت وہ ان کے پاس نہیں جا سکتے۔ صرف کھانے پینے کا سامان پہنچا سکتے ہیں۔ ہاں پرائیوٹ وارڈ کے مریضوں کے پاس اس وقت بھی جایا جا سکتا ہے (بلکہ ہر وقت جایا جا سکتا ہے، بشرطیکہ آنے والے کا لباس بڑھیا ہو، کار یا ٹیکسی میں آیا ہو، اور دربان پر رعب گانٹھ سکتا ہو) بڑی بڑی کاریں بھی چلی آ رہی ہیں ـــ ان میں سے بھاری بھاری ہاٹ کیس والے ناشتہ دان اکثیری ٹوکریاں پھلوں سے لدی ہوئی کبھی کبھار کچھ پھول اور کتابیں بھی (اگرچہ یہ چیزیں شاذ و نادر ہی اُسے نظر آئیں) اتار کر مریضوں کے پاس لے جائی جاتی ہیں۔ جنرل وارڈ والوں کے ہمدرد بدحواسی کے عالم میں آتے اور واپس بھاگتے ہیں کہیں بس نہ چھوٹ جائے ـــــــــــــ کہیں دفتر میں دیر

نہ ہو جائے، کہیں مل مالک اور دکان کا مالک نکال نہ دے . . .

اور شام کے سمے ایک میلہ سا لگتا تھا وہاں۔ سینکڑوں مرد عورت اور بچے ہر عمر، ہر قد و قامت، ہر لباس، ہر حیثیت کے چلے آرہے ہیں۔ پیدل بسوں میں سائیکلوں پر، اسکوٹر میں، رکشا اسکوٹر پر ٹیکسی میں، اور نئی چمکتی کاروں میں کچھ ہنستے بولتے بے فکری سے باتیں کرتے چلے آرہے ہیں۔ ضرور ان کے مریض اچھے ہو رہے ہیں۔ کچھ خاموش، اور اداس چہرے پر شکنیں لیے ہیں۔ مریض کی حالت نازک ہے شاید . . . . اور کبھی کبھی ایک روتا پیٹتا کنبہ یا فرد اس کو لرزا دیتا۔ ان کا پیارا داغ جدائی دے گیا۔

دکھ سکھ کے اس میلے میں کیا کیا ہنگامے چند دن میں دیکھ ڈالے — جو کبھی اس کی پریشانی کے احساس کو دگنا کر دیتے — اور کبھی اپنی پریشانی ان بے پناہ دکھوں اور لاعلاج بیماریوں کے سامنے بالکل ہیچ محسوس ہوتی!

اس دن جب اس کا مریض آپریشن تھیٹر میں تھا وہ کتنی پریشان تھی کمرے سے تھیٹر اور تھیٹر سے کمرے تک کے خدا جانے کتنے چکر اس نے کر ڈالے تھے. . . . . ڈاکٹروں نے اطمینان دلایا تھا، خود اس کا مریض ہنستا ہوا اسے تسلی دیتا ہوا آپریشن کے لیے اندر گیا تھا۔ آپریشن ضرور کامیاب ہو جائے گا۔ وہ ضرور تندرست ہو جائے گا۔ . . . . مگر . . . . اگر . . . .

اور یہ "اگر مگر" بجلی کے برمے کی طرح دماغ میں اندر ہی اندر گھسا چلا جا رہا تھا — گھڑی کی سوئیاں جیسے تھم گئی تھیں۔ ان کی سست رفتاری اور ذہن کی تیز رفتاری دونوں ہی اس کے لیے صبر آزما تھیں۔ گھڑی کی سوئیوں نے ابھی گھنٹے بھر کی مسافت بھی طے نہ کی تھی اور وہ کرب کی ایک صدی بتا چکی تھی۔!!

وہ اسی سوچ کی حالت میں کھڑکی میں کھڑی تھی کہ . . . . .

ہائے راجو — میرے لال — میرے بچے — راجو — راجو —" اس نے گھبرا کر نظر اٹھائی۔ دو مزدور عورتیں بلکتی چلی آرہی تھیں — ہاتھوں میں

اب تک مٹی گارا بھرا ہوا تھا۔ جیسے خبر ملتے ہی دوڑی چلی آئی ہوں۔ ایک نے دوسری سے سامنے کی طرف اشارہ کیا، دوسری نے بے ساختہ اپنے دونوں زانو کھڑے پیٹ ڈالے" ہائے راجو۔ راجو تو وہاں ہے۔ مردہ" غم میں شدت تھی۔ تصنع نام کو نہ تھا۔ بے ساختہ۔ بے پناہ جان لیوا غم۔

دونوں رخساروں پر بہتی ندیوں سے بے خبر دربان کے پاس پہنچیں۔ کچھ پوچھا، جواب کی کرخت آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی "ہم نہیں جانتے۔ ادھر جاؤ مردہ خانے......" اف وردی پہن کر آدمی اتنا بے حس اور بے درد کیوں ہو جاتا ہے؟ یہ لوگ بھی ایک دوسرے کا دکھ درد نہ سمجھیں گے تو پھر اور کون.... وہ ان سے ملنے آگے بڑھی۔ مگر وہ تیز تیز دوسری بلڈنگ کی پشت کی طرف جارہی تھیں.....

کتنی عجیب جگہ ہے۔ سچ مچ دکھ سکھ کا میلہ! لوگوں کو صحت و زندگی کی بے بہا نعمتیں بھی ملتی ہیں۔ اور ابدی نیند اور روح فرسا جدائی بھی! ڈاکٹر ہمہ وقت ہمہ تن، مریضوں کا علاج اور خدمت کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ نرسیں بھی تیمارداری کے فرائض جیسے تیسے انجام دیتی رہتی ہیں۔ مگر دنیا میں اتنا دکھ، اتنی بیماریاں بیماریوں کے اتنے اسباب، بیمار لوگوں کی اتنی کثرت، تیمارداروں کی اتنی بہتات اور اتنی مفلسی!! اُف کوئی کیسے ان سب سے نپٹ سکتا ہے۔ پھر بھی یہ سب لوگ مریضوں کو شفا دینے کے کٹھن کام میں، کس تندہی، کس بے غرضی سے دن رات لگے رہتے ہیں۔ اس کے دل پر اس بات کا گہرا اثر تھا....

پھر بھی تقریباً روز اُسے ایک نہ ایک موت سے دوچار ہونا پڑتا تھا ان میں سے کئی منظر تو اس کے ذہن پر نقش ہو کر رہ گئے تھے!

یہاں آنے کے اگلے دن وہ صبح سویرے کمرے کی صفائی وغیرہ کر کے باہر گیلری میں نکلی تو سامنے گیلے ٹھنڈے لان پر متوسط طبقہ کی پندرہ بیس پنجابی عورتیں باقاعدے دوزانو بیٹھی زانوں اور سینہ پر بالکل اسی انداز سے

دو ہتڑ مار رہی تھیں جیسے اودھ کے بعض حصوں میں محرم میں ماتم کیا جاتا ہے
ذاتی غم کا اس طرح کا اظہار اس سے پہلے اس نے نہ دیکھا تھا۔ جانے بچاریوں
کا کون مر گیا ——— دو ایک آدمیوں سے اس نے پوچھا مگر کسی کو پتا نہ تھا۔

اور پھر عورتیں آتی رہیں، اور بوسہ دینے اور لینے کا یہی انداز
وہ دیکھتی رہی۔ ذرا دیر کو خاموشی ہوتی، پھر ماتم و گریہ کا طوفان بپا ہو جاتا
——— کسی وقت ماتم داروں کے حلقوں میں کوکھ اُجڑی ماں اور بد نصیب
باپ اپنی لٹی پونجی لے کر چلے گئے۔

سامنے پھر وہی بچہ ——— اپنے باپ سے کشتی لڑتا نظر آرہا ہے! جانے
یہ اچھا ہوگا کہ نہیں! جس دن وہ آئی صبح ہی صبح ایک بچے کے چلّانے کی آوازیں
سن کر برآمدے میں نکل آئی۔ ایک ادھیڑ دیہاتی آدمی دس بارہ برس کے
لڑکے کو اپنی طرف گھسیٹ رہا تھا، اور بچہ اُسے اپنی سمت! بہت سے
لوگ کھڑے ہنس رہے تھے.... وہ آگے بڑھی۔

"کیا بات ہے بڑے صاحب اسے کیا تکلیف ہے؟"

"بھگوان جانے بہن جی میرے بیٹے کو کیا ہو گیا ہے۔ گاؤں میں سب
کہتے تھے بھوت پربت کا سایہ ہے۔ بہت جھاڑ پھونک کرائی۔ پھر سب نے
کہا شہر لے جاؤ۔ اب پندرہ دن سے یہاں پڑا ہوں۔ ڈاکٹر لوگ روج
روج موائنے (معائنے) کر رہے ہیں....."

"اسے کیا بیماری ہے آخر...."

"بس اچھی بھلی باتیں کرتے کرتے بادلوں کی طرح یوں ہنسنے لگے ہے۔ یا باہر
بھاگے ہے۔ پکڑو تو کشتی لڑے ہے۔ پھر رونے لگے ہے۔"

"بچہ باپ کے ہاتھ چھڑانے کی کوشش میں ناکام ہو کر اس کا منہ چڑا رہا تھا۔
"اس کی ماں بڑی پریشان ہوگی" عورت تھی نا، فوراً ماں کا خیال آیا۔
"اجی ماں ہی تو مر گئی ہے اس کی ——— پہلے بہت روئے تھا۔ جب سے میری

دوسری لگائی گھر میں آئی۔ بس تبھی سے .... "

بچے کے چہرے پر نفرت اور خوف کی پرچھائیاں ابھریں اور وہ جھٹکہ دے کر یہ جا وہ جا ــــ باپ اور ایک نرس اس کے پیچھے بھاگے ....

اور کچھ دیر بعد کیرالہ کی سیاہ فام نرم مزاج نرس اس کا ہاتھ پکڑے چلی آرہی تھی اور بچہ اس کے چہرے کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھتا اور گاتا آرہا تھا۔

گوری دھیرے چلو ــــ گوری دھیرے چلو ــــ گگری چھلک نہ جائے ....

ایک دن وہ گھر جانے کے لیے باہر نکلی تو بڑے گیٹ کے سامنے کئی لمبی لمبی قیمتی کاریں آکر رکیں .... بہت سے لوگ ان میں سے اترے قیمتی سوٹوں میں ملبوس۔ باوقار مرد، شوخ رنگ کی تنگ، پتلون اور ڈھیلے کارڈیگن پہنے، اونچے بال بنائے نوجوان لڑکے ــــ مدراسی اور مبسوری خواتین اور تنگ پاجاموں، ڈھیلے کرتوں اور کئی منزل اونچے عجیب عجیب طرز کے گھونسلے اور ہنڈیاں بنائے لڑکیاں .... مردوں کے چہرے پر فکر کی شکنیں اور غم کا سایہ تھا۔ عورتیں ننھے ننھے ریشمی رومالوں سے آنسو پونچھ رہی تھیں، لڑکیاں بھی آنسو پونچھ لیتیں کبھی پرس میں لگے آئینے میں پنسل سے بنی بھویں اور لپ اسٹک سے رنگے ہونٹوں کا جائزہ لینے لگتیں۔

وہ کھڑی رہ گئی! یہ تو ظاہر تھا کہ ان کا کوئی عزیز فوت ہوگیا ہے۔ مگر یہ سب اونچے طبقے کے باوقار اور باوضع لوگ تھے۔ مغربی تہذیب کے علمبردار جن کو غم میں بھی اپنی DIGNITY اپنے وقار کا پاس تھا۔ ان کا ہر انداز کہہ رہا تھا کہ جو بھی صدمہ ہے اس نے ان کے ذہن کو جھٹکہ ضرور دیا ہے۔ مگر دل کے تاروں کو نہیں چھیڑا ــــ کیا زیادہ دولت اور سطحی تہذیب

انسانی جذبات کو کچل ڈالتی ہے۔ یہ لباس، یہ میک اپ، جوڑوں کو سنوارنے کا یہ انداز، کیا گہرے غم میں ممکن ہے!

اور پھر اچانک تیزی سے ایک گاڑی آئی اور اسی کے قریب آکر رک گئی۔ ایک بوڑھی باوقار خاتون جس کا سفید لباس ملا دلا اور کھچڑی بال بکھرے ہوئے تھے، ایک پینتیس سال کی خوبصورت عورت اپنے لباس، ہر حالت سب سے بے خبر، ایک چھوٹی بچی کو گود میں لیے پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ آنکھیں پھٹی ہوئی، لب کانپتے ہوئے۔ اور جیسے ہی لوگ اس گاڑی کی طرف بڑھے بوڑھی عورت دونوں ہاتھوں سے سینہ کوٹتی باہر نکل پڑی۔ جوان عورت کا سارا جسم ہچکیوں سے لرز رہا تھا اور بچی بلک بلک کر رو رہی تھی۔ اس نے لمبا سانس لیا، آنکھوں میں بھرے آنسو گالوں پر لڑھک آئے۔ مگر دل کو عجیب سا سکون ملا۔ گہرا زخم کسی کے بھی لگے۔ تکلیف یکساں ہی ہوتی ہے۔ یہ سچے انسانی جذبات نہ ہوتے تو!!!

شام کو وہ عامرہ کو دیکھنے جنرل وارڈ میں چلی گئی! جنرل وارڈ میں برابر برابر بہت سے پلنگ بچھے تھے۔ ایک بیڈ پر ایک نوعمر سی لڑکی چپ چاپ سیدھی لیٹی تھی۔ یہ بچپن سے ہارٹ کی مریض تھی اور یہاں کے ڈاکٹروں نے اس کے دل کا آپریشن کر کے اُسے فی الحال موت کے منہ سے کھینچ لیا تھا۔ ایک ادھیڑ عورت کے خون چڑھایا جا رہا تھا۔ اس کا چہرہ زرد تھا۔ کبھی کبھی درد سے چیخ اٹھتی تھی ـــــ وہ بے چاری کینسر کی مریض تھی جس کی تکلیف کو ڈاکٹروں کی چارہ گری طول دے رہی تھی۔

عامرہ کو اس نے بچپن میں دیکھا تھا۔ اس کی ایک پرانی ملنے والی کی اکلوتی لڑکی تھی۔ اب شکل بھی یاد نہیں رہی تھی۔ تیس سال میں کیا کیا انقلاب آگئے تھے۔ بیاہی گئی، بیوہ ہوئی.... اور اب دق کا شکار ہو کر علاج کے لیے شہر آئی تھی۔ جب تیرہ برس کی عمر میں بیوہ ماں نے بیٹی کے ہاتھ پیلے

کیسے تو کتنی خوش تھیں۔ مگر پانچ برس کے بعد دو بچے چھوڑ کر داماد چل بسا
اور یہ دکھیا، شریف غریب، پردہ دار سیدانی بیوہ بیٹی اور یتیم بچوں کو پالنے
کی خاطر نوکری کرنے پر مجبور ہوئی۔ اس نے خاندانی روایت، شرافت اور
وضع داری کو خیر باد کہا اور پندرہ سال سے بیٹی اور نواسوں کو پال رہی
تھی کہ یہ خبر ان پر بجلی کی گولے کی طرح گری۔ روتی پیٹتی گئیں، اور لڑکی کو
لے کر آئیں۔ سارے آئین و قاعدے بالائے طاق رکھ کر پردہ دار، بیوہ،
رسم و رواج اور مذہب کی سختی سے پابند بیٹی کو اس ہاسٹل میں داخل کیا
اور آج وہ اچھی ہو کر واپس جا رہی تھی۔ کہ یہاں کے بڑے بڑے ڈاکٹروں
کی تشخیص یہ تھی کہ اسے دِق نہیں ——— کوئی بھی خاص بیماری نہیں۔ بس
مسلسل سالہا سال سے کم کھانے اور زیادہ کام کرنے کی وجہ سے یہ حال
ہو گیا تھا۔ ماں کی ساری محنت اور دکھ بھی اسی مہنگائی کے زمانے میں بیٹی
کا پیٹ نہ بھر سکے۔

اس کے ذہن میں عامرہ کا تصور ایک مرجھائی ہوئی ادھیڑ کم رو عورت
کا سا تھا، مگر بیڈ سے اٹھ کر ہنستے ہوئے ایک چھریرے بدن کی خوبصورت
ہنس مکھ عورت نے اس کا خیر مقدم کیا، جو مشکل سے پچیس چھبیس سال کی
لگتی تھی۔ رنڈاپا، بیماری، پریشانیاں، بھوک، افلاس کوئی بھی اس کی خندہ
پیشانی اس کی دلکشی اور زندہ دلی کو ختم نہ کر سکے تھے، آس پاس کی سبھی
مریض عورتوں سے اس کی دوستی معلوم ہوتی تھی۔ دونوں ماں بیٹی نے
پان الائچی سے اس کی خاطر داری کی۔ اور واپس نیچے تک پہنچانے آئیں۔ اور
وہ دکھے دل کے ساتھ یہ سوچتی رہی کہ کب تک یہ رسم و رواج ہمارے سماج
کے دل کا گھاؤ بنے رہیں گے؟

اوپر کی منزل میں ایک بہت بڑے اور پرانے سیاسی رہنما جو
بڑے بڑے اونچے عہدوں پر فائز رہ چکے تھے چار مہینے سے موت اور زیست

کی کش مکش میں مبتلا تھے ۔ وہ ایمان دار اور مخلص آدمی تھے ۔ اس لیے اُن کے پاس مال و دولت میں سے کچھ نہ تھا ۔ اور اس چار مہینے کے دوا علاج کا ہزاروں کا قرضہ ان کے مریض بوڑھے دل و دماغ کو کچل رہا ہے ـــــ بے بسی اور لاچاری کی زندہ تصویر زندگی ان سے منہ موڑ رہی تھی ـــــ مگر موت! ـــــ آہ! وہ کیوں گریزاں تھی اب؟ وہ اُن کو دیکھ کر لرز اٹھی ـــــ

اُسے کسی دوست یا عزیز کو فون کرنے یا اُن کا فون رسیو کرنے دو چار بار آفس میں جانا پڑتا ۔ بیس پیسے نذر کرنے کے بعد بھی آفس کی کرسی پر براجمان حضرت کی نظریں ٹیڑھی ہی رہتی تھیں ۔ اس سارے انسٹی ٹیوشن میں بد مزاجی اور بد اخلاقی کا مظاہرہ کیا تو اسی بجائے تیسرے درجے کے کلرک یا بعض چوتھے درجے کے ملازموں نے ـــــ جانے کیا بات ہے ـــــ یہ لوگ اپنے دوستوں اور ہمدردوں کو بھی اب نہیں پہچانتے ۔ صدیوں کے کچلے اور ستائے لوگ شاید کسی کے خلوص پر اعتبار ہی نہیں رہا ان کو! بہرحال اپنی غرض باؤلی اُسے مجبوراً جانا ہی پڑتا تھا ۔ اس رات وہ اپنے گھر فون کر رہی تھی کہ "صاحب کرسی" نے کہا "ذرا جلدی سے بات ختم کرو ۔ ایک DEATH ہو گئی ہے اس کے RELATIVES کو INFORM کرنا ہے ۔" اس نے گھبرا کر نظر اٹھائی ۔ بنچ پر ایک عورت میلی ساڑی پر میلی اونی چادر لپیٹے بیٹھی تھی ۔ وضع سے کسان دیہاتی عورت معلوم ہو رہی تھی ۔ چھوٹے سے گھونگھٹ سے اس کے چہرہ کا جو حصہ نظر آ رہا تھا ۔ وہ جذبات سے عاری تھا بالکل ـــــ مگر وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا پیٹ اس طرح پکڑے تھی جیسے کسی چیز کو نکل بھاگنے سے روک رہی ہو!

وہ دروازے پر رُک کر کلرک کا فون سننے لگی وہ ہندستانی میں کہہ رہا تھا ۔ ہاں ۔ ہاں ۔ شام سنگھ کانسٹبل کو بلاؤ ۔

ہاں ابھی ابھی بلاؤ ـــــ اس کا جو پیشنٹ یہاں تھا نا ـــــ ہاں ـــــ

اس کی حالت خراب ہے — کہو جلدی سے آجائے — اس کی بہن اکیلی ہے — بچاری — ابھی بھیج دو۔"

آہ تو! اس دکھیا کو ابھی یہ خبر نہیں کہ اس کا سہاگ لٹ چکا ہے یہ اس اکیلی عورت کا خیال کر کے پتی کی موت کا حال نہیں بتا رہا ہے۔"

"بس خراب حالت کہہ کر اس کے ذہن کو تیار کر رہے ہیں! رات کو کوئی عورت رشتہ دار مردانے وارڈ میں نہیں رہ سکتی۔ اس لیے اس بدنصیب کو کیا خبر کہ اس کی دنیا اجڑ گئی! اس لیے اس وقت وہ دل نہیں پیٹ پکڑے بیٹھی ہے۔ دہشت میں! رات میں کئی بار اس نے اٹھ کر جھانکا۔ سامنے کی گیلری میں مریضوں کے وہ غریب رشتہ دار جو دن بھر ساتھ رہتے ہیں اس گیلری میں کمبل بچھا کر یا چٹائی پہ لحاف اوڑھ کر رات گزارا کرتے ہیں — رات بھر عورت کھدر کے ایک ہڈرنگ لحاف میں لپٹی، دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی رہی۔ ویران آنکھیں، پتھر کا سا لے جس چہرہ اور دونوں ہاتھوں سے کلیجہ دبائے — بجلی کی تیز روشنی میں وہ الگ سی نظر آرہی تھی! اف یہ طبقاتی تقسیم! سماجی بندھن! وہ اُسے اپنے کمرے میں بلا نہیں سکتی۔ بستر پہ لٹا کر دلاسا نہیں دے سکتی کھل کر بات بھی نہیں کر سکتی۔

صبح منہ اندھیرے اس کا کانسٹیبل بھائی مع دو عورتوں کے آن پہنچا اس نے دیکھا کہ ایک لمبا سا جوان، پگڑی ہاتھ میں لیے اسی عورت کو سینے سے لپٹائے رو رہا ہے۔ عورت کی چیخیں جیسے کلیجے کے پار ہوئی جا رہی تھیں تو دلدوز جانکاہ حقیقت اس پر کھل ہی گئی۔

اس کا مریض جس وقت آپریشن تھیٹر میں تھا تو یہ سارے واقعات ایک ایک کر کے اُسے یاد آرہے تھے! ایک بار پھر وہ گھبرا کر کمرے سے تھیٹر کی سمت روانہ ہوئی — جانے آپریشن روم میں کیا ہو رہا ہے۔"

اس کا دیور اور لڑکی کمرے سے باہر کھڑے تھے۔ دونوں نے ڈاکٹروں اور نرسوں سے دوستی کر لی تھی اور دربان کے لوٹ گنے کے باوجود وہ اندر ہی کھڑے تھے۔ مگر اس کی ہمت نہ پڑی وہ دوسرے کمرے میں ان عورتوں کے پاس جا بیٹھی جو اپنی باری کا انتظار کر رہی تھیں، ایک خوش مزاج سی جوان عورت اسپتال کے بدوضع کپڑوں میں اپنی خوشنما اونی شال لپیٹے ایک پریشان بوڑھی عورت سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ ماں یہ آپریشن بھی کوئی آپریشن ہے۔ بس ذرا سا پیٹ کھولیں گے" ماں کا برا حال تھا۔ بار بار وہ دوسری عورتوں سے مخاطب ہو کر کہتی۔ بہن جی کیا کروں! یہ ماما کی آنچ بری ہوتی ہے — بچہ نہیں ہوتا — وہ اس کی چڑیل ساس دوسرا بیاہ بیٹے کا کرنا چاہے ہے — میں نے کہا آپریشن کرا لے۔ بھگوان کو کھ ہری کر دیں میری بچی کی —" اور اس عورت کا پتی جو دروازے پر کھڑا تھا اندر آ گیا۔" اچھا تمھیں تو ابھی دیر لگے گی — میرے کام پر جانے کا وقت آ گیا۔ گھبرانا نہیں —" ایک پل کے لیے اس کی بیوی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مگر ہونٹوں پر مسکراہٹ ہی تھی۔" ایک بجے آ کر دیکھ جانا۔" اس نے پھر یونہی سا سر ہلایا اور تیزی سے روانہ ہو گیا — بیٹے کی تمنا میں بیوی اپنی جان کو خطرے میں ڈال رہی ہے۔ اور میاں! وہ ایک دن کی چھٹی بھی نہیں لے سکتا تھا —

ایک بوڑھی عورت بڑا سا پیٹ لیے ایک بیڈ پر پڑی تھی۔" مائی تمھارا کاہے کا آپریشن ہے۔

"پیٹ کا ہے بیٹی — ڈاگدڑ کہے ہے رسولی ہے۔"

"تم اکیلی ہو ماں جی؟" اس نے حیرت اور ہمدردی سے کہا۔

"ہاں بیٹی۔ ایک لڑکا ہے۔ وہ پاکستان چلا گیا بال بچوں کو لے کر دو بیٹیاں ہیں۔ وہ اپنے اپنے گھر بار کی ہیں — ایک میرے رشتے کے بھائی ہیں انھوں نے بلا کر یہاں داخل کرا دیا تھا۔" اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"ماں جی تم گھبراؤ نہیں۔ ہم سب بھی تو ہیں" اس جوان عورت نے کہا۔

"ہاں ہاں بڑا اچھا اسپتال ہے"

"بیٹی زندگی سبھی کو پیاری ہوتی ہے ــــ جن کو کوئی نہیں پوچھے وہ بھی اس ڈور کو چھوڑنا نہ چاہیں ہیں ــــ" جانے اسے کیا کیا یاد آرہا ہوگا۔ کس کس لاڈ سے بیٹے کو پالا ہوگا۔ کس چاؤ سے بہو بیاہ کر لائی ہوگی۔ کس ارمان سے داماد آئے ہوں گے ــــ اور آج ــــ تین بچوں کی یہ ماں تنہا آپریشن روم کے باہر بیٹھی آنسو بہا رہی ہے! جانے رسولی کیسی ہے؟

"چلیے بھابی ــ بھائی صاحب ریکوری روم میں، آگئے" دروازے سے باہر آواز آئی اور وہ کانپتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ اس کا مریض بے سدھ پڑا تھا، چہرہ زرد، ناک پہ آکسیجن کا آلہ منھ میں گیس دینے کی نلکی۔ رگ میں گلوکوز کی سوئی اور نبض پر ڈاکٹر کا ہاتھ۔

"ڈاکٹر صاحب ــ یہ ــ" وہ بس اتنا ہی کہہ سکی۔

"ٹھیک ہیں بالکل ــــ اب آپ لوگ کمرے سے جائیں"

"یہ کب تک وہاں آئیں گے؟"

"تین چار گھنٹے بعد....."

مجبوری کا نام صبر ہے ــ دل پہ پتھر رکھ کر باہر نکلی تو کمرے میں بیٹھی سب عورتوں نے پوچھا۔

"ٹھیک ہو گیا نا آپریشن" اس کے لہجے میں ہمدردی کا رس آنکھوں میں ہمدردی اور خلوص تھا۔

"ہاں اللہ کا شکر ہے"

"بیٹی تیرا سہاگ بنا رہے"

"مبارک ہو بہن جی"

اور ان اجنبی عورتوں کی محبت پر اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

اور اگلے کئی دن اُسے سوا تیمارداری کے اور کسی بات کا ہوش نہ رہا...

پھر ایک دن اس نے دیکھا۔ بڑی ہل چل مچی ہے اسپتال میں ــــ سارے بڑے بڑے ڈاکٹر بھاگتے ہوئے آجا رہے ہیں ــ کئی لمبی لمبی کاریں کھڑی ہیں ــ بہت سے لوگ پریشان حال ہال میں کھڑے آتے جاتے ڈاکٹروں سے کچھ پوچھ رہے ہیں۔

"کون بیمار ہے کیا حال ہے؟" اس نے پوچھا۔ ایک ڈاکٹر نے بتایا "ایک مریض کی حالت بڑی سیریس ہے"

اور پھر اس کے دلیور نے حسب عادت ساری معلومات حاصل کرلیں کوئی مریض بڑی نازک حالت میں داخل ہوا ہے۔ بڑا آدمی ہے، امیر، صاحب اثر، مرض ایسا پیچیدہ ہے کہ کسی طرح سمجھ نہیں آرہا اور حالت بگڑتی جارہی ہے.....

یہ بھاگ دوڑ یہ ہنگامہ کئی دن رہا۔

اور آج اس نے سنا کہ وہ مریض ــــ جس کے بچنے کی کوئی امید نہ تھی ــــ اچھا ہو رہا ہے ــــ کتنے خوش تھے ڈاکٹر اپنی اس کامیابی پر جیسے کوئی بڑا آرٹسٹ اپنے شہ کار کی تخلیق کے بعد ہوتا ہے۔

کھڑکی میں کھڑے کھڑے یہ اور بہت سے اور واقعات اس کے ذہن میں تازہ ہو رہے تھے.... زندگی سے مایوس مریضوں کی صحت اور ہٹے کٹے لوگوں کی اچانک موت! ایسے مریض جن کے پرسانِ حال اور دوستوں کی کوئی گنتی نہ تھی، اور ایسے لوگ جن کو

کوئی پوچھنے تک نہ آتا تھا۔ وہ جو تندرست ہو کر ہنستے کھیلتے اپنے پیاروں کے ساتھ رخصت ہوتے اور وہ جو اپنے پیارے کی بے جان لاش لے کر روتے بلکتے گئے۔۔۔۔۔

"آیئے بھابی چلیں ـــــ شکر ہے سب کام ختم ہوا۔"

"شکر ہے، میں اپنی سُکھ کی پونجی لے کر واپس جا رہی ہوں۔" اس نے طمانیت قلب کے ساتھ سوچا۔ اور ٹیکسی آہستہ آہستہ گھر کی سمت رواں ہو گئی۔

●

یہ نئی بستی

میری کہانی پھر کہیں گم ہو گئی!

صبح کو جب مشرق کی سمت سے سورج کی گول سرخ تھالی دھیرے دھیرے ابھر رہی تھی، مشرقی آسمان پر بنفشئی گلابی اور نارنجی بادلوں کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ مغرب کی سمت ہلکی گلابی زرد بادامی رنگ کی ریشمی چادر پھیل گئی تھی، تو میں نظریں خلا میں گاڑے اپنی کہانی کا تانا بانا بن رہی تھی۔ کتنی سہانی صبح ہے، کیسی خوش گوار نرم ہوا چل رہی ہے۔ باغیچہ میں سبزے پر شبنم کے موتی کانپ رہے ہیں اور کھلے ہوئے گلاب اور نرگس کے پھول کس ادا سے ہلکورے لے رہے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ بس ایسی ہی ایک حسین صبح ہو، یوں شبنم میں بھیگی ہوا کے جھونکے ہیروئن کے سیاہ گھونگھریالے بالوں سے اٹکھیلیاں کر رہے ہوں، لہلہاتا سبزہ، مہکتے پھول، جھومتے پیڑ فضا کو ایک فردوسی کیفیت میں ڈبو دیں۔ پھولوں کے ساغر میں اوس کی مے چھلک پڑنے کو ہو ـــــ اور ایسے میں ہیرو چپکے سے پیچھے سے آ کر ہیروئن کے گلے میں اپنا بازو حمائل کر دے!

"میری جان ـــــ میری روح ـــــ یہ اکیلے اکیلے اس حسین صبح کا لطف اٹھایا جا رہا ہے۔"

"اوہوں! ہٹو بھئی ـــــ کوئی دیکھ لے گا تو....." شرم سے خوف سے ہیروئن کے صندلی گالوں پر گلال بکھر جائے، گھنی سیاہ پلکیں رخساروں پر جھک آئیں اور ہیرو اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر اس پر جھکے۔ اور قریب ـــــ اور قریب......

اس رنگین اور دل کش کہانی کے تصوّر نے کل شام کے واقعہ کو ذہن سے جیسے مٹا دیا تھا... مجھے افسانہ لکھنا ہے، بڑا حسین، رومانی افسانہ! خواہ مخواہ مجھ پہ یہ الزام ہے کہ میں ایسی کہانیاں نہیں لکھ سکتی جس میں محبّت کی گرمی اور شدت ہو۔ رومان ہو حسین دنیائیں بسی ہوں ـــــ جن کو پڑھ کر نوجوانوں کے دل دھڑک بلکہ پھڑک اٹھیں۔ بھلا یہ کون سا مشکل فن ہے ـــــ میں بھی لکھ سکتی ہوں ـــــ ذرا سی دیر میں!

اور سامنے بکھری ہوئی کچے مکانوں اور جھونپڑیوں کی یہ نئی بستی جو کئی سال سے یہاں آباد تھی اس وقت میرے ذہن سے محو ہو چکی تھی۔ ہمارے اس صاف ستھرے خوبصورت محلّے کو بسے ہوئے بھی ابھی کچھ بہت زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا ـــــ چھوٹے چھوٹے حسین فلیٹ، خوبصورت مکان، شاندار کوٹھیاں، ننھے ننھے حسین باغیچے، لال بجری کی سڑکیں اور چھوٹے چھوٹے لان، نرسری اور لڑکے لڑکیوں کے پرائمری اسکولوں والی یہ بستی چند سال پہلے تک خاصی آئیڈیل سمجھی جاتی تھی۔ بس ذرا نوکروں وغیرہ کی کوٹھریوں کے آس پاس گندگی یا بیماری یا ہنگامہ ہوتا بھی تو "صاحب لوگوں" اور "مالکوں" کے ڈر سے انھیں دبا دیا جاتا تھا ـــــ مٹا یا نہیں!

لیکن اوہ! جب سے یہ نئی بستی بسی تھی ناک میں دم آ گیا تھا ان شریف لوگوں کا۔ پہلے ایک دو جھونپڑیاں پڑیں اور بس ـــــ پھر تو دیکھتے دیکھتے چار پانچ سال میں جھونپڑیوں اور کچے گھروں کا ایک اچھا خاصا شہر اس خوبصورت محلّے کے اِردگرد آباد ہو گیا۔ نئی بستی میں ننگے بھوکے اپاہج، بے سہارا بوڑھوں

بڑھیوں سے لے کر چور، ڈاکو اور خونی تک آباد تھے۔ یہی نہیں کلرک، چپراسی پرائمری اسکولوں کے ٹیچر، سوشل ورکر، مزدور اور بے کار، جس کو بھی رہنے کا کہیں ٹھکانہ نہ ملتا وہ اسی "سرزمین خداداد" پر ایک ٹکڑا اپنا کر کچا پکا، چھوٹا موٹا "گھر" بنا کر یا چھپر ڈال کر رہنا شروع کر دیتا۔ کیا ہوا اگر سال دو سال بعد سرکاری افسروں کا دھاوا ہوتا اور یہ گھر گرا دیے جاتے ـــــ دوسرے تیسرے دن ہی سے پھر وہ سب "گھر" کھڑے ہونے لگتے تھے۔ جب سر پہ بلا آئے گی دیکھا جائے گا۔ ابھی تو سر چھپانے کو ٹھکانہ ہے یہ کیا کم نعمت ہے؟ اس "نئی بستی" کے مکینوں کا یہ عام نظریہ تھا۔ ان میں سے اکثر گائے بھینس اور مرغیاں، بکریاں پالتے جو زیادہ تر کوٹھیوں کے باغوں اور لالونوں کے "دسترخوان" سے پیٹ بھرتیں۔ نوکری پیشہ لوگ سویرے سویرے سائیکل پر یا پیدل چھوٹے چھوٹے ناشتہ دان ہاتھ میں لٹکا کر چلے جاتے اور ان کی زندہ دل گھر والیاں گھروں کا تھوڑا بہت کام نمٹا کر باقی وقت آپس میں "پیار بھری بات چیت" میں صرف کر دیتیں جو اکثر ہاتھا پائی اور گالی گلوج تک پہنچ جاتی ـــــ اور مزے کی بات یہ ہے کہ چند گھنٹے بعد پھر وہ ایک کی ایک نظر آتیں۔ مزدوروں کے "گھر" شام تک خالی رہتے، اس لیے کہ میاں بیوی بچے سب ہی مزدوری کرتے تھے۔ جو چھوٹے بچے ہوتے وہ سڑکوں پر دن بھر مارے مارے گالیاں بکتے پھرتے۔ کچھ "صاحب ہمت" اور صاحب توفیق" بہادر بھی یہاں آباد تھے جو دوسرے کارنامے انجام دے کر کسی عزیز یا دوست کے ہاں روپوش ہونے چلے آتے تھے۔ دو چار مہینے بعد ضرور "نئی بستی" میں پولیس کا دھاوا ہوتا۔ کچھ لوگ پکڑے جاتے، مارے پیٹے جاتے، کچھ ضمانت پر چھوٹ جاتے، کچھ جیل کی ہوا کھاتے۔ جھونپڑیوں سے آہ و فغاں اور گالی گفتار کا طوفان اٹھتا۔ سپاہیوں اور افسروں کی جیبیں گرم ہوتیں۔ عام طور پر مفلس ملزم سزا

پاتے۔ پیسے والے مجرم مونچھوں پر تاؤ دیتے نئے جرم کی اسکیمیں بناتے پھرتے!
چیتا سنگھ، میرے پڑوسی کا شمار، اُن ہی غریب ملزموں میں تھا جو سال چھ مہینے میں "سسرال" ہو آتے تھے۔ اس نے اپنی جھونپڑی میرے کمرے کی پشت کا سہارا لے کر ڈالی تھی۔ اور یہ بھرا پُرا خاندان جس میں پندرہ افراد سے زیادہ ہی تھے، میرا بن بلایا پڑوسی تھا جس سے کسی طرح مفر نہ تھا۔ وہ لوگ بھی غالباً میرے ہاں ہونے والے بہت سے واقعات سے واقف ہوتے رہتے ہوں گے۔ اور میرے تیز سماعت والے بیمار کان اور گہرا مشاہدہ کرنے والی مریض آنکھیں تو اس گھرانے کی بہت سی باتوں سے بے ارادہ ہی آگاہ ہو جاتی تھیں۔ مثلاً مجھے معلوم ہو جاتا تھا کہ کس دن چیتا سنگھ کے بڑے بیٹے نے اپنی بیوی کو رات بھر پیٹا اور کیوں؟ کس دن اس گھر میں چولہا نہیں جلا، یا جلا تو "مگر پیٹ بھر کر کھانا کسی کو نصیب نہ ہوا اور بچوں کو صرف پیٹ بھر مار کھا کر سو جانا پڑا۔ چیتا سنگھ اور اس کی جاٹنی بیوی میں جو مار کٹائی ہوئی اس کی اصلی وجہ کیا تھی؟ چیتا سنگھ اور شیر خاں میں جو اس دن چاقو چل گئے وہ صرف اس بات پر کہ ایک کی گائے نے دوسرے کی بھینس کے ناند میں ذرا کی ذرا منہ ڈال دیا تھا—— غرض اس قسم کی بہت سی باتیں تھیں جن کو سنتی اور محسوس کرتی، کڑھتی مگر چپ رہتی کہ ہماری مہذب سوسائٹی کا یہ عام نظریہ ہے کہ بھڑوں کے اس چھتے سے دور ہی رہنا چاہیے۔ خاص کر چیتا سنگھ، اس کی لڑاکو بیوی اور بدتمیز بچوں سے تو سب ہی پناہ مانگتے تھے۔

لیکن کل جب چیتا سنگھ کی چھ فٹ لمبی تڑنگی بیوی نے دبلی پتلی بسنتی کو چار چوٹ کی مار لگائی تو میں اپنے کو روک نہ سکی۔ دوپہر کا ایک بج چکا تھا اور میں اوپر کے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی اپنی لڑکی کے اسکول سے آنے کا انتظار کر رہی تھی کہ سامنے کی جھونپڑی سے آہ و بکا کی دل خراش آوازیں بلند ہوئیں

ان آوازوں سے میں نے اکثر دھوکا کھایا تھا۔ کبھی لے اور سُر میں بین سن کر جب کسی کی موت کی خیال سے لرز اٹھی تو پتا چلا تھا کہ پڑوسن کی ماں آئی ہے اور ماں بیٹی گلے مل کر "مسرت کے آنسو بہا رہی ہیں۔ کبھی کسی کی شدید بیماری کی کراہوں کا راز یہ کھلا کہ میاں بیوی میں ذرا پیار محبت کی باتیں ہو رہی ہیں۔ یہ سب جانتے ہوئے بھی میں جھانکے بنا رہ نہ سکی۔ جانے لڑائی جھگڑے میں کیا کشش ہوتی ہے کہ سنجیدہ سے سنجیدہ معقول سے معقول آدمی بھی ذرا کی ذرا رک کر اس سے ضرور لطف اٹھا لیتا ہے۔

چیتا سنگھ کی بیوی کے ہاتھ میں چمڑے کی پرانی پیٹی تھی جس کے دونوں سرے اپنے مضبوط ہاتھ میں پکڑے وہ سڑاسٹر اپنی چودہ پندرہ سالہ بیٹی پر ہنٹر برسا رہی تھی۔ بسنتی اپنی لمبی، پتلی، کالی باہیں اٹھائے ہر وار کو روکنے کی کوشش کرتی مگر ہنٹر اس کے منہ اور پیٹھ پر برابر برس رہے تھے۔

بسنتی اور کسی سے پٹ جائے؟ ماں سے بھی جس سے چیتا سنگھ تک ڈرتا تھا۔ وہ دُو بدو زبان چلاتی تھی۔ لڑکی کیا آفت کی پڑیا تھی۔ باپ سے زبان چلاتی، بھائی بھاوج کو ہاتھ لے کر کے کوسنے اور گالیاں اس روانی سے دیتی کہ بھاوج کو روتے بھی نہ بنتی۔ چھوٹے بھائی بہنوں کو پیٹ ڈالتی ... اتنا ہی ہوتا تو خیر کوئی عجیب بات نہ تھی۔ اس نئی بستی میں یہ سب ہوا ہی کرتا تھا۔ مگر اس سے تو سارے نئی اور پرانی بستی والے نالاں تھے وہ راہ چلتوں کو چھیڑتی، کوٹھیوں کے ملازم لڑکے لڑکیوں سے ہاتھا پائی کرتی۔ شریف، مہذب سنجیدہ حضرات کو جاتے دیکھ کر منہ چڑاتی یا پیسے مانگتی۔ خوش پوش اسکول جانے والی لڑکیوں پر آوازے کستی، انھیں انگوٹھے دکھاتی۔ اور وہ بگڑتیں تو برابر سے باتیں سناتی اور پھر کھی کھی کر کے ہنسنے لگتی! یہ حرکتیں وہ پہلے بھی کرتی تھی مگر اس وقت چھوٹی سی لڑکی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کا قد اتنا لمبا ہو گیا تھا، جسم جگہ جگہ سے بھر گیا تھا

اور آنکھوں میں کچھ ایسی خوفناک چمک پیدا ہوگئی تھی کہ ٹیڈی ٹائپ لڑکے مسکراتے اور آنکھ مارتے اور شریف مرد آنکھیں جھکائے بغیر نہیں رہ سکتے تھے ــــ غرض سال ڈیڑھ سال سے راہ چلتے لوگ اس سے پناہ مانگنے لگے تھے۔ ایک بار میں نے جی کڑا کر کے چلیا سنگھ سے کہا بھی تھا "چلیا سنگھ "بسنتی اب جوان ہو چلی ہے ــــ دیکھو بھائی بیٹی بستی بھر کی عزت ہوتی ہے۔ اس کا یوں راہ چلتوں کو چھیڑنا اچھا نہیں لگتا" ــــ وہ بڑا بدزبان، لڑاکو اور بددماغ آدمی سمجھا جاتا تھا، مگر میرے سامنے تو کبھی سر اٹھا کر بات نہ کرتا۔ روایتی انداز میں ہاتھ جوڑ کر، سر جھکا کر بڑی مسکینی اور مظلومی سے بولا "ہاں جی، تمھاری ہی بیٹی ہے ــــ تم مارو، سمجھاؤ، ہم کچھ نہ بولیں گے ــــ" مگر یہ گویا اخلاق تھا اس کا، ورنہ سب جانتے ہیں کہ بچوں کے بھیک مانگنے، پڑوسیوں سے لڑنے اور بسنتی کو شوخ بنانے کی ساری ذمے داری ان ہی باپ بھائی کے سر تھی۔ سچ مچ لوگوں کا راہ چلنا بسنتی اور اس کے بھائی بہنوں نے دشوار کر دیا تھا ــــ "پیسہ ــــ پیسہ" کی رٹ دور تک لگی رہتی، حالاں کہ وہ لوگ پیشہ ور فقیر نہ تھے۔ مگر بسنتی کی فرمائشیں اور ہی انداز کی ہوتیں ــــ خوش پوش عورتوں اور لڑکیوں سے وہ جل جل کر اور ہنس ہنس کر (جی ہاں دونوں باتیں عجیب انداز میں ملی ہوتیں) کہا کرتی "یہ دوپٹہ ہمیں دے دے نا" "اری تو کیسی اچھی سلوار پہنے ہے ــــ ایک ہمیں دے دے ایسی" "یہ ساری جی چاہے اتار لوں ــــ تو بھی ننگی ہو جائے" اور وہ اپنی پھٹی شلوار اور بوسیدہ جمپر سے جھانکتے ہوئے جسم کو دیکھ کر عجیب روہانسی ہنسی ہنس پڑتی ــــ لمبے لمبے بالوں کی لٹیں یوں چپکی رہتیں جیسے گوندمیں لتھڑی ہوں اور ان میں سے جوئیں ٹپکتی رہتیں ــــ بڑی بڑی شربتی آنکھوں میں شوخی اور شیطانی

ناچتی ہوئی اور مٹیالے رنگ میں سیاہی رلی رہتی۔ عجیب بھیانک سی صورت بن گئی تھی اس حلیے میں ـــــ بھلا ایسی چھوکری کو کون رحم کھاکر کچھ کپڑا یا پیسہ دیتا؟ لیکن وہ وقت سے پہلے ہی بہت سی ایسی باتوں سے آگاہ ہو چکی تھی جس نے اس کی معصومیت کو کچل ڈالا تھا۔ نوجوان لڑکوں کو چھیڑنے، بوڑھوں کو انگوٹھے دکھانے اور لڑکیوں کو ستانے میں اُسے بڑا لطف آتا تھا ـــــ "مکھیکھتیں ـــــ کیسی ریشمی سلوار جمپر پہنے رہے ہیں ـــــ" "اڑ جائے یہ لونڈیا ـــــ کیا کھبصورت ساری پہنے ہے۔" اور اس کی آنکھوں میں ایسی بھوک ان چیزوں کے لیے ناچتی کہ لڑکیاں گھبرا کر بھاگ کھڑی ہوتیں۔

بیل تیز تیز چلتی ہوئی چیتا سنگھ کی جھونپڑی کے سامنے پہنچ گئی۔ کچھ لوگ کھڑے اظہار رائے فرما رہے تھے، کچھ راہ گیر مڑ مڑ کر دیکھتے اور فقرے چست کرتے چلے جاتے تھے۔ بسنتی دونوں ہاتھوں سے منہ چھپائے اکڑوں زمین پر بیٹھی تھی اور ہر وار کمر اور کولھوں پر روک رہی تھی ـــــ شاید وہاں ضرب کی شدت کم محسوس ہوتی ہو!

"خدا بچائے ایسی لڑکی سے۔ بستی والوں کی زندگی عذاب کر دی ہے۔" اپنے حسابوں ایک مہذب سے حضرت نے فرمایا "لاحول ولا قوۃ ـــــ" اور آگے بڑھ گئے۔

"اس نے تو شریفوں کا راہ چلنا دشوار کر دیا ہے" گلے میں ٹرانزسٹر لٹکائے ایک تنگ مہری کی پتلون اور ٹائٹ شرٹ میں ملبوس نوجوان نے سیٹی بجاتے ہوئے کہا اور پھر یوں گھبرایا جیسے کسی نے اس کی چوری پکڑ لی ہو۔

"یہ چھوکری تو نئی بستی کے لیے کلنک ہے۔ نہ شرم نہ حیا جہاں چاہے بیٹھ گئے...." ایک بڑی بی بڑبڑائیں۔

"اور مارو ـــــ اور مار اس کی یہی سزا ہے ـــــ" بھاوج نے ساس کو

اکسیایا۔

"ایسی لونڈیا جوتے ہی کے زور سے ٹھیک ہو سکے ہے"۔ ایک بڑے میاں بولے اور پھر گھبرا کر آگے بڑھ گئے جیسے ڈر رہے ہوں کہ ابھی بسنتی چیل کی طرح جھپٹا مار کر انھیں گالیوں پر دھر لے گی۔

"ہائے رے ——— کیسی گالیاں بکتی ہے ——— اور کیسا کیسا ستاتی ہے ———" ایک سوشل ورکر نے اپنی ریشمی ساڑی کے بل ٹھیک کرتے ہوئے کہا اور ناک سکیڑ کر قوم کی سیوا کے لیے روانہ ہو گئیں۔

میں چند لمحے سن سی کھڑی رہی۔ لوگوں کی باتیں، اس نوعمر لڑکی کی حالت، ماں کا خوف ناک چہرہ ——— جیسے سب خواب میں دیکھ اور سن رہی تھی۔ یہ بدنصیب بچی کیا کچھ بن سکتی تھی۔! اس کا ایک چھوٹا سا آرام دہ گھر ہوتا۔ محبت کرنے والے ماں باپ، ساتھ کھیلنے والے بہن بھائی ——— پڑھنے کے لیے اسکول ——— پہننے کے لیے۔ اچھے اچھے کپڑے۔ جن کی اُسے آنی بھوک ہے ——— اور ——— اور ———

بسنتی بلبلا کر چیخی ——— ماں کی ماریں شدت اور بڑھ گئی تھی۔ جانے بدنصیب سے کون سا قصور ہوا ہے جو یہ ڈائن یوں اُسے مارے ڈال رہی ہے۔ مجھ سے ضبط نہ ہوا، میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا "کیوں مارے ڈال رہی ہو لڑکی کو" میں نے غصے سے کہا۔

اس نے خوں خوار نظروں سے مجھے دیکھا "کیوں نہ ماروں۔ میری بیٹی ہے تم کیوں دخل دو ہو"

"ارے تو کوئی اپنی بیٹی کو اس بے دردی سے مارتا ہے بھلا؟"

"اے جاؤ ——— جاؤ ——— اپنی کوٹھی میں عیش کرو ——— دو وخت کا فاکہ پڑے تو پتا چلے بیگم صاحب کو ———" اس کے لہجے میں نفرت کا زہر اور کاٹ تھی۔ میں لرز کر پیچھے ہٹ گئی۔

"اری ماں ری ـــــ اب تو چھوڑ دے ـــــ" بسنتی کی بھاوج نے گویا رحم کھا کر سفارش کی۔ "بس کر اب ایسی غلطی نہ کرے گی۔"

"چھوڑ دوں؟ اسے (گالی دے کر) چھوڑ دوں؟ سارے بچے رات سے بھوکے تھے اور یہ ـــ (ایک اور گالی) اپنے۔ . . . . (ایک اور) . . . کا دیا پورا روپیہ کھا گئی پیاروں بیٹی ـــــ ارے ایک روپیہ کا ایک سیر آٹا آتا تو ـــــ جھاڑو ماروں کے پیٹ میں دو دو نوالے تو پڑتے۔" اور پھر ہنٹر برسنے لگے۔

بسنتی اب تک مفلوج سی بیٹھی تھی اب ایک دم کھڑی ہو گئی۔ اس نے ماں کے دونوں ہاتھ اپنے جوان ہاتھوں میں کس لیے۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جگہ شعلے نکل رہے تھے۔

"ہاں ہاں کھاؤں گی ـــــ خوب کھاؤں گی۔ اس نے روپیہ مجھے دیا تھا ـــــ دکھ میں نے جھیلا تھا، تجھے کیوں دوں؟ خوب کھاؤں گی چاٹ، سموسہ کولا، مٹھائی ـــــ روپیہ میرا تھا ـــــ میرا تھا ـــــ" وہ پاگلوں کی طرح چیخ رہی تھی۔

مجھے ایسا لگا کہ اب اس نے ماں کے ہاتھ سے ہنٹر چھینا اور اس کو مارنا شروع کیا ـــــ کانپ کر میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ شاید ہزاروں خرابیوں کے باوجود ابھی ہندستانی تہذیب یا سنسکرتی یہ عذاب نہ سہار سکے کہ ماں کو بیٹی پیٹے ـــــ مگر بسنتی کا ہاتھ گر گیا ـــــ وہ بھاگ کر اندر کے چھپر میں چلی گئی۔ کواڑ ہوتے تو دروازہ بند کر کے ڈائن ماں کے ظلم سے بچ جاتی مگر وہاں تو گرمی برسات، جاڑے سب موسموں میں سب حالتوں سے پناہ کے لیے بس یہ کھلے چھپر ہی تھے ـــــ ماں بھی اس کے پیچھے دوڑی اور میں ایک عجیب احساس شکست کی حالت میں گھر لوٹ آئی ـــــ گالیاں، بین اور گریہ وزاری کی آوازیں میرا پیچھا کرتی رہیں ـــ بند ہونے کے

بعد بھی!

میں نے جو ہو سکتا تھا اس کے لیے کیا ـــــ مگر نہ میرے دل کو قرار نہ تھا نہ دماغ کو سکون۔ ہزاروں سوال بچھو کے ڈنک کی طرح ذہن میں چبھ رہے تھے۔ ایسا کیوں ہے؟ کب تک؟ کہاں تک یہ حال رہے گا؟ کب تک یہ اندھیر؟ یہ جہالت، یہ مفلسی! یہ مصیبت! اُف خدایا۔ میری آدھی رات کرب کے عالم میں گزری تھی۔ اور پھر جانے کب نیند نے میرے تھکے دماغ کو سکون بخشا!۔

صبح بہت سہانی۔ بہت حسین تھی۔

کل کے واقعات ذہن کے کسی انجانے گوشے میں چھپ کر بیٹھ رہے تھے۔ ایک رومانی حسین، رنگین کہانی کا سارا تانا بانا بنا جا چکا تھا۔ ہیرو نے ہیروئن کی گھنی جھکی ہوئی پلکوں کو ہونٹوں سے چھوا ـــــ کب تک یہ شرم و حیا ـــــ آخر ایک دن تمہیں میرا ہونا ہی ہے ـــــ"

ہیروئن نے محبت پاش نظروں سے اُسے دیکھا ـــــ آہستہ سے بولی" دیکھو ـــــ سورج ہمیں دیکھ رہا ہے ـــــ"

"یہ میرا رقیب ہے اور میں ....."

یکایک نالہ و فریاد کا طوفان سا برپا ہوا۔ میں تخیل کی دنیا سے ایک دم حقیقت کی دنیا کی ٹھوس چٹان پر آپڑی۔ میں نے منڈیر سے جھک کر دیکھا......

جیتا سنگھ ایک سیاہ چٹان سے تراشے ہوئے مجسمے کی طرح بے حس و حرکت زمین پر بیٹھا تھا، جیسے ہلنے بولنے کی سکت ہی نہ رہی ہو۔ اس کی لحیم شحیم بیوی چارپائی پر بیٹھی دونوں ہاتھوں سے سر اور سینے کو پیٹ رہی تھی۔ سات چھوٹے بڑے بچے بلک بلک کر رو رہے تھے۔ بسنتی کی بھاوج منہ پر گھونگھٹ ڈالے اور بڑا ساہیٹ بے تکلف کھولے

ارد گرد جمع ہونے والے مجمع سے ہاتھ چلا چلا کر کچھ کہہ رہی تھی!

"کیا ہوا؟"

"بسنتی بھاگ گئی"

"چلو پاپ کٹا"

"ہائے میری نازو کی پالی بچّی"

بچوں کا نالہ و شیون اور زور سے بلند ہوا — جانے وہ بھوک سے رو رہے تھے کہ بہن کی محبت میں! اُف خدایا!

اور پھر میرا حسین رنگین، دل کش رومانی افسانہ میری گرفت سے پھسل کر اس مجمع میں کھو گیا!

●

رانو

جب کوئی اس پر ناراض ہوتا تو اس کا ڈھیٹ پن کچھ اور بڑھ جاتا۔ بجائے شرمندہ ہونے کے وہ الٹی اور اکڑ جاتی۔ اس کا جی چاہتا چلا چلا کر روئے، سب سے لڑے، چیخے، اماں بی کی باتوں پہ ناک چڑھا کر منہ پھیر لے اور جب وہ اس بات پر بگڑیں تو منہ چھپا کر کھل کھل ہنسے پھر بھابی کے پاس جا کر جی بھر کر اماں کی شکایتیں کرے۔ کتنی اچھی ہیں بھابی، اماں بی کی طرف داری کبھی نہیں کرتیں۔ ہمیشہ اس کے سر پہ ہاتھ پھیر کر اُسے دلاسا دیتی ہیں۔" نہ رو رانو بی نہ رو۔ اماں کا تو مزاج ہی ایسا ہے" اور پھر وہ اُسے کچھ نہ کچھ کھانے کو دیتیں۔ اس سے بہت سی باتیں کرتیں، "اماں بی کیا کہہ رہی تھیں"؟ " بابا سے ان سے کیا باتیں ہو رہی تھیں۔" "میرا ذکر کر رہی تھیں نا؟" "بڑی اچھی بٹیا ہے جب وہ میری کوئی بات کریں تو مجھے آکر بتا دینا۔ ہاں؟" بے چاری بھابی اس سے اتنی محبت کرتی اتنا خیال کرتی ہیں، تو کیا وہ اتنا نہیں کر سکتی کہ ان کا یہ زرا سا کام کر دے؟

وہ سر ہلا ہلا کر وعدہ کر لیتی۔ اور کبھی اماں و بابا کی سنی باتیں، کبھی یونہی دل سے بنا کر ان کو بتا دیتی۔ بھابی اُسے تو مٹھائی یا کوئی اور چیز

دیتیں مگر خود رونے لگتیں۔ آخر کیوں؟ یہ اس کی سمجھ میں نہ آتا۔ اور پھر گھر میں کئی دن تک کچھ عجیب سی حالت رہتی، اماں بی بگڑی بگڑی بھابی روٹھی روٹھی نظر آتیں اور آخر میں اماں کے غصے کی تان اس پر ٹوٹتی۔ "جھوٹی، لنگڑی.... جس ہانڈی میں کھاتی ہے اسی میں چھید کرتی ہے۔ ادھر کی ادھر لگاتی ہے۔" وہ روتی معافی مانگتی مگر کچھ سمجھ نہ پاتی کہ آخر اس نے کیا برا کام کیا ہے؟ پھر دل کو یہ کہہ کر تسلی دے لیتی۔ اُنھ اماں بی کی تو عادت ہے چڑچڑ کرنے کی۔ مگر اس کے بعد بھابی بھی اکڑ جاتیں۔ اس نے کونسی ایسی بات کی ہے جو سب خفا ہیں؟ وہاں بھی تو سب اس سے باتیں پوچھا کرتے تھے۔ وہ بتایا کرتی تھی اس کے بہت سے فرائض میں سے ایک یہ بھی تھا۔ پھر یہ خواہ مخواہ کی ڈانٹ ڈپٹ کیوں؟ کئی کئی دن کوئی بات تک نہ کرتا سوائے بابا کے۔ ہائے کتنے پیارے ہیں بابا۔ بس وہی تو کرتے ہیں اس سے محبت کتنا خیال رہتا ہے انھیں اس کا۔ روز صبح جب وہ سلام کو جاتی ہے تو کس پیار سے کبھی سر پر ہاتھ پھیرتے ہیں، کبھی اس کے گال پکڑ کر کھینچتے ہیں "موٹی ہو گئی ہے؟ اور کبھی کسی سے کہتے "کتنی چمک دار اور ذہین آنکھیں ہیں اس چڑیل کی" یہ سن کر وہ شرما کر اپنے دوپٹے میں منہ چھپا لیتی۔ مگر جیسے ہی موقع ملتا بابا کی لمبی الماری کے سامنے جا کھڑی ہوتی جس میں سے دو گہری سیاہ، بڑی بڑی چمک دار آنکھیں اُسے گھورنے لگتیں۔ لمبی سی موٹی سیاہ چوٹی جانے کیسے کمر سے سامنے آگرتی اور دبلا پتلا لچک دار جسم کچھ اور لچک جاتا۔ سانولے رنگ میں سرخی دمک اٹھتی۔ اگر اماں بی دیکھ لیتیں تو ایک چپت سر پر پڑتا "ارے ابھی سے یہ حال ہے۔ آگے چل کر کیا کرے گی؟" وہ سہم جاتی۔ مگر ایسے میں بابا آجاتے تو "بی بی یہ مجھے رجھانے

کی باتیں ہیں۔ کل میں نے اس کی آنکھوں کی تعریف کر دی تھی ذرا" اور وہ ہنس پڑتے۔ لگتا جیسے ساری دنیا ہنس پڑی، جیسے گہرے سیاہ بادلوں میں سے سورج جھانک پڑا۔ کتنی میٹھی کیسی پیاری ہنسی ہے ان کی وہ ان باتوں کو لفظوں میں ادا نہ کر سکتی تھی صرف محسوس کرتی تھی!

اماں بی کچھ جھنجھلا کر کہتیں "اجی یہ باتیں اچھی نہیں لڑکی ذات کے لیے۔ تم نے اُسے بہت سر چڑھا لیا ہے" وہ چپکے سے کمرے سے کھسک جاتی اور کواڑ سے چپک کر باتیں سننے لگتی" بی بی یتیم بچی ہے اس سے نرمی اور محبت کا سلوک کرنا چاہیے" "بے شک۔ مگر یتیم بچے کی تربیت بھی تو کرنی چاہیے۔ تم نہیں جانتے یہ کتنی بگڑی ہوئی ہے۔ روز دلھن سے جاجا کر باتیں جڑتی ہے۔ بچی چھوٹی۔ پھر باہر اتے پڑے بڑے مردوں سے ایسی مٹک مٹک کر باتیں کرتی ہے کہ میں آپ کو کیا بتاؤں!! اگر میں روک ٹوک نہ کروں تو جانے یہ بارہ برس کی فتنی ابھی سے کیا کرے!"

"بھلا بی بی ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔ ذرا سی تو بچی ہے وہ یہ سب کیا جانے" "ارے وہ نہیں جانتی مگر وہ باہر کے مردوے تو سب جانتے ہیں۔ آپ کو پتا بھی ہے کچھ روز گھر میں سے کوئی نہ کوئی چیز غائب ہو جاتی ہے"

"وہ غریب چیزیں کہاں لے جائے گی۔ اس کا ہے کون"

"ہونے کو وہ آپ کا لاڈلا جمن خاں کیا کم ہے۔ اُسے بہکا سکھا کر گھر کی چیزیں اٹھوا لیتا ہے۔ پکڑا دیتا ہوگا دو چار آنے اس کے ہاتھ میں"

"نہیں بیگم آپ کو خواہ مخواہ اس معصوم بچی سے چڑ ہو گئی ہے! ایسا نہیں سوچنا چاہیے۔ ہمارے بچے ایسی حالت میں ہوتے تو ان پر کیا گزرتی! جس کا دنیا میں کوئی نہ ہو...."

"اے خدا رکھے سب کے بدلے تم جو ہو انا تھ بے سہارا کا آسرا"

اماں بی بات کاٹ کر کہتیں اور کچھ روٹھی روٹھی وہاں سے اُٹھ جاتیں۔ اور وہ بھی آہستہ سے کھسک کر ان کے کمرے میں پہنچ کر کچھ کام کرنے لگتی۔ مگر اس کا دل یہ اچھی طرح بتا دیتا تھا کہ بابا اس کی طرف دار ہیں محبت کرتے ہیں اور اماں بی مخالف! مگر۔ مگر اماں بی سے بھی اُسے بہت محبت تھی۔ جب ڈانٹتیں تب تو بڑی بری لگتیں۔ موٹی بھدی، نک چڑھی مگر جب پیار بھری نظروں سے دیکھتیں۔ اس کے کام کی تعریف کرتیں کسی سے، "کام تو رالو بھر کی طرح کرتی ہے۔ اور اتنے سلیقے سے کہ کیا کہوں! بس یہ اپنی عادتیں چھوڑ دے تو بڑی پیاری بیٹی ہے۔" تو اس کی آنکھوں میں آپ ہی آپ جانے کہاں سے پانی آجاتا اور کئی دن تک وہ اماں بی کے آگے پیچھے پھرتی رہتی۔ اور پھر جانے کیسے کون ایسی بات ہو جاتی کہ اماں بی خفا ہوتیں، بھابی روٹھ جاتیں، بابا پریشان ہو جاتے!

اور پھر پرسوں کا واقعہ! بی اماں بی اسے ڈیوڑھی سے باہر جانے نہ دیتی تھیں مگر اس دن باہر مہمان خانے میں ٹھہری بیگم صاحبہ کی چائے لے کر اس کو جانا پڑا۔ اور سب سو رہے تھے نا۔ بیگم صاحبہ نے اُسے روک لیا اور باتیں کرنے لگیں۔

"رالو تم کب سے یہاں ہو؟"

"سال بھر ہوا ہو گا جی۔"

"پہلے تم کہاں رہتی تھیں؟" ان کے لہجے میں ہمدردی تھی۔

"پہلے — جی — پہلے — وہ — وہ میں —"

"تمہارے ماں باپ کہاں رہتے ہیں؟"

"باپ! باپ کو تو دیکھا ہی نہیں جی۔ لوگ کہتیں ہیں وہ میری

ماں کو چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔"

"اور ماں"؟

"ماں۔ جی ہاں دو برس ہوئے مر گئی" اور وہ رو پڑی وہ کبھی کسی سے اپنی ماں کا ذکر نہیں کرتی تھی اس لیے کہ پھر وہ اپنی رلائی نہ روک سکتی! اور کسی کے سامنے رونے سے جانے اُسے کیوں چڑ تھی۔ بیگم صاحب کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔

"رانو ہمارے ساتھ چلے گی۔ ہم اپنی بیٹی کی طرح تجھے رکھیں گے؟" ذرا دیر بعد انھوں نے پوچھا۔

"جی۔ جی؟" پہلے تو وہ کچھ کہہ ہی نہ سکی۔" مگر۔" وہ کچھ سوچ میں پڑ گئی۔ "مگر بابا۔"

"بابا کیا؟"

"نہیں بیگم جی — میں اپنے بابا کے پاس رہوں گی۔ — وہ تو میرے بابا ہیں۔ میرے اپنے بابا —" اور ان کو حیران چھوڑ کر وہ بھاگتی ہوئی اندر آ رہی تھی کہ ڈیوڑھی میں جمن خاں نے دونوں ہاتھوں سے اس کا راستہ روک لیا "کہاں میری جان" وہ ٹھٹک گئی۔ "ہٹ پرے"

"اری — ابھی سے یہ نخرے۔ ذرا ایک ....."

"میں مار دوں گی —" اس نے جھنجھلا کر کہا تو جمن خان نے اپنے بڑے بڑے پنجوں میں اس کا گلا دبا لیا اور اس کا ڈراؤنا چہرہ۔ سرخ سرخ آنکھیں اس کے قریب۔ بالکل۔ قریب آ گئیں —" ایک گھٹی ہوئی چیخ اس کے منہ سے نکلی۔ ٹپ سے دروازہ کھلا۔ سامنے بابا کھڑے تھے۔ جمن خان کو جیسے بجلی کا کرنٹ لگ گیا۔ وہ جھٹکا کھا کر دیوار سے جا لگا۔ اس کا سارا بدن کانپ رہا تھا۔ اماں بی کی آواز اسے لگا بہت دور سے آ رہی ہے۔"جمن خاں۔ تم جا سکتے ہو۔ اب کبھی یہاں قدم نہ رکھنا۔"

اور پھر "رانو ——— اندر آ"

اور اس دن پہلی بار بابا اس سے خفا ہو گئے۔ انھوں نے اسے برا بھلا نہ کہا تھا، مارا نہ تھا۔ کوئی سخت لفظ بھی نہیں بس اتنا۔ "مجھے کبھی بیگم صاحب کی بات کا یقین نہ آتا۔ اگر آج میں خود نہ دیکھتا۔ افسوس رانو میں تجھے ایسا نہ سمجھتا تھا۔ بس آج سے تو میری بیٹی نہیں ———" ان کی آواز بھرا گئی اور وہ جلدی سے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

سارا دن اور ساری رات اماں بی کے ڈریسنگ روم میں اپنی چٹائی پر پڑی وہ روتی رہی! بھابی نے کھانا کھلانا چاہا اس نے انکار کر دیا۔ اماں بی چلے لے کر آئیں اس نے چپکے سے غسل خانے میں وہ چائے الٹ دی!! کلیجہ پھٹا جا رہا تھا، آنکھیں برس رہی تھیں۔ دماغ بس ایک ہی رٹ لگائے ہوئے تھا۔ بابا خفا ہو گئے۔ بابا نے کہا تو میری بیٹی نہیں۔ بابا جو آج تک اس سے خفا نہ ہوئے اتنے ناراض!! اور اسی رات جب روتے روتے کسی وقت وہ سو گئی تو بیتی زندگی کی یادیں مجسم ہو گئیں۔ ماں منھ اندھیرے سے اٹھ کر راجہ صاحب اور بیگم صاحبہ کے ہزاروں کام کر رہی ہے۔ رات گئے تک وہ کام کرتی ہے اور رانو اپنی چٹائی پر پڑی روتی رہتی۔ . . . روتی رہتی ——— بیچ بیچ میں کبھی آ کر وہ سوکھی روٹی کا ٹکڑا، کوئی میٹھی چیز، ذرا سی چائے اسے دے جایا کرتی!! اور پھر جب رات کو وہ اسے سینے سے لگا کر لیٹتی تو جانے کیوں رونے لگتی۔ اور ماں کے ساتھ بچی بھی چیخ چیخ کر روتی! ماں کو رانی صاحبہ چوٹی پکڑ کر مار رہی ہیں۔ اور وہ چیخ چیخ کر کہہ رہی ہے۔ "یہ جھوٹ ہے رانی صاحب۔ جھوٹ ہے۔" مگر ان کا ہاتھ اور زبان بے تکان چل رہی ہے۔ اور جب ماں زخموں سے چور اس کے پاس آ کر بے ہوش ہو کر گر جاتی ہے تو وہ ننھے ننھے ہاتھوں سے اس کے زخموں کو دھوتی اور سینکائی کرتی ہے۔

وہ سوتے سے چونک جاتی ہے تو دیکھتی ہے راجہ صاحب اندھیرے

ہیں کھڑے ماں سے کچھ کہہ رہے ہیں اور ماں غصے میں بل کھا رہی ہے۔
"راجہ صاحب۔ آپ بڑے آدمی ہیں مجھ غریب کی جان چھوڑ دیجیے۔ رانی صاحبہ مجھے مار ڈالیں گی"
"میں تمھیں اپنے محل میں رکھوں گا میری جان۔ کسی کی مجال ہے کہ....."
"نہیں راجہ صاحب نہیں۔ ذرا۔ اس معصوم کی طرف تو دیکھیے۔ اتنے بڑے باپ کی بیٹی ہوتے ہوئے بھی۔ بے سہارا ہے۔ یتیم ہے۔ اور۔ آپ ــــ آپ"
"بس بس نازو۔ یہ بات پھر کبھی منہ سے نکالی تو اچھا نہ ہوگا ــــ"
وہ تیزی سے باہر نکل جاتے ہیں۔ وہ ماں سے پوچھتی ہے" ماں کون ہے بڑے باپ کی بیٹی؟" ماں روتی رہتی ہے۔ بس روتی رہتی ہے۔
پھر ایک دن وہ سو کر اٹھتی ہے تو ماں پلنگ پر سیدھی سیدھی پڑی تھی۔ آنکھیں بند، منہ کھلا جسم اکڑا ہوا۔ "ماں ماں" وہ اسے ہلاتی ہے اور پھر ایک دم تڑپ کر الگ ہو جاتی ہے۔ کوئی دل کے اندر سے اس سے کہتا ہے "ماں مر گئی" وہ ماں پر گر پڑتی ہے۔
اس کی ماں سفید کپڑوں میں لپٹی ایک چارپائی پر پڑی ہے۔ رانی صاحبہ "نہ۔ نہ۔ نہ ہائے ہائے۔ کر رہی ہیں۔ راجہ صاحب چپ چاپ سر جھکائے کھڑے ہیں۔ نوکر چاکر رو رہے ہیں۔ وہ گھبرا گھبرا کر ایک ایک کا منہ تک رہی ہے۔ مگر باہر سے مرد آکر اسے لے جانے لگتے ہیں تو وہ چیخ کر ماں کی چارپائی سے لپٹ جاتی ہے۔" ماں۔ ماں ــــ"
اماں بی کھڑی اس کا بازو ہلا رہی تھیں "رانو۔ ڈر گئی کیا، نہ رو بیٹی نہ رو" اور وہ اماں بی سے لپٹ کر سسک سسک کر رونے لگی۔ "نہ رو رانو۔ میں بابا سے تیرا قصور معاف کرا لوں گی" اسے لگا کہ تڑپتی مچھلی کو تپتی ریت سے اٹھا کر دریا میں ڈال دیا ہے۔ وہ بیٹھی بیٹھی سو گئی۔

ماں کے بعد سال بھر جس نرک میں اس نے گزارا اس کی تو ذرا سی جھلک ہی اسے نظر آئی تھی۔ اب تو وہ خواب میں بابا کا محبت بھرا چہرہ دیکھتی رہی۔ وہ رانی صاحبہ سے مانگ کر اسے اپنے ہاں لے آئے ہیں! وہ اسے اپنے سامنے سے اٹھا اٹھا کر مٹھائی اور پھل دے رہے ہیں، وہ پیار سے اس کا گال چھو رہے ہیں "موٹی ہو گئی ہے چڑیل" ——— "اس کی آنکھیں کتنی حسین ہیں بی بی۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

سارا دن وہ لب چھپ کام کرتی رہی۔ اماں بی کا کمرہ صاف کیا، بھابی جی کے کپڑے دھو کر استری کر دیے۔ باورچن نے جتنا مسالہ پیسنے کو کہا بغیر چڑچڑ کیے پیس ڈالا۔ پانی بھرا۔ میز لگائی۔ اور جب بابا ——— کھانے پر آئے تو ہر ہر چیز بھاگ بھاگ کر خود ان کے سامنے رکھ دی۔ مگر بابا نے آنکھ اٹھا کر بھی اسے نہ دیکھا ایک برچھی سے کلیجے کے پار ہو گئی۔

مگر شام کو سونے سے پہلے بابا نے اسے اپنے پاس بلایا۔ اماں بی بھی تخت پر ایک طرف بیٹھی پان کھا رہی تھیں۔ "رانو!" اتنی نرم، اتنی میٹھی، اتنی پیاری آواز۔ کوئی چیز اس کے حلق میں آ کر پھنس گئی "لے یہ مٹھائی اور بی بی اس کی وہ نئی ساری کہاں ہے جو تم لائی ہو۔" وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔

"خفا ہو گئی میری بیٹی۔" بابا نے ہنس کر کہا۔ اس نے نظریں اٹھائیں بابا کی آنکھوں میں بجلیاں سی کوند رہی تھیں اس نے دوڑ کر ان کے پیر پکڑ لیے اور بلک بلک کر رونے لگی! دوسرے لمحے وہ بابا کے سینے سے لپٹی ہوئی تھی! کیسا آنند کیسی راحت کیسی عجیب سی خوشی اس کا انگ انگ مسرت سے بھرپور تھا۔

وہ بستر پر لیٹی تو جیسے اس کے سامنے سے ہر پردہ اٹھ چکا تھا۔

اپنی خامیاں اور کمزوریاں صاف نظر آرہی تھیں۔ مگر ــ اب وہ ان سب باتوں کو چھوڑ دے گی جو راجہ صاحب کے ہاں اس نے سیکھی تھیں۔ اب وہ بابا کی بیٹی ہے۔ وہ اپنے کو بابا کی بیٹی ہونے کے قابل بنائے گی۔ ہاں ہاں اب کبھی اس سے اماں بی اور بابا کو شکایت نہ ہوگی۔ کبھی نہیں۔ کبھی نہیں!

دو دن اور رات کی تھکی وہ بے خبر سو رہی تھی کہ اسے لگا بابا پاس کھڑے ہیں "رانو بیٹی۔ رخصت۔ رخصت رانو" اس نے ہاتھ پھیلایا ـــــــ مگر خوفناک چیخوں کی آوازوں نے اسے جھنجوڑ کر بیدار کر دیا۔ گھر میں ایک قیامت بپا تھی۔ اندر سے باہر تک سب رو رہے تھے، چیخ رہے تھے۔ وہ بدحواس ایک ایک سے پوچھ رہی تھی۔ "کیا ہوا؟ کیا ہوا؟" مگر کسی کو ہوش نہ تھا کہ جواب دیتا۔ اماں بی کا کمرہ خالی تھا وہ دوڑتی ہوئی نیچے اتری بابا کے کمرے کے سامنے بہت سے لوگ کھڑے تھے۔ باولوں کی طرح سب کو چیرتی پھاڑتی وہ اندر گھسی ـــــــ پلنگ پر بابا سیدھے سیدھے لیٹے تھے۔ پٹی پر سر رکھے اماں بی بے حس بیٹھی تھیں!!

وہ سکتے کے عالم میں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ سسکیوں اور آہوں کا دھواں بڑھتا رہا۔

چیخوں کی آوازیں آتی رہیں۔ انسانوں کا سیلاب بڑھتا رہا۔ جانے کب تک وہ یوں ہی کھڑی ایک ٹک اپنے بابا کے چہرے کو دیکھتی رہی۔ لبوں پر وہی میٹھی مسکراہٹ۔ چہرے پر وہی محبت کی چمک۔

پھر وہ کھڑی کھڑی جھومی اور اپنے بابا کے قدموں کے پاس گر پڑی اور جیسے کہیں دور سے ایک آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"اس چھوکری کو ادھر ڈال آئے۔ کوئی"

"بابا ـــــــ" اس کے منھ سے نکلا۔ اور پھر وہ کہیں نیچے نیچے دھنستی چلی گئی ـــــــ

پرستان

اس سے پہلے تو زندگی اتنی بوجھل نہ تھی!!

بچے کو ایک کولھے سے دوسرے پر منتقل کرتے ہوئے بھی "وہ پرستان" ہی کو گھورے جا رہی تھی۔ سال بھر کا بچہ کسی طرح سنبھل ہی نہ رہا تھا۔ بار بار کھسک جاتا، بار بار وہ شلوار اور بچے دونوں کو اوپر کھسکاتی۔

سرخ اور زرد اور کاسنی پھولوں سے بھرے باغیچے کے لدے پھندے پیڑوں کے پیچھے سونے کی گول تھالی دھیرے دھیرے سرک رہی تھی ——— کتنی گول، کتنی سندر جیسے تنور سے نکلی گول گول سرخ روٹی!

پیٹ میں زور سے مروڑ اٹھی۔ کئی روز سے روٹی بھی تو پیٹ بھر نہیں کھائی تھی۔

اس نے آسمان کی طرف نظر اٹھائی ——— "وہ ———" وہ دیکھ بھیا جیسے اپنے ساتھ بچے کا بھی دھیان بٹانا چاہتی تھی۔ سورج سے رنگ اور روشنی چرا کر بادلوں کے ٹکڑے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ "آج یہ سب لڑکے لڑکیاں کیا مر گئے۔" اس نے چاروں طرف پڑوسی بچوں کو ڈھونڈا۔ جانے وہ سب شر بر چھوکرے جو اسے دیکھ کر آوازے لگاتے تھے، وہ ہم عمر لڑکیاں جو اپنے بھائی بہنوں کو گود میں لٹکائے اسی کے ساتھ باتیں ملکایا کرتی تھیں۔ وہ ان کے چھوٹے بہن بھائی۔ کہاں گئے یہ سب؟ بس ایک ننھی سی سرخ دم کی نیلی چڑیا ادھر سے ادھر پھدک

رہی تھی —— اس کی طرح تنہا —— مگر وہ اداس نہ تھی! کیسی چہک رہی ہے —— اس کے کوٹھے پر کوئی بچہ نہیں ہے نا۔ اسے اس خوبصورت رنگین سنہری نقش ونگار بنے جھولے پر اچکنے سے کوئی روکنے والا نہیں ہے —— ارے ارے —— وہ تو ان ریشمی گدوں اور تکیوں پر بیٹھ گئی جن سے ٹک کر فیشن والی۔ سنار سندر لڑکیاں، اور وہ خوبصورت لڑکا اور اس کے یار دوست بیٹھ کر دھیرے دھیرے جھولا جھولتے ہیں اور پھر کبھی کالی گول بڑی سی میز باغیچہ میں بچھ جاتی اور آئیکریم —— ہاں ہاں شانو نے یہی نام تو اسے بتایا تھا —— کھیلیں تھے —— کتنا اچکیں ہیں، کدن کو دیں، قہقہے لگا دیں اور چیخیں مارے ہیں —— اور جانے وہ کیا کھیل ہے ——؟ لمبی سی میز، بیچ میں چھوٹا سا جال اور سفید سفید گیند۔ اور چھوٹے چھوٹے بلے! شانو کو اس کا نام تو یاد نہیں رہا —— کنگ کانگ —— یا جانے کیا کہے تھی! اور کیسے کیسے سنار کپڑے پہنتے ہیں یہ لڑکیاں —— مگر نانی کہے ہے یہ ننگی رہو ہیں ہیں!! ننگی! ہنھ! ننگی تو وہ ہے —— اس نے اپنی دس جگہ سے پھٹی اور بسلی شلوار، تار تار اوڑھنی اور بیٹھ پر سے پھٹے جمپر پر حسرت بھری نظر ڈالی! بڑی آئیں انھیں ننگی کہنے والی! کیسی کیسی خوبصورت فراکیں، کیسی کیسی چمکتی پھولدار قمیص پہنے ہیں۔ وہ تو —— کیا ہوا باہیں نہیں —— ان کے کرتوں ہیں —— یا ٹانگیں ننگی ہوویں ہیں۔ یہ تو سبھی میموں کا، سبھی بڑے آدمیوں کا پہناوا ہے —— ہنھ یہ ہڑونگا پن، یہ ناچ گانا، یہ اچھل کود شریف زادیاں اور بھلے گھر کے لونڈے کریں ہیں —— توبہ توبہ —— اس سے تو اپنے قصبے میں بھلے تھے —— دیکھ عزیزن —— اپنی بیٹی کو سنبھال کر رکھ —— بترہ برس کی جوان چھوکری —— اس محلے میں بگڑ نہ جاوے ——" ماں چپ چاپ دادی کو دیکھتی.... سامنے لیٹے کھانستے ہوئے دادا پر نظر ڈالتی —— اپنے پانچ چھوٹے چھوٹے بچوں کا دھیان کرتی اور اس مفلسی —— میں ککڑی کی بیل کی طرح بڑھنے والی اپنی اس بیٹی کو دیکھتی جو اس حال میں بھی غضب کا رنگ روپ نکال رہی تھی اور ٹھنڈی سانس لے کر

چپ ہو جاتی ــــــ"

"تو اسے گھر سے نکلنے نہ دیا کر۔" دادی اور جلے پر نمک چھڑکتی ــــــ خود تو سارے دن کھوپڑی پر برقعہ کی ٹوپی لٹکائے گھر گھر پھرتی رہو ہے ــــــ اور انھیں گھونٹ کر مار دینا چاہے ہے!

"ماں جی ــــــ یہ ذرا سی تو کوٹھری ہے ــــــ اور ہم چھ سات دم ــــــ دن میں دو چار گھنٹے بچے باہر سڑک اور میدان میں بھی نہ کھیلیں تو گھٹ کر مر نہ جاویں گے:" دبی زبان سے ماں نے کہا ــــــ "میں تو پہلے ہی نہیں چاہتی تھی۔ اپنے قصبے سے اس شہر میں آنا ــــــ پر سبھی سر ہو گئے ــــــ اور سب سے زیادہ تم ــــــ کہ شہر میں چلیں، چار روپے روز مزدوری ملے گی۔ اب دیکھو آٹا کتنا مہنگا ہے ــــــ پانی تک پیسوں سے ملے ہے ــــــ ہوا بھی نصیب نہیں ــــــ نمک، مرچ، دال ترکاری کو ترس ترس کر بچے رہ جاویں ہیں ــــــ اور ان کے باوا جب سے یہاں آئے ــــــ مزاج اور بھی خراب ہو گیا ہے۔"

ماں نے رونا شروع کر دیا تھا۔ دادی بڑبڑانے لگی ــــــ وہ چپکے سے پھر کوٹھری سے باہر نکل آئی۔

بھیا کب رھے سے لگ کر سو گیا تھا۔ "پرستان" میں بڑی چہل پہل نظر آ رہی تھی ــــــ اونچی سرخ دیوار جس پر پیلے، نیلے اور گلابی پھولوں کی بیلیں چڑھی تھیں اس کو چھپائے تھیں مگر دو سرخ سرخ بڑے بڑے پھاٹک اس کی جھلک دکھا دیتے تھے ــــــ وہ اکثر بھیا کو لے کر پھاٹک کے سامنے سڑک کے دوسری طرف میدان میں بیٹھی یا کھڑی ادھر تکا کرتی تھی۔

"پرستان" کے دونوں حسین بچے ــــــ آیا کے ساتھ جھولے کے پاس کھیل رہے تھے اور ان کے ارد گرد آس پاس کی کوٹھیوں کے کئی صاف ستھرے بچے رنگ برنگے سنہرے رنگ دار کپڑے پہنے ہنس کھیل رہے تھے۔

اس نے سوچا ــــــ اسی طرح کھیلنا کبھی اس کی قسمت میں نہ تھا؟ ہوش

سنبھالتے ہی ایک نہ ایک بچہ اس نے اپنی گود یا کندھے یا کوٹھے پر پایا تھا ـــــ ایک پیروں چلنے لگتا تو دوسرا اس کی جگہ آن موجود ہوتا! مگر وہاں ـــــ اپنے گاؤں میں یہ بات بری نہ لگتی تھی۔ اس کی سب ہم عمر لڑکیاں اور لڑکے یونہی بھائی بہنوں کو لیے کھیلا کرتے تھے ـــــ بچوں کی ہنسی ان کی پیاری پیاری باتیں، ان کی معصوم شرارتیں، ان کی چہلیں ـــــ اسے اچھی لگا کرتی تھیں۔ سب بچے کھیلتے کودتے، شرارت کرتے، پاس گزرتی سائیکل یا تانگے پر کنکر پھینکتے، کبھی کوئی ٹرک یا لاری گزر جاتی تو دور تک اس کی دھول کے پیچھے بھاگتے ـــــ اور اگر کوئی موٹر کار آجاتی تو ـــــ واہ وا ـــــ سب مل کر اسے گھیر ہی لیتے تھے ـــــ وہ منگو بذات تو پتھر پھینکا کرتا تھا۔ بھاگتی کار پر ـــــ کتنا مزا آتا تھا۔۔۔

مگر یہاں ـــــ اس بڑے شہر کی یہ بڑی بڑی کوٹھیاں اور بنگلے۔ یہ محل نما مکان ـــــ یہ ہزاروں موٹریں اور ٹیکسیاں اور اسکوٹر اور سائیکلیں۔۔۔ اور یہ جھلملاتے ریشمی اور جانے کیسے کیسے رنگوں اور وضع کے کپڑے پہنے حسین حسین لڑکیاں جن کی کمریں سونے کی چھن چھن کرتی زنجیریں اور ننگی ننگی ٹانگوں میں کھٹ کھٹ کرتے جوتے اسے بہت ہی اچھے لگتے تھے ـــــ اور لڑکے! توبہ ـــــ یہ لڑکے ہیں یا لڑکیاں ہیں؟ رنگین ریشمی کرتے یا بنیان اور اونچی اونچی پھنسی پھنسی پتلونیں یا غرارے جیسے پاجامے پہنے اور غضب یہ کہ زیور بھی تو پہنے ہیں۔ زیور اپنے قصبے کے لالہ جی کے کانوں میں مندریاں تو دیکھی تھیں اور بڑی حویلی کے رائے صاحب کے لڑکے کے گلے میں سونے کا کنٹھا بھی۔ مگر یہ عورتوں کے سے زیور، انگوٹھیاں اور ہار تو نہ تھے ـــــ

بس اسے تو "پرستان" کا شہزادہ "اچھا لگتا ہے ـــــ عمر میں شاید اس سے دو ایک سال چھوٹا ہی ہوگا ـــــ کیسا بھولا بھالا چہرہ ہے اس کا ـــــ مگر ماشاء اللہ سے ـــــ اتنا موٹا تازہ، اتنا لال لال ـــــ دن بھر کھاتا

—— بھی تو رہتا ہے۔ سیب، کیلے اور انگور اور مٹھائی اور کیک اور جانے کیا اور کیا —— مگر بھئی ان لڑکیوں اور دوسرے لونڈوں کی طرح بد دماغ تو نہیں ہے —— وہ جب بھی سڑک پر سے گزرتا اس کو اور اس کے بھائی بہنوں کو بائی بائی یا ہاؤ ہاؤ یا کچھ اور کہہ کر ضرور مسکرا دیتا —— کتنے کھلونے تھے اس کے پاس۔ بندوق اور تیر کمان، اور سائیکل، ہوائی جہاز اور ریل گاڑی اور جانے کتنی اور چیزیں۔ کبھی کبھی وہ اپنی لمبی لمبی ٹانگوں پر اچک کر دیوار پر بیٹھ جاتا اور وہاں کھڑے بچوں کو زور سے "ہاؤ" کہہ کے ڈرا دیتا۔ مگر اسے دیکھ کر ہمیشہ ہنس دیتا تھا —— "اے لڑکی —— اے بیوٹی فل گرل —— یہ بچہ —— یہ تمھارا بچہ ہے۔" وہ شرما جاتی —— "توبہ توبہ —— یہ تو میرا بھیا ہے۔"

"بھیا ہے؟ تو اسے آپا کیوں نہیں رکھتی —— آؤ تم میرے ساتھ کھیلو۔"

"آپا —— آپا کون؟"

وہ حیران ہو کر پوچھتی تو وہ خود بھی حیران سا ہو جاتا ہے "آپا —— آپا ہے اور کون" اور دھم سے دیوار پر سے سڑک پر کود پڑتا —— "کتنی کتنی پیاری ہو تم لڑکی —— بیوٹی فل ——" وہ شوخ نظروں سے اسے دیکھتا۔ وہ گھبرا جاتی ہے —— شرما جاتی ہے اور عین اس وقت کسی لمبے تڑنگے گورے چٹے جوان آدمی کا چہرہ دیوار پر ابھرتا ہے "پرنس، ڈارلنگ —— وہیر آر یو —— کم اِن ——" اور اسے پاس کھڑا دیکھ کر یہ محبت و مسرت بھرا چہرہ ایک دم سرخ اور خوفناک ہو جاتا ہے۔ "کم اِن کم ان —— وہاں کہاں کھڑے ہو۔ یہ سڑک گلی کے لڑکے لڑکیوں کے ساتھ کھیلنا . . ."

مگر "شہزادہ" اپنے ابا کی بات مانتا ہی کب تھا —— جب کبھی موقع ملتا کبھی پھاٹک کے پاس آ کر، کبھی دیوار پر چڑھ کر، کبھی نظر بچا کر اپنی چھوٹی

سی موٹر سائیکل سڑک پر لا کر اس سے اور دوسرے لڑکے لڑکیوں سے باتیں
کرنے لگتا تھا: "کتنا پیارا ہے یہ لڑکا ـــــ جیسے شہزادہ ہو ـــــ" ایک
دن اسے ـــــ شانو نے بتایا کہ اس کا انگریزی نام جو ہے اس کا مطلب شہزادہ
ہی تو ہے۔ مگر شہزادہ کا چھوٹا بھائی اور منی بہن اور بڑی آپا ـــــ اوہ! وہ
سب تو بڑے خر دماغ تھے ـــــ بات بے بات ان لوگوں پر غرانے ـــــ
سڑک پر کھڑا ہونا مشکل تھا ـــــ ایک دن تو اس کے بھیا کو غصہ آ گیا۔" سڑک
تمہارے باپ کی ہے کیا ـــــ ہم تو ضرور کھیلیں گے ـــــ" وہ اسے گھسیٹتی رہی۔
مگر بھلا جمو کس کے قابو میں آنے والا تھا ـــــ بڑی اچھل کود مچائی اس گھر کے بچوں
نے جانے انگریزی میں کیا کہا ـــــ جمو نے اپنی دیسی زبان میں خوب گالیاں بکیں
اور پھر کئی آدمی اڑوس پڑوس سے نکل آئے۔ پاپو نے جمو کے دو چپت مارے
ماں نے اسے برا بھلا کہا اور کئی دن تک وہ لوگ۔ ادھر آنے کی ہمت نہ کر سکے۔
اصل میں جمو سے سب یوں بھی تو جلے ہوئے تھے کہ وہ غلیل سے ان کے باغ کی
چڑیاں مار گراتا تھا اور اپنے ایک پتنگ سے ان کے دس پتنگ کاٹ چکا تھا۔
اور جب شہزادہ اور چھوٹا لڑکا چیخا چلایا تو ان کے نوکر نے سمجھایا" صاحب یہ تو
قاعدہ ہے ـــــ کوئی بھی کسی کی پتنگ کاٹ سکتا ہے ـــــ آپ بھی کاٹ لیجیے گا
ان کی پتنگ!"

وہ پھر خیالوں میں کھو گئی تھی مگر گود کے بچے کی ٹیں ٹیں نے اسے چونکا
دیا ـــــ جب بھی وہ کچھ اچھی اچھی باتیں سوچنے لگتی ہے یہ منحوس رونا چلانا شروع
کر دیتا ہے ـــــ اس نے بھیا کو کندھے سے لگایا اور پھاٹک میں سے اندر کی
طرف جھانکا!

سبز سبز لان پر لال، پیلی، نیلی اور سبز کرسیاں اور میزیں بچھی تھیں ریشمی اور
بنارسی ساڑھیاں پہنے عورتیں ان پر بیٹھی تھیں، مرد سوٹ اور اچکن پہنے ہنس
رہے تھے ـــــ ان میں شہزادے کی ممی، ڈیڈی، بہنیں اور ان کی سہیلیاں

اور بہت سے لڑکے بھی تھے۔ ہائے اللہ ___ کتنا شور مچاتے ہیں یہ! باجے پر ریکارڈ چڑھا رکھا تھا اور کئی لڑکے لڑکیاں ناچ رہے تھے ___ توبہ ___ ناچ رہے ہیں کہ بندر اچک رہے ہیں ___ کبھی اکیلے اکیلے کودتے کبھی ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ لیتے کبھی ایک دوسرے کو جھٹا لیتے ___ اس کا منہ سرخ ہوگیا۔

" جو کہیں دادی دیکھ لیتی تو مار ہی ڈالتی۔ اس نے گھبرا کر رخ بدلا۔ اب سب عورتیں اور مرد ایک میز کے پاس جمع ہو گئے تھے ___ "کیسے سندر سندر برتن ہیں یہ ___ اور کھانے کی کتنی بہت سی چیزیں میز پر لگی ہیں ___ یہ بیچ میں بڑا سا مکان سا کیا بنا ہے جس پر موم بتیاں جل رہی ہیں ___ ؟ ہاں ہاں شالو نے بتایا تھا نا ___ سالگرہ کا کیک بننے والا ہے جس پر موم بتیاں جلیں گی اور چھوٹی بی بی اسے پھونک سے بجھا دیں گی ___ ہاں ___ یہ دیکھو وہ سب تالیاں بجا رہے ہیں ___ اور کچھ گا رہے ہیں ___ کیا گا رہے ہیں؟ سمجھ میں نہیں آرہا وہی انگریزی گانا ہوگا اور کیا ___ اپنے یہاں تو ڈھولک پر ایسے سندر سندر گیت گائے جاویں ہیں۔"

اس نے پھر اندر جھانکا ___ سب کی پلیٹوں میں کھانے کی چیزیں بھری ہوئی تھیں۔ پوریاں اور کباب اور مٹھائی اور پکوڑے اور جانے کیا اور کیا ___ بیرے سب کے پاس چیزیں لے کر جا رہے ہیں اور وہ انکار کر رہے ہیں۔

وہ ہوتی تو ___ وہ ہوتی تو ___ "پیٹ میں زور سے آگ کا گولہ اُٹھا۔ آج دوپہر پیاز کی ڈلی اور چٹنی کے ساتھ ایک ہی روٹی تو کھائی تھی۔ آٹا ختم ہوگیا تھا..... بابو کو مزدوری نہ ملی تھی ___ راشن کے لیے قرضہ بھی تو نہ ملا تھا ___ .

ایک لڑکے نے کتے کو دو کباب ڈالے جو وہ گرنے سے پہلے ہی ہڑپ کر گیا ایک عورت نے بلی کو کچھ دیا اور وہ لپ لپ کھانے لگی۔

شہزادے کے چھوٹے بھیا کے ہاتھ سے پلیٹ گر گئی۔ وہ رونے لگا۔

"کوئی بات نہیں ڈارلنگ ـــــ کوئی بات نہیں ـــــ بیرا اور پلیٹ لاؤ بابا کے لیے ـــــ اور یہ صاف کر دو سب۔"

"اے ہے قالین خراب ہو گیا،" موٹی چھوٹی کالی آیا نے کہا۔

"ہو گیا تو ہو گیا بلا سے ـــــ کیا میرے بچے سے زیادہ ہے" ممی نے بدمزاجی سے کہا ـــــ

جانے منھ میں یہ اتنا پانی کہاں سے بھر آیا ـــــ اور پیٹ میں یہ مروڑ کیوں اٹھ رہی ہے؟

اس نے پیٹھ موڑ لی ـــــ اگر کہیں دادی سن لے؟ ہائے اللہ ندیدہ پن ـــــ کتنی بری بات ہے ـــــ جس دن ان کے گھر روٹی نہیں پکتی اس دن تو ماں گھر سے چھوٹے بچوں کو بھی نکلنے نہیں دیتی۔"

"اے لڑکی یہاں کیوں کھڑی ہے" مالی نے جھڑکا۔

"کھڑے ہیں ـــــ تم سے مطلب ـــــ سڑک ہے ـــــ سب کھڑے ہوتے ہیں۔" اس نے گھور کر کہا ـــــ مگر پھر آہستہ سے کھسک کر شانو کی ماں کے کوارٹر میں گھس گئی۔ شانو کا باپ "محل" میں باورچی تھا اس لیے تو شانو، زیبو اور شریف ان کے ہاں بے تکلف آتے جاتے تھے!

"کیا پکا رہی ہو خالہ" اس نے چولھے پر دھری ہنڈیا کھولی۔

"ارہر کی دال ہے بچی" شانو کی ماں نے روٹیاں سینکتے ہوئے کہا۔ "لے کھالے ذرا سی۔"

وہ کبھی کسی کے ہاں کھاتی نہ تھی مگر اس وقت بھوک سے بے چین تھی اور پھر دو چار نوالے اسے کھانے ہی پڑے۔ "ہائے خالہ کتنے مزے کی دال ہے۔" اس نے تعریف کی۔

"خالہ یہ شانو، زیبو سب کہاں گئیں؟" خالہ کا گھر ہمیشہ اپنے اور پڑوس کے بچوں سے بھرا رہتا تھا۔ یہ آج خالی خالی کیوں ہے؟

"چھوٹے بچوں کو ان کا چاچا لے گیا ہے ——— اور شانو اور زیبو ——— صاحب کے ہاں تماشا دیکھنے گئی ہیں۔"

"تم نہیں جائیں خالہ تماشا دیکھنے؟"

"نا بچی ——— مجھے کہاں فرصت ———"

اس کا دل مچل اٹھا ——— سب جاتے ہیں۔ سب دیکھتے ہیں۔ شانو، زیبو، شریف ——— اور یہ ساری گٹ پٹ کرنے والی لڑکیاں ۔ ۔ ۔ ۔ پھر وہ کیوں نہیں جا سکتی مگر ماں خفا ہوگی پھر دادی نے کئی بار سمجھایا تھا۔ "او بیٹی اپنی عزت اپنے ہاتھ ان امیروں رئیسوں سے بچ کر رہنا چاہیے ——— جانے کب جھڑک دیں۔ ڈانٹ دیں ——— پھر ہم غریب لوگ ہمارا ان کا کیا مقابلہ؟"

"شانو اور زیبو جو جاتی ہیں۔" اس نے روہانسی ہو کر کہا تھا۔

"بھاڑ میں ڈال انھیں ——— وہ تو ان کی باورچی کی لڑکیاں ہیں ——— ہم عزت دار لوگ ہیں۔ دیکھا نہیں کیسی بگڑتی جا رہی ہیں انزن سترن پہن کر ——— منھ ٹیڑھا کر کے بولنے لگی ہیں، اللہ ماریاں ——— ایک دن ماں سر پہ ہاتھ رکھ کے روئے گی ———" اور دادی نے اپنا راگ شروع کر دیا تھا۔

ہنھ یہ نانی دادیاں۔

وہ باہر نکلی تو سڑک سنسان پڑی تھی صرف پرلی کوٹھی کا نوکر لڑکا کھڑا تھا۔

"آج سب کہاں گئے جمیل؟"

"وہی بنگلہ میں تماشہ دیکھنے ٹی۔ وی کا ———"

"کیسا ہوئے ہے؟"

"بس جیسا سینما کا تماشہ ——— ہم نے تو شہر میں دیکھا تھا ———"

"ہم نے تو سینما بھی نہیں دیکھا ——— باپو نے ہمیں فلم بھی نہیں دکھایا۔" روہانسی ہو کر اس نے کہا اور روتے بھیا کو زمین پر بٹھا دیا اس نے اور زور سے رونا شروع کر دیا۔

لڑکا دوسری طرف جا چکا تھا۔ اس نے پھاٹک پر سے اچک کر دیکھا کہیں سے نیلی اور پیلی اور سنہری روشنی لان پر پڑ رہی تھی اور دوسرے بڑے گیٹ سے رنگ برنگی پتلونیں، بل بوٹم۔ جھلملاتے فراک، رنگین چھپے ہوئے کرتے ریشمی ساڑھیاں "پرستان" میں جا رہی تھیں۔ سب جاتے ہیں —— تو وہ کیوں نہیں جا سکتی؟ مگر —— مگر...... اس نے گھبرا کر خود پر نظر ڈالی۔ شاید اس لیے کہ اس کی شلوار میلی ہے۔ جس میں کئی پیوند لگے ہیں۔ کرتا پھٹا ہوا ہے اور دوپٹہ کا رنگ کچھ ایسا ہے کہ وہ خود بھی پتا نہیں چلا سکتی —— اس کے سنہری بکھرے بال پھٹے دوپٹے سے جھانک رہے تھے —— ہنھ!

بچہ بلک کر رویا —— ایک کتا اس کا پاؤں چاٹ رہا تھا —— اس نے لپک کر بھیا کو گود میں اٹھایا —— "یہ روتا بسورتا بھیا —— بھلا مجھے کون گھسنے دے گا" اس نے پھاٹک پر سر ٹیک دیا۔

ہری سڑک کے ادھر ایک چھوٹے سے گھر میں رہنے والی خالہ بی جس سے وہ قرآن پڑھنے جاتی تھی اس طرف آ رہی تھیں —— "کیا ہے گلابو"؟ اس کا نام تو جو تھا مگر خالہ بی اسے گلابو کہتی تھیں۔ "بالکل گلاب کا سا رنگ ہے اس بچی کا —— اور آنکھیں جیسے جھیل کے کنول —— بڑی ہو کر نور جہاں نکلے گی بالکل ——" انھوں نے اپنی سہیلی سے کہا تھا۔

"رو کیوں رہی ہے۔ ٹی۔ وی دیکھنا چاہتی ہے؟" اس نے جلدی جلدی گردن ہلائی۔ اندر سے آنے والی چھم چھم کی آوازیں دل چھینے لے رہی تھیں۔

"آ جا میرے ساتھ —— آج میں بھی جا رہی ہوں ——" اور وہ ان کے ساتھ یوں کھنچی چلی گئی جیسے لوہا مقناطیس کے ساتھ —— لان اور باغیچہ پار کر کے بڑے سے برآمدے میں ایک بہت بڑا سا ریڈیو رکھا تھا —— مگر اس کے بیچ میں کیڑا نہ تھا —— اس میں سے روشنی اور آوازوں کی بھوار سی نکل رہی تھیں —— سامنے فرش پر بہت سے بچے اور

لڑکے اور لڑکیاں بیٹھے تھے۔ بڑے لوگ سب باہر کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ خالہ بی ادھر چلی گئیں اور وہ چپکے سے فرش کے ایک کونے میں ٹک گئی۔ کیسا گدگدا فرش ہے۔ بچے ہنس رہے تھے۔ شرارتیں کر رہے تھے۔ اچھل کود رہے تھے۔ لڑکیاں قہقہے لگا رہی تھیں —— کبھی وہ پیچھے مڑ کر بڑے آدمیوں کو دیکھ لیتی، کبھی ان کے لڑکے لڑکیوں کو جو تماشہ کم دیکھ رہے تھے اور چیخ چلا زیادہ رہے تھے۔ کئی بار اس کی نظر "پرستان" کے شہزادے کی طرف اٹھ گئی جو ادھر ادھر بھاگتا دوڑتا، کھاتا پیتا، لڑکیوں کو ستاتا، لڑکوں سے جھگڑتا پھر رہا تھا —— مگر اس کے ہونٹوں کی مدھر مسکراہٹ اس کے دل میں اترتی چلی جاتی تھی۔ مگر یہ کیا بات ہے کہ اسے کوئی کچھ نہیں کہتا سب ہنستے رہتے ہیں۔ اور جب وہ یا چھوٹا بھیا شرارت کریں تو ماں یا باپ مارنے لگتے ہیں۔

ذرا دیر میں اس کی توجہ "ریڈیو" نے کھینچ لی۔ ایک بڑی سندر لڑکی، خوبصورت کپڑے اور زیور پہنے ایک پیڑ کی ڈالی پکڑے گا رہی ہے۔ ایک لمبا سا لڑکا پھنسی پھنسی پتلون اور اونچا اونچا بنیان پہنے درخت کے آس پاس گھوم گھوم کر اس کی آواز میں آواز ملا رہا تھا۔ جانے کب وہ فرش کے سرے سے اٹھ کر بچوں کے بیچ میں جا بیٹھی۔ جانے کب دوسری لڑکیوں کے ساتھ ہنسنے لگی . . . وہ تو سب کچھ بھول گئی تھی۔ اپنے کو گود کے بھیا کو، ارد گرد کے ان شاندار لوگوں —— سندر شہزادے اور پرستان کو —— اور پیٹ میں اٹھتی آگ کو . . . .

"ارے رے —— یہ کیا ہے —— کیا ہے بھئی۔"

"کون بچہ رو رہا ہے۔"

"نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا ——"

"آخر یہ ہے کون کم بخت۔"

آوازیں کان میں آتی رہیں مگر وہ اپنی جنت میں گم تھی۔

"ارے چھوکری کالی، موٹی، چھوٹی، عورت نے اسے جھنجھوڑ ڈالا —— کون ہے تو۔"

"اے ہے بیگم صاحب جانے کون باولی سی چھوکری ہے ——"

"آپا —— یہ میرے ساتھ آئی ہے ——" پیچھے سے خالہ بی کی آواز سنائی دی ——

"جو ہے وہ منھ اٹھائے چلا آتا ہے۔ جانے کیا کیا الکشن ساتھ لاتے ہیں یہ گلی کوچوں کے بچے۔" ایک بھاری مردانی آواز کان میں آئی!

"اے ہے غضب —— اس موٹے چھوکرے نے قالین پر موت دیا۔

"آخر یہ ہے کون ——؟"

"گٹ آوٹ —— بوڈرٹی تھنگ"

وہ آسمان سے زمین پر آپڑی —— بھیا اس کی گود سے قالین پر پڑا تھا اور ایک گول گیلا نشان اس کے جرم کو افشاں کر رہا تھا —— اس نے گھبرا کر بچے کو گود میں اٹھا لیا!

کون ہے —— کہاں سے آئی ہے؟ بیگم صاحب نے سب کو کھلی چھوٹ دیدی —— چلو —— نکلو باہر —— بھانت بھانت کی آوازیں اس کے کانوں میں آرہی تھیں۔

"پڑوس کی کوئی بچی ہوگی" ایک مہربان سی مردانی آواز سنائی دی۔ کوئی بات نہیں بیٹی —— بیٹھ جاؤ —— دیکھو فلم ——"

اس نے نظر اٹھائی سفید بالوں والے ایک خوبصورت سے بزرگ اس کے پاس کھڑے تھے۔

"ڈیڈی —— آپ یوں ہی سب کو سر پر چڑھا لیتے ہیں" شہزادے کی ممی نے غصے سے کہا

"پڑوس میں تو ہزاروں بچے ہیں —— فیملی پلاننگ کے باوجود ——"
کسی نے طنز کیا۔ "کیا سب یہاں آکر روز پریشان کیا کریں گے؟"
"ارے یہ مائیں جن جن کو چھوڑ دیں ہیں۔ انھیں فکر ہی کیا ہوہے۔"
موٹی آپا کی زبان چلے جا رہی تھی۔

لڑکیاں قہقہے لگا رہی تھیں۔ لڑکے سیٹیاں بجا بجا کر کچھ کہہ رہے تھے۔ عین اس وقت کہیں سے "شہزادہ" اس کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔
اوہ بیوٹی —— کیسی لگی پکچر —— ؟"

اس نے جواب نہ دیا۔ اس کی آنکھیں دھندلا چکی تھیں۔ اور وہ اندھا دھند سب کو الانگتی پھلانگتی باہر کی طرف دوڑ رہی تھی —— پیچھے سے خالہ بی پکار رہی تھیں "گلابو —— اری گلابو —— ذرا ٹھہر تو بچی ——" مگر اس نے کچھ نہیں سنا —— گلاب کی جھاڑیوں سے الجھتی، نرم کیاریوں میں گرتی وہ پھاٹک کے باہر جا چکی تھی۔

گھر میں گھسی تو ماں کی گالیاں سواگت کو موجود تھیں!

اس نے پھبا کو چھلنگے پلنگ پر دے مارا اور زمین پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

دس دن تک وہ بخار میں پھنکتی رہی۔ غفلت میں اول فول بکتی رہی۔
"پرستان شہزادہ۔ ریڈیو —— سیب، مٹھائی —— خالہ بی —— منا۔ مرجائے منا بھیا —— جاؤ —— جاؤ —— نکل جاؤ —— کہاں سے آکر مرجاتے ہیں یہ لوگ گٹ آوٹ، گیٹ آوٹ...... ڈرٹی تھنگ......"

ماں رو رو کر دعائیں مانگتی رہی، باپ قرض لے کر علاج کرتا، خالہ بی اس کے لیے دودھ اور پھل بھیجتی اور دعائیں دم کرتی رہیں۔ اور منا بھیا اپنی ننھی سی ماں کے لیے پھڑکتا رہا......

اور کوٹھیوں کی چہل پہل بدستور تھی!
بنگلوں میں دعوتیں ہوتی رہیں۔
پرنس سائیکل اڑاتا، کرکٹ کھیلتا رہا۔
"شہزادیاں" پنگ پونگ کھیلتی اور ڈانس کرتی رہیں۔
ریڈیو بجتے رہے؛
ٹی۔وی دیکھے جاتے رہے۔
پکوان اور پلاؤ پکتے رہے۔
شیشے چھنکتے رہے۔
گلاس ٹکراتے رہے۔
اور وہ بخار میں جھلستی بڑبڑاتی رہی۔ ان دیکھے پرستان کے
خواب دیکھتی رہی۔

آج وہ اپنے باپو اور بڑے بھیا اور چھوٹی بھنّو کے ساتھ سچ مچ کے
پرستان کی سیر کرکے آئی تھی۔
باپو نے بیماری میں اس سے وعدہ کیا تھا، کہ وہ اسے فلم دکھائیگا
اور جب تک وہ ٹکٹ لایا تو دادی نے بہت صلواتیں سنائیں، ماں روئی
پیٹی کہ دو وقت کی روٹی چلے اتنے روپوں میں ــــ مگر باپو نے بیمار
بچی سے وعدہ کیا تھا ــــ ضرور پورا کرے گا ــــ۔
اور تین گھنٹے وہ سچ مچ کے پرستان کی سیر کرتی رہی تھی۔
اتنے سندر گھر، ایسی خوبصورت عورتیں اور مرد، اتنے جھلملاتے
کپڑے اور زیور لیسے پیارے پیارے بچے، اتنے بہت سے میٹھے میٹھے
گانے اور دیہاتی ناچ ــــ اور پھر پھول لدا باغ، سر سبز پہاڑ اور
سفید برف، بڑی بڑی موٹریں ــــ اور وہ دولھا دلھن ــــ

اور وہ پھولوں سے لدا چھپر کھٹ ـــــ اور وہ شہزادہ ......

وہ آپ ہی آپ شرما گئی تھی اسے دیکھ کر!

واپس آئی تو نہ روکھی روٹی بری لگی جو ماں نے غصے میں پکا کر رکھی تھی اور نہ تنگ کوٹھری میں دم گھٹا۔ نہ بھائی بہنوں کی چیں چیں نہ ماں کی گھڑکیاں ـــ بری معلوم ہوئیں۔

صبح وہ پھر ببا کو گود میں لیے کوٹھی کے پھاٹک کے سامنے کھڑی تھی!

شانو اور زیبو اسے رحم بھری نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

اس کے سنہری لمبے لمبے بال جھڑ گئے تھے۔ آنکھوں کے نیچے گہرے سیاہ گڑھے پڑ گئے تھے۔ گلابی رنگ سنولا گیا تھا ـــــ اور ہاتھ پاؤں سوکھی لکڑی جیسے ہو گئے تھے۔

پرستان میں آج بھی لڑکے لڑکیاں ٹی۔ وی دیکھنے جا رہے تھے۔ مگر اس نے نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔

اور پھر اچانک "شہزادہ" سامنے آ گیا۔ ہنھ ـــ نقلی شہزادہ!

"ارے رے ـــــ تم ـــ تم ـــ؟" وہ حیران ہو کر اسے دیکھ رہا تھا۔

"تم ـــــ وہ ہونا ـــ جس کے بچے نے ـــــ پیشاب کر دیا تھا ـــ" شہزادہ نے پوچھا۔ اس نے منھ پھیر لیا۔

"مگر ـــ وہ ـــ وہ تو بڑی پیاری ـــــ ہیوٹی فل تھی ـــــ اے گنجی کالی لڑکی! وہ خوبصورت لڑکی کہاں ہے" اس نے چڑایا!

"تمھیں کیا مطلب!"

"آج آؤ گی فلم دیکھنے ہمارے ہاں" اس نے صلح کا ہاتھ بڑھایا۔

"ہنھ ـــ کیا دھرا ہے تمھارے گندے ریڈیو ـــ میں ـــ کالی کالی لونڈیاں، ذرا ذرا سی موٹر میں ـــــ ہم خود اپنے باپو کے ساتھ رنگین پکچر دیکھ کر آئے ہیں ـــــ اب ہم روز پکچر دیکھا کریں گے ـــــ

پرستان کی ــــــ" اس نے منہ چڑھا کر انگوٹھا دکھایا اور پیٹھ موڑ کر چلدی!

"پرنس ــــ ڈارلنگ ــــــ وہیر آر ــــ یو ــــــ ادھر آؤ ــــــ

وہاں کہاں کھڑے ہو ــــــ"

"نہیں نہیں ڈیڈی ــــــ ہم تو ــــــ اس گنجی کالی لڑکی کے ساتھ رنگین پکچر دیکھیں گے۔" شہزادے نے بچوں کی طرح مچل کر کہا۔ وہ اپنی کوٹھری کی طرف جاتے جاتے ہنس پڑی۔ آج اس کی آنکھوں میں ایک نئی چمک، ہونٹوں پر ایک مدھر مسکراہٹ تھی! ننھا بھیا جھلنگے پر پڑا رو رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے اسے گود میں اٹھایا اور اپنے برگِ گل سے ہونٹ اس کی چاند ایسی پیشانی پر رکھ دیے۔

یادوں کے کھنڈر

ٹرین پہلے ہی لیٹ چلی تھی۔ راستے میں اور زیادہ لیٹ ہوگئی۔۔۔ لیکن اب اس نے رفتار تیز کردی تھی سیٹ پر بیٹھنا مشکل ہو رہا تھا مگر اس کی پروازِ خیال اس ٹرین سے کہیں زیادہ تیزی سے رواں دواں تھی زندگی کی ٹھوس حقیقتیں جو برسہا برس سے خواب خیال بن گئی تھیں تصور میں زندہ ہوتی جارہی تھیں ـــــ حال غائب ہوچکا تھا ـــــ ماضی نے اپنی باہیں پھیلا دی تھیں۔۔۔۔ کبھی بچپن کی شیریں یادوں کا گہوارہ اسے دھیرے دھیرے ہلکورے دیتا، کبھی لڑکپن کا پرستان اپنے سارے حسن و دلکشی کے ساتھ نظروں میں بکھر جاتا! جوانی کی امنگیں اور آرزوئیں۔۔۔۔ رومانی راتیں اور پُرمسرت رسیلے دن اس کے سینے میں گدگدی پیدا کردیتے ـــــ اس کا پیارا وطن، یادوں کی جنت، پیاروں کا مسکن قریب آرہا ہے ـــــ یہیں تو زندگی کے سنہرے ترین دن ماں کی گود کی جنت میں بتائے تھے ـــــ بزرگوں اور عزیزوں کے محبت اور خلوص کی برکھا یہیں تو ہوا کرتی تھی۔۔۔۔ بڑے بہن بھائیوں کا پیار، ہم سن بھائی بہنوں، دوستوں اور سہیلیوں کا خلوص اور اپنائیت۔۔۔۔ بے فکری کا وہ حسین دور ـــــ بے پناہ مسرت کا وہ خزانہ۔۔۔۔ یہیں کہیں تو دفن ہے۔۔۔

اس نے سر کھڑکی سے باہر کی طرف جھکانا چاہا۔۔۔۔ مگر لوہے کی سلاخوں

نے سواگت کیا ——— مگر یہ چوٹ ——؟ یہ چوٹ حوادثِ زمانہ کی چوٹوں کے مقابلے میں کچھ نہیں ..... کچھ بھی تو نہیں!

"میرا وطن ——— میرا پیارا دیس ——— یہ قلندروں اور درویشوں کا دیس جن کی درگاہیں سینکڑوں برس تک مرجعِ خواص و عام رہیں ......

یہ شاعروں اور ادیبوں، فن کاروں کا دیس، جن کے شعر و ادب اور فن پر آج تک لوگ .... سر دھنتے اور جن کے ناموں کے سامنے عقیدت سے ان کی پیشانیاں ہی نہیں دل بھی جھک جاتے ہیں ..... یہ عالموں کا دیس جن کے علم کے چراغ دور دور روشن ہوئے ...... یہ سوشل ریفارمروں اور قوم کے پرستاروں کا دیش جن کی ان تھک محنت نے سوئے دماغوں میں روشنی اور جاگرتی پیدا کی! یہ نئی اور پرانی تہذیبوں کا سنگم ... یہ ہندو مسلم اتحاد کا امن .... جس کے باسیوں کو اپنی تہذیب پہ ناز، اپنے کلچر پر غرور، اپنے مذہب سے انتھاہ پیار تھا ——— آہ ——— یہ میرا دیس ——— اب میرا کہاں رہا .....؟

جانے گرد و غبار اور دھواں تھا کہ یادوں کی سوئیاں جو آنکھوں میں کھٹک رہی تھیں۔

وہ سب پیارے اب کہاں .....؟ بہت سے اتنے دور دیسوں میں جا بسے کہ ان کی صورتیں بھی اب وطن کے ذروں کو یاد نہ ہوں گی ——— اور جو چند مجھ جیسے یہاں ہیں بھی ——— وہ ——— وہی کون سے یہاں آتے ہیں ——— کون وطن کی خاک کو آنکھوں سے لگاتے ہیں ..... ہاں اس کی یاد ——— اس کی پیاری بیٹھی دردناک یادیں ضرور سینے میں کھٹکتی رہتی ہیں ....

یہ سر سبز زمینیں اب بھی ویسی ہی بھری ہیں جن میں آج اجنبی کسان تہمد باندھے ہل اور ٹریکٹر چلا رہے ہیں ..... کیا اب بھی یہ کھیت موتیوں جیسا سڈول اور سونے سے روپ والا گیہوں پیدا کرتے ہیں ———؟

ہر سال دھرتی ماں کے سینے سے نکلے موتی اس کے آنگن میں آتے تو بہار آجاتی۔ دالان، صحنچیاں اور کمرے ان سے بھر جاتے اور بچے ان پر کودتے اچھلتے، اناج اچھال اچھال کر ایک دوسرے کو ڈھک دیتے...... اور پھر گیہوں چرا کر اس کے بدلے پھل اور مٹھائیاں منگا منگا کر کھاتے ——— آہ! پھلوں کا رس! مٹھائیوں کی شیرینی اب کہاں گئی؟

کھیت ختم ہو رہے تھے اور باغوں کے اونچے اونچے درخت دور سے نظر آنے لگے تھے...... ان میں اس کا باغ کون سا ہوگا؟ جس کے میٹھے رسیلے انار اور جامنیں سارے شہر میں کسی کے ہاں نہ ہوتے تھے ——— اور مولوی صاحب کا باغ...... کتنے بڑے بڑے سنہرے امرود ہوتے تھے اور میٹھے جیسے شہد۔ اور اس باغ کی کوٹھی، اس میں بہتی نہر پر اس کے بالکوں کو کتنا ناز تھا ——— کیا ہوا اگر اس کے بیر کھٹے، آم چھوٹے چھوٹے اور امرود وانار بے مزہ ہوتے تھے۔ شہر بھر میں اتنی بڑی کوٹھی اور کس کے باغ میں تھی بھلا؟

"اچھا...... یہ رہٹ اب بھی چل رہا ہے...... اینٹوں کا یہ بھٹہ اب بھی ہے؟" اس نے حیرت سے دور چلتے رہٹ اور اینٹوں کے بھٹے کی چمنی کو دیکھا...... کیا سب سے ناپائیدار چیز اس کائنات میں انسان ہی ہے ——— یہ پانی، یہ مٹی...... یہ سب باقی رہتی ہے۔

یہ رہٹ تو اس کے ماموں کے لونیز باغیچے کے بیچوں بیچ تھا ——— جس کے ایک طرف اینٹوں کا بھٹہ اور دوسری طرف ان کی چھوٹی سی نئی وضع کی کوٹھی تھی۔ اور تھوڑی دور پر لہریں مارتی نہر...... سال میں ایک یا دو بار ——— سارا کنبہ یہاں تفریح اور سیر کرنے آیا کرتا ——— آج اسے پکنک کہا جاتا ہے ——— پر اس وقت یہ نام ان میں سے کوئی بھی نہ جانتا تھا...... پکنک ——— کتنی دلچسپ کتنی خوبصورت پکنکوں کی یادیں دفن ہیں...... اس رہٹ کے آس پاس...... یادوں کے دریچے کھلے تو کھلتے ہی چلے گئے...... وہ اور اس کے

دوسرے بھائی بہن ماموں جان کے سر ہو رہے ہیں — کب لے چلیں گے آپ ہمیں "بھٹہ" پر — نہیں نہیں — ہم تو پرسوں جائیں گے — ضرور۔ ماموں جان ہنس رہے ہیں، ڈانٹ رہے ہیں، انکار کر رہے ہیں..... مگر ممانی جان کی شفقت بھری مسکراہٹ اور آہستہ سے آنکھ مارنا — انھیں پتا چل جاتا ہے کہ فرمائش پوری ہو گی — اور پھر — صبح سویرے چار بجے ہی سے گلی میں بیل گاڑی اور تانگہ آن موجود ہوتا — بیل گاڑی جس میں گدے اور دری بچھا کر سجا دیا جاتا تھا..... تکیوں کے کشن رکھ دیے جاتے اور سارے لڑکے لڑکیاں، بقول ممانی جان "اچھال چھکا پالٹی" بیل گاڑی میں بھر جاتی اور بچی اماں ان کی حفاظت کے لیے ساتھ بیٹھ جاتیں۔۔۔ جن کو آرام سے سفر کرنا ہوتا وہ تانگے پر جاتے اور جلدی پہنچ جاتے مگر یہاں جلدی کی فکر کسے تھی — راستے میں گانے گائے جاتے، بار بار اتر کر بیل گاڑی سے بھاگا جاتا، بچی اماں کی ڈانٹ کھائی جاتی صبح کا ناشتہ، ٹکیاں اور آلو، بیل گاڑی میں ہوتا اور پھر کسی کنوئیں کی مینڈھ پر تازہ تازہ پانی کوئی بوڑھا کسان شفقت بھری مسکراہٹ کے ساتھ پلا دیتا — پردے کی قید و بند کی سختی میں آج کے دن کچھ ڈھیل دے دی جاتی تھی.....

اور وہ پورا دن کس دلچسپی میں گزرتا تھا..... مزدور اور مالی ہٹا دیے جاتے..... کبھی رہٹ میں کپڑوں سمیت نہایا جا رہا ہے اور چادروں کی اوٹ کر کے دوسرے جوڑے بدلے جا رہے ہیں، درختوں پر اچکا جا رہا ہے، جھولا ڈال کر بھائیوں سے جھونٹے لیے جا رہے ہیں اور گینتوں کے بولوں کے ساتھ خوف و مسرت بھری چیخیں فضا میں گونج رہی ہیں...... کچے پھل توڑ توڑ کر کھائے جا رہے ہیں، ماموں جان سے لڑ لڑ کر آم، خربوزے اور بیر منگا منگا کر ٹھونسے جا رہے ہیں اور جب تھک کر چور ہو جاتے تو ممانی جان کے پکائے بیڑی پراٹھے اور بھنے سالن کی دعوت اڑائی جاتی...

اور شام کو سب آس پاس کے باغوں کی سیر کو نکل جاتے.... اس کا اپنا باغ ـــــ جو اسے بہت پیارا تھا ـــــ جس کا مالی اسے اور بھیا کو دیکھ کر ہاتھ جوڑ کر سامنے آتا اور اناروں اور امرودوں کی ڈالی "میاں" اور "بیوی جی" کو پیش کرتا تو وہ دونوں کس فخر اور غرور کے ساتھ ساتھیوں اور بزرگوں سب کو اصرار کر کر کے، اپنے باغ کے پھل کھلایا کرتے..... اور پھر خالہ اماں یا چچی اماں یا ممانی جان کی ڈانٹ ـــــ ارے خدا کے واسطے بس کرو ـــــ پیٹ پھٹ جائیں گے۔ بھٹے پر اینٹیں پکتی دیکھنا یا پیتھروں کو کچی اینٹیں سانچوں میں بھر بھر کر ڈھالتے دیکھنا کتنا اچھا لگتا تھا ... سال میں یہ دن ایک یا دو بار کیوں آتا ہے روز روز کیوں نہیں؟ یہ سوال اکثر اس کے ذہن میں پیدا ہوتا ـــــ آج. ـــــ آج وہ دن کہاں کھو گئے؟ وہ صورتیں کس خاک میں چھپ گئیں! وہ مسرتیں وہ خوشیاں.... آہ! یہ نئی وسیع بستی سب کو نگل گئی ـ سب کو!

ارے ـــــ عید گاہ کی یہ دیوار ابھی باقی ہے ـــــ صدیوں پرانی ہے یہ عید گاہ..... مگر اب اس میں نماز پڑھنے کون آتا ہوگا؟ کوئی نہیں ـــــ کوئی بھی تو نہیں..... اور اس سے ملا یہ قدیم قبرستان! اس بزرگ کا مزار جسے سب پیر جی کہتے تھے جس کے گرد یہ قبرستان بسا تھا اب کہاں گیا؟ کیا اسے بھی ظالموں نے مسمار کر دیا..... نہیں تو اس کے پیاروں کی آرام گاہیں تھیں ـــــ اس کے خاندان کے بزرگ، اس کے جان سے پیارے ماں اور باپ، اس کی بہنیں اور دوسرے کتنے عزیزوں کی خاکِ پاک کا خزانہ اس زمین میں دفن ہے..... اس کی یادوں کے مینار اس کے دل میں موجود ہیں مگر خاکی جسموں کی یہ یادگاریں..... خاک میں مل چکیں.......

ٹرین اب اسٹیشن میں داخل ہو رہی تھی ـــــ شہر کتنا بڑھ گیا تھا مگر اسٹیشن اب بھی چھوٹا سا، گندا سا تھا ـــــ اور وہ ـــــ وہ ایک فرلانگ

دور ـــــ جو گھر، بہت سے دوسرے گھروں میں گھرا، بہ اتنا سا لکھوری اینٹوں کا گھر.... نظر آرہا ہے ــــ اس میں اب کون رہتا ہوگا ــــ؟ اس کا پیارا گھر ــــ جس کا نام اباجان نے بھیا کے نام پر رکھا تھا ــــ اس کے وسیع صحن میں کیا وہ انار اور امرود کے پیڑ اب بھی ہوں گے جو اس نے اور بھیا نے مل کر لگائے تھے ــــ کیا سہ دری کی کھڑکیوں میں اب بھی بچے ــــ ان کی طرح ــــ ریل کی گڑگڑاہٹ سن کر دوڑتے اور آتی جاتی ٹربینوں کا شوق سے نظارا کرتے ہوں گے؟ اور سامنے کی دکانوں میں کیا اب بھی بالائی، پیڑے، کچوریاں اور ریوڑیاں بکتی ہوں گی؟

وہ عالم بےخودی میں ٹرین سے اتر کر پلیٹ فارم پر آگئی ــــ سامنے ہی باہر جانے کا چھوٹا سا دروازہ تھا ــــ ویسی ہی نیلی وردی پہنے ــــ شاید وہی ٹکٹ چیکر کھڑا تھا ــــ وہ کبھی ان کے ٹکٹ چیک نہیں کرتا تھا بلکہ، الٹا سلام کر کے کہتا "کب آئے بھیا؟" "کب آئیں بی بی؟" دیکھوں شاکر تانگے والا لینے آیا، اور وہ گیٹ کے باہر کون کھڑا ہے سادو بھیا اور بلو بھائی تم کیا اسی کو لینے آئے ہیں ــــ؟ ہاں پھوپھی اماں نے بھیجا ہوگا.... اور یہ ــــ یہ کون لپکا ہوا چلا آرہا ہے ــــ نیلے سوٹ پر لال تر کی ٹوپی.... چاند سے چہرے پر حسین مسکراہٹ لیے آغوش کھولے اس کی طرف بڑھ رہا ہے ــــ آہ تو چھوٹے بھیا بھی اسے لینے آئے ہیں ــــ "آئی بھیا ــــ میں آرہی ہوں....." وہ دوڑتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھی اور کسی شخص سے ٹکرا گئی۔ "سوری" اس نے سنا اور پھر ٹرین کی وسل کی تیز آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ اور وہ حقیقت کی پتھریلی چٹان پر آگری!

آہ! تو یہ صرف یادوں کے کھنڈر ہیں ــــ صرف کھنڈر!!

آہستہ سے وہ ٹرین میں سوار ہوئی اور اپنا چکر کھاتا سر کھڑکی

کی سلاخوں سے ٹکا دیا ...... آنکھوں سے آبشار گر رہی تھی مگر دل کے اندر...
کہیں گہرائیوں سے ایک آواز آ رہی تھی ـــــ "تیرا وطن ہندستان ہے...
اور ہر ہندستانی تیرا بھائی......"

بھولی یاد

اتنے عرصے بعد رات ایک دم تم جانے کہاں سے آ گئیں ؛ اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ ـــــ حسن و خوبی کا مجسمہ ، اخلاق و انسانیت کی دیوی ، محبت ، خدمت اور پیار کا خزانہ بن کر دل میں اترتی چلی گئیں جیسے پیار کا پہلا تیر ، جیسے محبوب کی نگاہ ، جیسے غم کی لہر۔

تم اتنے دن سے کہاں تھیں جان ؟

کیسے تم میرے پیار کی دنیا سے دور چلی گئی تھیں ؟

کیوں اتنے دن تک تمھیں میری یاد نہیں آئی ؟

اور میں ؟

مجھے کیا ہوا تھا ؟

میں کیسے اتنے عرصے تمھیں بھول گئی تھی پیاری ؟

تم ـــــ جس نے مجھے جینے کا سلیقہ سکھایا . . . . .

تم ـــــ جس نے محبت کی تفسیر پڑھائی . . . . . .

تم ـــــ جس نے خدمت اور ایثار کے معنی بتائے . . . . . .

تم ـــــ ہر پیارے چہرے ، ہر پُرخلوص دل ، ہر محبوب ہستی میں چھپ چھپ کر مسکرائیں ، ہنس ہنس کر چھپیں . . . .

تم ــــ جس نے غم کی عظمت سمجھائی .....

تم ــــ جس نے درد کی گہرائی جھنکائی ....

تم ــــ جس نے فراق کی بے پایاں لذت سے آشنا کیا .....

تم ــــ جس نے فصل میں وصل کا فلسفہ سمجھایا .....

تم ــــ جو آنسوؤں میں بھیگی آتیں اور پلکوں پر بوسوں کی بارش کر کے چلی جاتیں ....

تم ــــ جو درد کی لہر کے روپ میں سینے سے لپٹتیں ۔ مگر جب بازو وا ہوتے تو جھ سے کہیں چھپ جاتیں ....

سال پر سال بیتتے رہے ــــ عمر گزرتی رہی مگر تم بے خواب راتوں میں میرے دل کو سکون دینے ــــ میری روح کی پیاس بجھانے، میرا دل بہلانے آتی رہیں .... آتی رہیں ۔

تم ــــ جو جاگتے میں سپنے دکھانے کا گر جانتی ہو ....

تم ــــ جو سوتے میں جلوہ دکھا کر اپنے حسن پر فریفتہ کر لیتی ہو ۔

تم ــــ میری جان، میری روح، میری محبت کا مرکز، میری تمناؤں کا سہارا ــــ میری مسرتوں کا سرچشمہ

اتنے دن سے تم کہاں تھیں ؟

کہاں تھیں بتاؤ ؟

آہ ! روٹھ گئی تھیں ......

مگر کیوں میری زندگی ؟

کیا اس لیے کہ اس محبت، اس پیار، اس اعتماد، اس اپنایت میں کسی اور کو شریک کر لیا تھا ؟

تمہاری جگہ کسی دوسری ہستی کو دے دی تھی ؟

اسی لیے خفا ہو گئی تھیں نا ؟

جانتی ہوں ــــ

سمجھتی ہوں.....

اس دکھ کو ــــ اس درد کو ــــ آج کچھ زیادہ ہی گہرائی سے سمجھ رہی ہوں۔ تمھاری جگہ دل کے سنگھاسن پہ کوئی اور آن براجا تھا ــــ کسی اور کی پیار کی دولت، اعتماد اور اپنایت کی نعمت کو اپنا لیا تھا.....

اسی لیے تم روٹھ گئی تھیں نا؟

مگر ــــ تم تو میری آئیڈیل ہستی ہو ــــ سب سے محبوب ــــ سب سے پیاری ــــ جس میں کوئی کمی، کوئی کمزوری ــــ کوئی بھی نہیں!!

پھر بھی..... میری جان!

تم تو صرف راتوں کی تنہائیوں میں آئیں ــــ دم بھر کے لیے ــــ پھول کی خوشبو کی طرح، بہار کے جھونکے کی طرح سے درد کی لہر کی طرح ــــ

مگر اوسوں تو پیاس نہیں بجھتی نا؟

کسی کی ٹھوس محبت، کسی گہرے پیار کی تمنا انسان کے وجود کی سب سے زبردست تمنا ہوتی ہے۔

اسی پیار کی جستجو میں زندگی بھر بھٹکتے بھٹکتے میرے دل نے ایک چشمہ ڈھونڈ لیا ــــ

محبت اور اپنایت کی میٹھی چھاؤں تلے میں نے اس شیریں پھل کا مزہ چکھا اور اس کے کیف بانٹنے نے جیسے سب کچھ بھلا دیا ــــ

نہیں نہیں بھلایا تو نہیں ــــ بھولا تو کوئی بھی نہیں ــــ

اور تم ــــ تم کیسے بھول سکتی تھیں؟

مگر تمھارا ایک ٹھوس پیکر، ایک بدل مجھے اس دنیا میں مل گیا.......

تم تو میرے پاس آ نہیں سکتیں ــــ آتی ہو تو چھن بھر کو اور پھر آنکھیں چرا کر چل دیتی ہو..... شراب کی اور..... انسان کہاں تک بھاگ سکتا ہے...

اور جب ٹھنڈا میٹھا چشمہ پیاس بجھانے کے لیے سامنے بہہ رہا ہو.....

اور میں نے اپنے کو اس میں ڈبو دیا.....

پیاس بجھی تو نہیں ـــــ شاید تم نے ایسی لازوال پیاس بخشی ہے جو کبھی بجھ نہیں سکتی.....

مگر دل میں کتنی ٹھنڈک اور روح کو کیسا سکون مل گیا ـــــ

اور پھر ـــــ

اچانک..... مجھے لگا.....

اس چشمہ نے اپنا رخ بھر لیا.....

مجھے وہ نظر نہ آرہا تھا.....

وہ چشمۂ آبِ حیوان کہاں ہے؟ کہاں گیا؟ مجھ سے کہاں کھو گیا؟ کون چھین لے گیا اسے؟

کیا وہ میرا نہ تھا؟

کیا وہ بھی سراب تھا؟

آنسوؤں کی دھارائیں بہتی رہیں.....

آنسو جن میں تلخی تھی، جلن تھی!

محرومی کی تلخی.....

ناکامی کی جلن.....

اور میرا وجود ان میں سلگتا رہا..... پگھلتا رہا.....

اور پھر تم آگئیں! آنسوؤں کے دھارے پر تیرتی آئیں اور میری آنکھوں پر پھول جیسے ہونٹ رکھ کر دل کا دکھ درد چوس لیا۔

آہ!

رات یوں دل میں تری بھولی ہوئی یاد آئی

جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے

جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آجائے

تم آئیں....
اسی محبت اور پیار کے دیوں کی تھالی سجائے....
امید و آشنا کے وہی دیپ جگمگائے.....
اپنی چمکتی آنکھوں میں الفت کا وہی پیام لیے....
وہی نیکی، خدمت، ایثار کے جذبے دل میں بھرے....
وہی زندہ رہنے اور دوسروں کو زندگی کی خوشیاں دینے کا نغمہ گاتی ہوئی اپنی کومل باہیں تم نے میرے گلے میں ڈال دیں.... اپنے برگِ گل سے ہونٹ میرے سوجے گالوں پر رکھ دیے.... اپنا جاں فزا سانس میرے چھوٹے سانس میں سمو دیا، میرے بیمار و بے قرار دل کو کسی نے ٹھہرا دیا..
یہ دولت مجھ سے کیسے کھو گئی تھی خدایا!
آج میں نے پھر تمہیں پا لیا....
مگر اب تم مجھے چھوڑ کر تو نہ جاؤ گی؟
پیاری۔ دیکھنا اب تمہاری یاد کے زخم کبھی نہ بھریں...
تمہارے پیار کی جوت کبھی نہ بجھے....
تمہارا روپ یوں ہی آنکھوں میں نکھرتا رہے.....
تمہاری خدمت، محبت، ایثار، سادگی اور شرافت کا پیکر دل میں یوں ہی مسکراتا رہے....
تم زخمی دلوں پر یونہی مرہم رکھتی رہو.....
ٹوٹی آشاؤں کو یونہی جوڑتی رہو.....
زندگی کے معنی یونہی سمجھاتی رہو....
جینے کا سلیقہ یوں ہی سکھاتی رہو....

تمھارے بغیر میرا وجود بے روح سا ہو جاتا ہے ....

بیمار، چڑچڑا، غم زدہ وجود ....

تم مجھے چاہتی ہونا؟

تو پھر ——

اب مجھے کبھی نہ چھوڑنا —— کبھی نہ روٹھنا

اسی طرح آنا —— ویرانے میں بہار بن کر ....

صحراؤں میں بادِ نسیم کا جھونکا بن کر ....

بیمار کے لیے قرار بن کر ....

سپنوں کا نخلستان ....

تصور کا پرستان ....

یونہی جگمگاتا رہے ....

پیار کے زخم یوں ہی کھلتے رہیں .... یونہی —— یونہی ....

نصیبہ بیگم

آج سترہ برس بعد وہ میدان مارتی معلوم ہو رہی تھیں۔

مگر ——

مگر دم خم میں اب بھی کوئی فرق نہ آیا تھا۔ پچاس برس دنیا والوں سے لڑ لڑ کر زندگی بتائی تھی اور اب خالقِ کائنات سے لڑنے کا عزم لیے اس کے ہاں جانے کی تیاری کر رہی تھی۔

"ہاں ہاں ہم تو لڑیں گے بی بی —— ضرور لڑیں گے کہ تم نے ہم سے ہمارا بیٹا بھی چھین لیا۔۔۔۔۔"

آج سے تئیس بتیس برس قبل میں ان سے پہلے پہلے ملی تھی۔ میری نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ پڑوس کی خواتین اور میرے، شوہر کے دوستوں کی بیویاں مجھے کچھ ایسی نظروں سے دیکھا کرتی تھیں جیسے کہ میں کوئی عجیب مخلوق ہوں۔ بعض تو منہ در منہ تنقید و اعتراض سے نہ چوکتی تھیں۔۔۔۔ اور ایسے میں "بھاوج" کی محبت اور ہمدردی مجھے بڑی غنیمت معلوم ہوتی۔

وہ ہماری پڑوسن کے ہاں ملازم تھیں۔ بوٹا سا قد، گول گول بھرا بھرا ڈیل، چھوٹا سا معصوم بچوں کا سا چہرہ جس پر ننھی ننھی چمکتی آنکھوں اور چپٹی ناک کے باوجود عجیب دلکشی تھی! عمر ہو گی کوئی پینتیس چھتیس برس کی۔

عضو عضو سے جو اتی پھوٹی پڑتی تھی۔ مگر کیا مجال کہ کوئی مرد ان کی طرف نظر بھر کر دیکھ سکے۔ وہ گلی بازار کے بگڑے دل ہوں یا محلے پڑوس کے "شریف مرد" یا مالک جن کے ہاں وہ نوکری کرتیں، وہ سب کی بھاوج تھیں، مگر مرد مجبور تھے کہ ان کی عزت بہن کی طرح کریں، اس لیے کہ ان کے پنلے سے کلکتیا سلیپر سے سبھی کو ڈر لگتا تھا! یوں بھاوج کے ناتے ہنسی مذاق ان سے سبھی کر لیتے تھے مگر بے ضرر مذاق۔ کھلے دل کی ہنسی "کہو بھاوج کیا حال چال ہے"

"اے ہمارا کیا حال چال میاں۔ آپ بڑے لوگ، امیر لوگ حال چال آپ کا.. غریب کا اس دنیا میں پیٹ کا دوزخ بھرنے کے سوا اور کیا حال ہوتا ہے۔"

خاص دلی کی رہنے والی تھیں اور بڑی صاف زبان بولتی تھیں۔ وہ سب کی بھاوج "کیوں تھیں" اس کی بھی ایک دلچسپ داستان ہے۔ جب وہ نوکری کرنے نکلیں تو کسی نے انھیں نصیبن کہہ دیا، کسی اور نے نصیبن بوا۔ اے ہے وہ تو ہتھے پر سے اکھڑ گئیں! "نصیبن!! نصیبن!!! اے تو کیا ہم پیشہ ور پکانے والی ہیں۔ کیا ہمارے گھرانے میں ماماگیری ہوتی ہے؟ ___ نصیبن ہوں گی تم ___ میرا بھوٹی قسمت والی کا نام تو نصیبہ بیگم ہے...." مگر آپ جانیں اس طرح نام لے کر ان کا دماغ کیسے خراب کر دیا جاتا ___ خالی بوا پردہ اور چراغ یا ہو نہیں۔ اور ہاں ہاں اب تو ہم بوا ہیں ___ تمہارے گھر کی لونڈی باندی ___"

خالہ کہو تو بھی انھیں اعتراض ہوتا تھا "اے بیگم صاحب تم مجھے خالہ نانی بنا رہی ہو؟ ___ لو ___ تمہاری میری عمر میں ہوگا کہیں دو چار برس کا فرق" اب اگر بگڑ کر بیگم یا ان کی کوئی بہن بھاوج یہ کہہ دیں کہ تمھارے اچھے بھلے دس اور پندرہ سال کی عمر کے بچے ہیں اور بیگم کی تو شادی ہوئے دو تین چار سال بھی نہیں ہوئے تو وہ طنزیہ انداز میں ہنس کر اور بل کھا کر کہتیں! "بیگم صاحب اپنا اور ہمارا مقابلہ کر لو ___ تم بیاہ کر آئیں تو ہوں گی بیس تیس برس کی! ندا بھی کچا پن نہیں تھا منھ پر ___ اور ہم ___ ہم تو دس بارہ برس کی عمر

ہیں بیاہ گئے تھے ـــــ اماں باوا ـــــ کمبخت کو ایسی بہار وتی ہیں ـــــ
مگر ـــــ اب بھی جا کے پوچھ لو محلے والوں سے ـــــ کیسا نور اترا تھا ـــــ
سب دیکھنے کے دیکھتے رہ گئے تھے ـــــ مگر ہاں بھئی . . . . اب کیا ـــــ
غریب کی جورو ـــــ سب کی بھاوج ـــــ جس کا جو جی چاہے کہہ لے ۔"
اور وہ اس محاورے کا اتنا استعمال کرتیں کہ اب لوگ منھ پر انھیں بھاوج
اور پیٹھ پیچھے غریب کی جورو کہا کرتے ـــــ اور اس طرح وہ جگت بھاوج
بن گئیں !

اپنے نام کا ذکر وہ بڑی تلخی سے کرتیں " نصیبہ بیگم ـــــ نصیبہ !!
چھوٹے نصیب تھے ہمارے تو ـــــ شرم بھی نہ آئی نصیبہ بیگم نام
رکھتے ـــــ " لہجے کی کاٹ ، انداز کا تیکھا پن اور آنکھوں میں درد و غم کی
لہر ـــــ ایک دم لوگوں کی ہنسی رک جاتی ان کی بدمزاجی کا احساس غائب
ہو جاتا اور ان سے ہمدردی پیدا ہو جاتی !

میرے پاس بیٹھ کر وہ محلے بھر کی عورتوں کی خامیاں اور برائیاں اور
ان کے شوہروں کی خوبیاں گنایا کرتیں ! جانے کیا بات تھی ، عورتوں کے
عیب اور بدا کے انھیں نظر آتے اور مردوں پر رحم آتا ۔ ویسے وہ بڑی
آن بان کی عورت تھیں ۔ سبھی مرد ، وہ بڈھے ہوں یا جوان یا ادھیڑ ان کے
کھیا ہی تھے ـــــ کبھی نظر بھر کر کسی مرد کو نہ دیکھتیں مگر عورتوں کا ان سے
جو ذرا سا حقارت یا تمسخر کا انداز ہوتا ، اسی نے ان کے دل میں بڑی
تلخی بھر دی تھی ۔ مگر دل کی ایسی تھیں کہ پڑوس کی بیوہ ، بے سہارا عورتوں
یتیم بچوں ، اپاہج بڈھوں کی زبانی ہمدردی اور عملی مدد دونوں کے لیے
وہ ہر وقت حاضر رہتی تھیں ـــــ مگر دل بڑا تھا اور کیسہ خالی !

محلے کے پڑھے لکھے حیثیت والے گھرانوں میں ان کے ماضی کو
پُراسرار سمجھا جاتا تھا ـــــ وہ کھانا پکانے کے بعد ذرا دیر نہ ٹھہرتیں

"میرے بچے میرا انتظار کر رہے ہوں گے ــــ" اب چاہے کچھ ہو جائے مگر بھاوج نہیں رک سکتیں۔ رات کو کبھی کسی کے گھر نہ رہتیں۔ تنخواہ اور مقررہ کھانے کے علاوہ خیر خیرات کے پیسے یا فاتحہ درود کے کھانے کو چھوتی بھی نہ تھیں اور اُترن کپڑا دیا جاتا تو اس حقارت سے الگ ڈال دیتیں جیسے کوئی مردار جانور۔ ہاں محبت اور خلوص کے ناتے اگر ان کو کوئی نئے کپڑے یا بچوں کی بنس کے نام سے خاموشی سے کچھ دیدیتا تو قبول کر لیتی تھیں مگر اس وقت بھی ان کے چہرے پر مجروح خودداری اور کچلے غرور کے پھیکے رنگ دیکھے جا سکتے تھے!

مجھ سے جانے کیوں شروع سے انھیں خلوص ہو گیا تھا۔ شاید اسی لیے انھوں نے کبھی کبھار اپنے "پُر اسرار ماضی" پر سے ذرا سا پردہ اٹھا کر اس کی جھلک دکھائی تھی۔ مگر ان بکھرے بکھرے ٹکڑوں کو جوڑ کر ان کی جو داستان بنی تھی وہ نہ پُر اسرار تھی نہ نئی، لیکن سناتے وقت ان کا گھبرا گھبرا کر چاروں طرف دیکھتے رہنا اور سرگوشی کا سا انداز اسے پُر اسرار سا ضرور بنا دیتا تھا!

ان کی داستان بھی اس دور کی ــــ اور کیا آج کی نہیں؟ ہندستانی شریف غریب طبقے کی ہزاروں لڑکیوں کی گھسی پٹی کہانی تھی۔ وہی ایک کمانے والا دس بارہ کھانے والے، وہی زیادہ بیٹیاں اور کم بیٹے! وہی محبت کی فراوانی اور بر کی کمی۔ نصیبہ بیگم باپ کی بڑی لاڈلی تھیں مگر محبت نہ پیٹ بھر سکتی ہے نہ بر اور جہیز مہیا کرنے کی قدرت رکھتی ہے۔ چنانچہ نصیبہ بیگم بارہ برس کی عمر میں ایک کھاتے پیتے دوہاجو مرد سے بیاہ دی گئیں جن کے ان سے بڑی عمر کے بیٹے بیٹیاں موجود تھے۔ مگر وہ اتنی الھڑ اور نو عمر تھیں کہ اس کی انھیں ذرا بھی فکر نہ ہوئی۔ جھم جھماتے ریشمی کپڑے پہننے کو عمدہ سے عمدہ کھانے کو ملنے لگا۔ کھیلنے اور تفریح کے لیے ہم سن لڑکے لڑکیاں موجود!! اور چاہیے بھی کیا۔ مگر.... "بی بی ان نگوڑے ہر سال ہونے

والے بچوں سے ہم بڑے بیزار تھے۔ سات آٹھ سال میں پورے چھ بچے ہو گئے چار تو مر کھپ گئے ـــــ ہم نے سوچا ـــــ چلو اچھا ہوا ـــــ پاپ کٹا۔ ہمارا سن ہی کیا تھا ـــــ ہم خود بچے تھے ـــــ مگر بس یہ دو۔ پیٹ کی کھرچن زندہ بچے ـــــ" اور پھر وہ ایک گہرا سانس لیتیں" ہائے اس وقت کیا جانتے تھے کہ یہ ممتا کی آگ کیا ہوتی ہے ـــــ ان بچوں پر ہم نے اپنی جوانی ـــــ اپنا سکھ ـــــ اپنا سب کچھ نچھاور کر دیا اور ہم یہ جانتے ہیں ـــــ کہ وہ ہمیں کبھی سکھ نہ دیں گے ۔ ۔ ۔ ۔"

انھیں دنیا میں کسی کی محبت اور خلوص کا یقین نہ تھا یقین تھا تو اس پر کہ ان کی زندگی مصیبت سے گزر رہی ہے اور یوں ہی گزرے گی!

سچ بھی ہے، جو بیس پچیس برس کی عمر میں جس کے ہاتھ سے مسرت بھرا جامِ زندگی گر کر چھن سے ٹوٹ جائے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ اس کی کرچیں بھی نہ چن سکے ـــــ اس کی ذہنی کیفیت اور کیا ہو سکتی ہے!

اچانک دو دن نمونیہ میں مبتلا رہ کر ان کے میاں مر گئے اور چہلم اندر سوتیلے بیٹا بیٹی جو کچھ اثاثہ تھا وہ سمیٹ کر اپنی اپنی راہ ہو لیے۔ اس میں بھی کوئی نئی بات نہ تھی! بڑی پرانی ریت ہے یہ ہمارے سماج کی! اور اب نصیبہ بیگم کے پاس ایک چھوٹا سا پرانا گھر تھا" دو کم سن بچے تھے، میکے سے ملا ہاتھ گلے کا تھوڑا سا زیور ـــــ اور اپنا پھوٹا نصیب!

سال ڈیڑھ سال جیسے تیسے وقت گزرا۔ باپ مر چکے تھے۔ ایک بھائی کسی طرح ماں بہنوں کا پیٹ پال رہا تھا ـــــ اس لیے سب کے اصرار کے باوجود وہ میکے نہیں گئیں۔" ہم کسی کا احسان کیوں لیں۔ اپنے بچوں کو ماموں ممانیوں کا محتاج کیوں کریں؟ ـــــ کیا ہمارے ہاتھ پاؤں نہیں!"

مگر مشکل یہ تھی کہ ہاتھ پاؤں ہی نہ تھے جوانی بھی تھی، اور اچھی شکل

بھی۔ باہر نکلیں تو محلے پڑوس کے نکھرے دل یا گلی کوچے کے غنڈے آوازے توازے کستے، آنکھوں اور ہاتھوں سے اشارے کرتے۔ گھر میں ہوتیں تو کٹنیاں کسی پیر جی، کسی خلیفہ جی ــــــ کسی درزی اور کسی بوڑھے تاجر کا نکاح کا پیام لیے روز موجود! نصیبہ بیگم ایک ایک زبان میں دس دس، باتیں سناتیں مگر ہر بات کا جواب ملتا "شرع میں شرم کیسی۔ نکاح کر کے بچوں کا اور اپنا سہارا ڈھونڈ لو ــــــ اکیلی عورت کیسے رہے گی" اور ایک بار تو وہ ایسا گھبرائیں کہ بڈھے پڑوسی تاجر کا نکاح کا پیام قبول ہی کر لیا تھا۔ "بلا سے بڈھا ہو تو ہو مگر بچوں کو سہارا تو ملے گا۔" مگر وہ تو ــــــ اللہ بھلا کرے ــــــ میری گوئیاں کا" وہ کہتیں ــــــ

"اس نے ان کے کرتوت بتا کر مجھے بچا لیا ــــــ اور پھر بی بی ــــــ بچوں کا خیال آتا ــــــ سوتیلا باوا ــــــ جانے کیا سلوک کرے.... مگر جب فاقے سے دو وقت بیت گئے تو ہم نے ٹھان لیا کہ اپنے پیروں پر آپ کھڑے ہوں گے۔ مگر کیا کریں؟ اماں باوا نے لکھنا پڑھنا نہ سکھایا، سینا کاڑھنا بھی تو نہ سکھایا ــــــ وہ تو اللہ مرنے والے کو جنت نصیب کرے ــــــ اسے کھانے کا بڑا شوق تھا ــــــ اچھا کھانا پکانا آ گیا تھا۔ وہی برے وقت میں کام آیا ــــــ"

اب وہ آٹھ نو سال سے ماماگیری کر کے اپنے بچوں کا پیٹ پال رہی تھیں۔ مگر ذرا سی تیکھی چتون یا کڑوی بات پر کھٹ سے نوکری چھوڑ دیتیں۔ مگر ان کے ہاتھ کے کھانے کے مزے اور دیانت داری کا شہرا اتنا ہو گیا تھا کہ پھر نوکری مل جاتی تھی۔

شروع شروع میں وہ بہت ڈرتی رہتیں! کسی پڑوس کے بچے یا اپنی گوئیاں کے ساتھ کام پر جاتیں ــــــ واپسی پر مالک کے کسی نوکر کو ساتھ لے کر آتیں ــــــ مگر کوئی کہاں تک ساتھ دیتا؟ ایک دن رات گئے

اکیلی واپس آ رہی تھیں کہ کسی نے ان کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا۔

"اور بی بی پھر جانے کہاں سے ہم میں طاقت آ گئی۔ کھانے کا کٹورہ دان اس کے سر پر مارا اور پھر اتاری پاؤں سے جوتی ....." اس کی گردن فخر سے تن جاتی۔ آنکھوں میں چمک آ جاتی اور پھر کھلکھلا کر ہنس دیتیں! محلے والے شور و غل سن کر باہر نکلے تو دیکھا کہ محلے کا سب سے تگڑا اور بد نام آدمی نالی میں گھٹنوں کے بل پڑا ہے اور نصیبہ بیگم اپنے ٹلکٹنیا سلیپر سے اس کی جانا گنجی کر رہی ہیں!

"بس بی بی وہ دن اور آج کا دن ــــ پھر کسی موئے نے کی ہمت چھیڑنے کی نہیں ہوئی ــــ ہم نے بھی برقعہ ورقعہ کو لگا دی آگ ــــ اے ہاں جب مزدوری ہی کرنی ہے تو گھونگھٹ کیا ــــ اور نہیں تو ہاں" وہ محاوروں میں بلا تکلف تصرف کر لیا کرتی تھیں۔

پھر چند برسوں کے لیے میں باہر چلی گئی۔ واپس آئی تو مدت تک نصیبہ بیگم سے ملاقات نہیں ہوئی ..... اور پھر اچانک ایک دن ایک ملنے والی کے ہاں انھیں دیکھا ــــ

دس برس سے وہ ان کے ہاں کام کر رہی تھیں۔ ان کے تین بچوں کو پالا تھا؛ اور امید تھی کہ چوتھا ہونے والا بھی وہی پالیں گی۔ ان بچوں کو وہ بہت چاہتی تھیں ــــ

اور پھر ایک دن صاحب کی ترقی ہو گئی ــــ وہ بڑے افسر بن کر بمبئی چلے گئے۔ اب ان کے بچے انگریزی اسکول میں پڑھیں گے ..... بیگم کے پاس صاف ستھری آیا اور صاحب کے پاس چپراسی رہیں گے ..... اب "بھاوج" کا کیا کام تھا۔

"ہم سے تو بی بی، صاحب نے کہا بھی کہ چلو ــــ مگر ہم ان کی جورو کا رنگ دیکھ رہے تھے ــــ ہم نے کہا صاحب تم شاد آباد رہو ــــ ہم اپنے شہر سے کہیں نہ جاویں گے ــــ اور بی بی ــــ اب ہم کاہے کو دوسروں کے ٹکڑے توڑیں ــــ لڑکی اپنے گھر بار کی ہو گئی لڑکا بھی نوکر ہو گیا ہے ....."

میں نے سوچا —— چلو خیر اب بھاوج بچاری کی بوڑھی ہڈیوں کو آرام ملے گا —— ویسے وہ بڑھاپے کے نام سے اب بھی چڑتی تھیں نانی دادی کے لقب پر چراغ پا ہو جاتی تھیں۔

"ہاں ہاں کہہ لو جو جی چاہے —— اب تو ہو ہی گئے بوڑھے" مگر آرام ان کے نصیب میں کہاں تھا۔ (پہلے دوسروں کی چاکری کرتی تھیں اب بیٹے بہو کی خادمت!)

"ہم کسی کا احسان کیوں لیں —— وہ بیٹا ہو یا بیٹی —— اپنے کام کرتے ہیں دو روٹی کھا لیتے ہیں!" —— "مگر اب کئی سال سے بیٹے کی بے رخی نے ان کو توڑ دیا تھا —— وہ اپنی بیوی بچوں کو لے کر پاکستان چلا گیا تھا۔ ماں کو بھی لے جانا چاہا مگر وہ بگڑ اٹھیں" لو اور سنو —— ہم کاہے کو اپنا دیس اپنا شہر، اپنی بیٹی کو چھوڑیں۔ جا تو جا مگر نصیبہ جانے والی نہیں۔" مگر اس کے جانے کے بعد ان کی ممتا تڑپ رہی تھی! کئی برس گزر گئے تھے۔ پاسپورٹ اور ویزا کی ہر کوشش بے کار ہو چکی تھی وہ کہتیں۔ "بی بی بڑے لوگ خوب آتے جاتے ہیں۔ مگر غریب کے لیے پابندیاں ہیں، ہم تو سچ کہیں گے —— یہ دنیا غریب کے لیے نہیں —— آپ لوگ مزے کرتے ہیں ہم دکھ جھیلتے ہیں۔ تین سال سے ہیں تے اپنے شمسو کو نہیں دیکھا....." اور ان کی بوڑھی چندھی آنکھوں سے برکھا ہونے لگتی! مگر امید کا تار اب بھی جڑا تھا —— اس کو بلانے یا اس کے پاس جانے کی کوشش وہ برابر کیے جا رہی تھیں! مگر آج.... نمونیہ کے حملے نے ان کا حوصلہ توڑ دیا تھا۔ "بی بی بس اب چل چلاؤ ہے۔"

"ارے نہیں بھاوج —— معمولی فلو ہے —— ٹھیک ہو جاؤ گی۔"

"نہیں —— سانس اکھڑ رہا ہے —— اب جی کر کرنا بھی کیا ہے —— مگر ہاں —— شمسو کو نہ دیکھا —— ہم کبھی ان لوگوں کو معاف نہ کریں گے

جنھوں نے ہمارے بچے کو ہم سے چھڑایا ــــــ"

ہاں جی تم تو اللہ میاں سے بھی لڑو گی ــــــ"، بیٹی نے ہنس کر کہا۔

"ہاں ہاں اور کیا چھوڑ دیں گے... انھیں نے ہمارا میاں چھینا بھری جوانی میں رانڈ کر دیا ــــــ ہمارے بچے چھینے ہم چپ رہے۔ در در کی ٹھوکریں کھلائیں۔ ہم کچھ نہ بولے اور اب ہمارے بیٹے کو بھی ہم سے چھڑا دیا ــــــ اور نہیں تو ہاں ــــــ" وہ زرا سا مسکرائیں "ہاں بی بی ہم تو لڑیں گے اپنے اللہ میاں سے......" اور اب میں سوچ رہی ہوں۔ نہیں رہی بوڑھی صبیحہ بیگم، کڑے تیوروں اکڑوے لہجے مگر بڑی اپنا ئیت کے ساتھ اللہ میاں سے لڑ رہی ہوں گی....

اور کیا ان کی یہی ادا ان کی بخشش نہ کرا دے گی؟

ם

ہمارے بھیّا دیوتا

اس کی ہر حس جواب دے چکی تھی۔

شدتِ غم میں کوئی ایسی منزل بھی آتی ہے جب نہ آنکھ سے آنسو نکل سکیں، نہ لب پر آہ ہو، نہ دل میں تڑپ، نہ دماغ میں خیالات کا ہجوم۔ یہ غم کا کون سا روپ ہے؟

صبح ہی سے جی اداس اداس تھا۔ کل عید ہے اور وہ کتنے بھرے دور یہاں پردیس میں پڑی ہے۔ ابو ہی عین اس زمانے میں اتنی دور نہ سدھار گئے ہوتے تو اسے اتنی تنہائی نہ محسوس ہوتی۔ بھیا نے کتنا بلایا کہ اب کے ہم سب مل کر اسلام پور کی عید کیوں نہ کریں! مگر چھٹی نہ مل سکی۔ لتا اور اس کے گھر والے ہر طرح اس کی دلداری کر رہے تھے مگر تہوار کی خوشی تو گھر والوں کے ساتھ ہوتی ہے نا۔ دس بجے کے شو میں سب کا ایک ساتھ فلم دیکھنے کا پروگرام تھا اور وہ لتا سے جھگڑ کر خود ٹکٹ خرید کر لائی تھی۔ مانا کہ پتا جی ابو کے دوست ہیں اور لتا اس کی پیاری سہیلی۔ مگر مہینے بھر سے وہ اس کے یہاں رہ رہی ہے۔ کچھ تو اسے بدلہ کرنا چاہیے! شام کو وہ اور لتا بازار گئیں۔ شاپنگ کی۔ فلم کے ٹکٹ خرید کر لائیں۔ آئس کریم کھائی۔ دیر سے گھر واپس آئیں تو پتا جی اور ماں جی پریشان ہو رہے تھے۔

کھانا کھا کر سب لوگ ڈرائنگ روم میں ہنس بول رہے تھے۔ فون کی گھنٹی بجی اور اس نے لپک کر ریسیور اٹھا لیا۔ ضرور بھیا نے کہیں سے فون کیا ہے۔

"ہلو"

"ہاں ہاں میں بول رہی ہوں شمیم۔ کیا کام ہے۔"

"کون بھیا؟ عرفان —— ہاں ہاں کیا کہا ہے اس نے؟"

"یہ سب اس کی شرارت ہے۔ کہہ دینا چھٹی نہیں ملی۔"

"چوٹ؟ اس کے دشمنوں کے چوٹ آئے۔ میں اس کے ان فقروں میں آنے والی نہیں ہوں؟"

"ایکسی ڈنٹ —— نہیں نہیں خدا اسے سلامت رکھے ہزار برس —— ہزار برس۔"

ایک طرف تڑاق سے ریسیور گرا اور دوسری طرف دھڑ سے وہ خود زمین پر تھی۔

وہ کب ہوش میں آئی؟ کس نے کیا پوچھا؟ اس نے کیا کہا؟ کون اسے اسٹیشن پر لایا۔ لتا کی باہنیں اس کی گردن میں اور چہرہ آنسوؤں سے کیوں بھیگا ہے —— پتاجی اور ماں جی اس قدر پریشان کیوں ہیں؟ دیدی کیا کہہ رہی ہیں بوا سے۔ ٹرین میں بیٹھی عورتیں اسے ایسی نظروں سے کیوں دیکھ رہی ہیں۔ بوا اس کے ساتھ کیوں آئی ہیں؟ کیوں بار بار اسے چائے پلاتے اور سنترہ کھلانے کی کوشش کر رہی ہیں؟ رات کیسے کٹی۔ آدھا دن کیوں کر بیتا۔ دوپہر کب ہوئی۔ دیس کا اسٹیشن کب آیا؟ بیس گھنٹے سے ذہن شل اور دماغ مفلوج تھا۔ اور پتھر کی اس مورتی کو دیکھ دیکھ کر بوا کی حالت خراب ہوئی جا رہی تھی۔

اسلام پور چھوٹا سا گاؤں تھا۔ اسٹیشن گاؤں سے تین میل دور تھا۔ گاڑی رکی تو وہ بغیر کسی طرف دیکھے بغیر سامان اٹھائے ریل سے اتر پڑی

اور چپکے سے اسٹیشن کے باہر نکل گئی ۔ ہانپتی کانپتی بُوا اس کا اٹیچی اٹھائے اور ٹکٹ لیے پیچھے پیچھے تھیں ۔ ایک یکہ والا آگے بڑھا وہ خود سے چڑھ کر یکے میں بیٹھ گئی ۔ بوا بڑی مشکل سے چڑھ کر اس کے پاس آ بیٹھیں ۔

"جلدی چلو اور بھئی جلدی جلدی چلو ــــ بھیا انتظار کر رہا ہوگا ۔"

یکہ پکی سڑک پر چلا جا رہا تھا ۔ سورج دھیرے دھیرے مغرب کی سمت جا رہا تھا ۔ اور شفق کی سرخی کسی بے گناہ کے خون کی طرح آسمان کے دامن پر پھیل گئی ۔ وہ ہرا بھرا فارم جو ہے ۔ بھیا کا ہے ۔ اس وقت وہ فارم پر ہوگا ۔ یاد رہا ہر ۔ فالیز کا زمانہ ہے نا ۔ دریا کے کنارے اس کے لیے خربوزے اور تربوز تڑوا رہا ہوگا ۔ کہا تھا "بھنواب کے گرمیوں میں تو اسلام پور آئے گی نا تو اتنے خربوزے اور تربوز کھلاؤں گا کہ منہ بھر جائے گا بتزا ۔"

وہ عمر میں اس سے بڑی تھی مگر دونوں میں اتنی دوستی اور اپنائیت تھی کہ بڑے چھوٹے کا فرق مٹ گیا تھا ۔ وہ اسے پیار سے بھیا کہتی ۔ کبھی عرفان یا انو نہیں کہا ۔ اور بھنو یا شمو ۔ کیا مجال کہ آپا یا باجی کہہ کے دیا ہو کبھی !

"اونہہ یہ مجھ سے بڑی کیسے ہو گئی ؟ دو فٹ تو اس سے قد میں بڑا ہوں اور ایک فٹ چوڑائی ۔" وہ اپنے بلند و بالا قد کو اور زیادہ بلند کر کے اور سینہ پھلا کر کہتا ۔ اور وہ دونوں کھل کھلا کر ہنس پڑتے ۔ ذرا سی باتوں پر دونوں میں جھڑپ ہوتی رہتی ، ہر چیز پر بحث ، ہر کام پر ایک دوسرے کی نکتہ چینی مگر پھر دو منٹ میں من جاتے ۔ کبھی دوسروں پر فقرے کسے جا رہے ہیں ، قہقہے لگ رہے ہیں ، چچی اماں کو ، جن کو وہ اماں کہتے تھے ، چھیڑ رہے ہیں ، بھائی جان اور بھیا کو ستا رہے ہیں ، فلمی گانوں پر تھرک رہے ہیں اور آواز میں آواز ملا کر گا رہے ہیں !

" اونہہ بھیا خدا کے لیے چپ رہو ۔ کتنی بھونڈی آواز ہے ۔"

"تجھ سے تو اچھی ہے" اور وہ زور سے گانے لگتا۔
اور وہ دونوں ہنستے ہنستے لوٹ جاتے!
"ناک میں دم ہے تم دونوں کی ہنسی سے" خاندان بھر ان کے مسخرے پن ان کے قہقہوں اور خوش دلی سے نالاں تھا۔
کھیت میں، سڑک پر، ہر طرف اسے بھیا ہی بھیا نظر آ رہا تھا۔ ابھی کسی پیڑ کی آڑ سے، کسی کھیت کے اندر سے، کسی کچے گھر یا جھونپڑی میں سے دوڑتا ہوا اس کا بھیا باہر آئے گا اور لمبا سا قہقہہ لگا کر کہے گا۔ "کیوں بھنو۔ کیسا دھوکا دیا۔ آنا پڑا۔ بڑی کام والی بنی تھی۔"
یکہ پکی سڑک چھوڑ کر کھیتوں کی مینڈ کے ساتھ گھر کی طرف چلا جا رہا تھا۔
اِدھر اُدھر بہت سے لوگ جمع ہو رہے تھے۔
ڈیوڑھی کے سامنے یکہ رکا اور وہ کود کر اتر پڑی۔ اندر گھسی بھی نہ تھی کہ چھوٹے ماما نے اسے اپنے بازوؤں میں لے لیا اور چیخ چیخ کر رونے لگے۔ انھیں کیا ہوا ہے؟ دالان میں چچی اماں بے ہوش پڑی تھیں۔ بھیا بے جان مورتی کی طرح بیٹھی تھیں۔ چہرے پر خون کی ایک بوند نہیں۔ جیسے جسم میں ہلنے جلنے کی سکت نہ رہی ہو۔ جانے دیوار پر وہ کیا تلاش کر رہی ہیں کوئی اور وقت ہوتا تو وہ بھیا سے لپٹ جاتی۔ مگر۔ بھیا کے پاس جانا ہے اُسے تو.... گھر میں بھری عورتوں اور بچوں کو الانگتی پھلانگتی، ہر رونے کی حالت سے بے خبر وہ اندر کے دالان کی طرف بڑھ رہی تھی.... بھیا زخمی ہو گیا ہے۔ اچھا ہو جائے گا۔ یہ لوگ اتنی بدشگونی کیوں کر رہے ہیں آخر!
موٹے موٹے گول ستونوں کا یہ لمبا چوڑا دالان کتنا بوسیدہ ہو چکا ہے، ــــ پلاستر جھڑ گیا کڑیاں جھک آئیں، فرش جگہ جگہ سے ٹوٹ گیا۔ بھیا نے کہا ہے "اگلے سال تک میں سارے گھر کی مرمت کراؤں گا۔ ٹیوب ویل بھی لگ جائے گا۔ بجلی بھی آ جائے گی۔ پورے گاؤں کو گلزار بنانا ہے بھنو۔"

اس نے بھیا کو دالان کے اندر نہ پاکر صحنچی میں جھانکا۔ پھر کوٹھری میں گھسی اور پھر ایک چیخ ـــــ

"بھیا ـــــ کہاں ہے بھیا ـــــ ہا"

کتنی بھیانک چیخ! وہ خود لرز گئی!

ذرا دیر کو سارے گھر میں سناٹا چھا گیا۔ جیسے سب کو سکتہ ہو گیا۔ اور پھر گریۂ و زاری کا ایک طوفان اٹھا۔ وہ بے حس و حرکت بیچ دالان میں کھڑی ایک ایک کا چہرہ دیکھ رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں، چہرے پر اس کا سوال چیخ رہا تھا۔

"بٹیا ـــــ" چھوٹے ماما بلکتے ہوئے آگے بڑھے "بٹیا ہم لٹ گئے۔ برباد ہو گئے ـــــ بھیا ہمیں چھوڑ کر چلا گیا۔"

زلزلہ کا زور کا جھٹکا آیا۔ زمین پاؤں کے نیچے سے سرکنے لگی۔ پھر وہ کسی کے بازوؤں میں تھی ـــــ اپنے بھیا کے بازوؤں میں شاید!

کتنا سکون، کتنا آنند! بھیا کے ساتھ قہقہے لگتے رہے، باتیں ہوتی رہیں۔ چھیڑ چھاڑ۔ گانا بجانا!

بڑی مشکل سے اس نے آنکھیں کھولیں! چڑیاں چوں چوں کر رہی تھیں، مسجد سے دادامیاں کی اذان کی دردناک پُرسوز آواز بلند ہو رہی تھی! آسمان پر ننھی ننھی چڑیوں کے جھنڈ کے جھنڈ مغرب کی طرف اڑتے ہوئے آتے اور مشرق کی سمت غائب ہو جاتے۔ اس کے بکھرے بکھرے خیالات کی طرح بادلوں کے آوارہ ٹکڑے بے مقصد بے کار ادھر ادھر دوڑ رہے تھے اور نسیم سحری کے ہلکے جھونکے اس کے الجھے بالوں سے چھیڑ چھاڑ کر رہے تھے۔

"بھیا خفا ہو گیا۔ ہاں ہاں ناراض ہو گیا ہے مجھ سے اور ابو سے!"

ابھی تک اس کا ذہن روح فرسا حقیقت سے آنکھیں چرا رہا تھا۔

دو مہینے بھی اسلام پور گئے نہ ہوئے تھے کہ بھیا نے لکھا "بھنو! ابو باہر

جا رہے ہیں۔ بس ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ تو کسی طرح اجازت دلوا دے۔ مجھے توڑ انہیں گے کہ یہاں سے بھاگنے کے بہانے ڈھونڈ تا ہے۔"

وہ جیس بیص میں پڑ گئی۔ سچ مچ ابو بہت خفا ہوں گے۔ کتنے لمبے چوڑے وعدے کر کے گیا تھا اب کے "ابو اب تو میرا جی وہاں خوب لگ گیا ہے۔ میرا ننھا سا فارم آپ دیکھیں گے تو بہت خوش ہوں گے ابو ــــ مگر...."

وہ کچھ چپ سا ہو گیا تھا۔ ابو نے کہا "مگر کیا۔"

"ابو اس کو ترقی دینے کے لیے روپے کی ضرورت ہے۔ ایک ٹیوب ویل اگر لگ جائے تو کھیتوں کو پانی بھی ملے گا اور بجلی بھی ہمارے گاؤں کے گھروں میں آسکے گی۔ اور ایک ٹریکٹر ــــ بس پھر آپ دیکھیے گا ہزار روپے مہینہ سے کم آمدنی نہ ہوگی۔"

"ڈینگیا کہیں کا" اس نے چپکے سے کہا اور بگڑ گیا۔

"ابو یہ اپنی تین سو کی نوکری پر بہت اتراتی ہے میں اسے دکھا دوں گا کہ اس سے کہیں زیادہ کما سکتا ہوں۔ گھر کی مرمت بھی کرانی ہے۔ دوسرا ریڈیو لوں گا۔ چچا ابا تو اپنے اس پرانے بیٹری والے بدصورت ریڈیو پر فلمی گانے سننے نہیں دیتے۔ ان کے خیال میں ریڈیو بس قرآن، نعتیں اور نوالیاں سننے کے لیے ایجاد ہوا ہے۔"

"اتر آیا نہ اپنی حرکتوں پر۔" ابو نے جھلا کر کہا۔

"نہیں ابو سچ مچ دس بارہ ہزار روپے کا انتظام ہو جائے تو...."

اب ابو کے چپ ہونے کی باری تھی۔ یوں تو وہ کئی بار کہہ چکے تھے "شمو کسی بنک سے روپے قرض مل جائے تو اس کا فارم بہت بڑھ سکتا ہے مگر ابھی مجھے اس پر بھروسہ نہیں جانے کب جی اچاٹ ہو جائے!"

ابو کے لاڈلے اکلوتے بیٹے نے تعلیم سے بد شوقی دکھا کر انھیں بہت دکھ پہنچایا تھا۔ وہ تو بس کھیل کود کا شوقین تھا۔ کرکٹ کا رسیا۔ زندگی کو

بھی وہ کھیل کا ایک دلکش میدان ہی سمجھتا تھا۔ ابو کو جب یقین ہو گیا کہ وہ میٹرک سے آگے نہیں بڑھے گا تو چار سال انھوں نے اسے ایگریکلچر کی تعلیم دلوائی۔ ابو کے ڈر سے اس نے بی ڈپلوما لے تو لیا۔ مگر اس کا جی نہ لگتا تھا۔

"مجھے تو کرکٹ سے دلچسپی ہے بھنو۔ جب بڑے بڑے کرکٹ پلیرز کی طرح میں بھی بہت مشہور ہو جاؤں گا تو لوگ تجھے دیکھنے آئیں گے۔ تومی ہیرو کی بہن کو۔"

"بڑا کرکٹ کا کھلاڑی۔" وہ منھ چڑا کر کہتی!

مگر جب اسے ابو سے سفارش کی ضرورت پڑتی تو اسی سے مدد مانگتا۔ ابو کو بھی اس سے کوئی بات منوانی ہوتی تو وہ بیٹی ہی سے کہتے۔ اسی کے کہنے سے تو وہ چچا ابا کے ساتھ دلیس میں جاکر کھیتی باڑی کرنے کو تیار ہوا تھا۔

"بس دو سال جی لگا لو۔ پھر ابو ضرور روپے دے دیں گے۔" مگر جی لگتا کہاں تھا۔ دیکھ لو دو مہینے نہیں ہوئے اور وہ پھر بھاگنے کی سوچنے لگا۔ اب وہ بھلا کیسے ابو کو راضی کرے۔

اس نے خط لکھا کہ "ابھی آنے کی کیا ضرورت ہے جی لگا کر وہاں کام کرو۔"

وہ ناراض ہو گیا۔ "تم اور ابو میری کوئی خواہش پوری نہیں ہونے دیتے۔ میں تم دونوں باپ بیٹی سے تنگ آگیا ہوں۔" پھر آخر میں بڑی خوشامد سے لکھا "بھنو میرا جی تجھ سے اور ابو سے ملنے کو جانے کیوں بے قرار ہے۔ میں تم لوگوں سے کرائے کے لیے روپے نہیں مانگ رہا ہوں۔ روپے میرے پاس ہیں۔ بس ابو سے اجازت دلوا دو۔" بے وقوف سمجھتا ہے ہمیں اس سے زیادہ روپیہ پیارا ہے۔ مگر ابو راضی نہ ہوئے "تم اور اس کی عادتیں بگاڑ رہی ہو شمو۔ اب وہ اس عمر کو پہنچ گیا ہے کہ سنجیدگی سے اپنے مستقبل کے بارے میں سوچے۔ دو تین سال میں وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے تو۔ تو آخر اس کا بیاہ شادی بھی تو کرنا ہے۔" ابو کو بیٹی

سے زیادہ بیٹے کی شادی کا ارمان تھا۔ مگر اصولی آدمی تھے۔ جب تک وہ اپنے خاندان کا بار اٹھانے کے قابل نہ ہو شادی کیسی! "میں کسی پرائی لڑکی کو مصیبت میں نہیں پھنساؤں گا۔" لوگ اس کے بیاہ کا پیام لاتے، ان کے جواب میں کہتے!

"لکھ دو اسے کہ اس وقت آنے کی ضرورت نہیں۔ مہینے ڈیڑھ مہینے میں واپس آؤں گا اسی وقت وہ آ جائے۔"

"ابو ___ ابو ___ اب وہ آپ کو لینے نہیں آئے گا۔ وہ آپ سے بھی روٹھ گیا ___ روٹھ گیا وہ۔" جانے دل کی گہرائیوں میں سے یہ کیسی آوازیں اٹھ رہی ہیں؟

ابو کے اصرار پر اس نے ایک لمبا چوڑا خط بھیا کو لکھا۔ کچھ نصیحت، کچھ پیار محبت، کچھ مستقبل کی فکر کا تذکرہ۔ بالکل ابو کی طرح۔

اس پر وہ بگڑ گیا۔ "تم اپنے کو بڑی قابل فاضل سمجھتی ہو۔ جھوٹی سچی ڈگریاں کیا لے لی ہیں کہ بس ہر کسی کو نصیحت کا حق مل گیا ہے۔ خیر تم اور ابو مزے سے رہو۔ اب میں کبھی تم دونوں سے نہ بولوں گا ___ تمہارے پاس کبھی نہیں آؤں گا۔" اونہہ بھیا روٹھ سکتا ہے کیا وہ نہیں؟ کتنے دن اس نے بھیا کو خط نہیں لکھا۔ مگر ہر ڈاک پر بے قراری سے منتظر رہتی۔ خفگی غصے کا ہی سہی خط آئے تو!

آگ کا ایک گولہ پیٹ کے اندر سے اٹھا اور سینے میں جا کر بھڑکنے لگا ___ کاش ___ کاش یہ شعلے پانی بن جائیں تو ___ تو ___ شاید پچھتاوے کی جہنمی آگ بجھ جائے۔

مگر آنکھیں ویران تھیں۔ اور تخیل کی دنیا آباد۔

"ابو وہ بڑا بے وقوف ہے خود اپنا برا بھلا سمجھتا ہی نہیں۔ بھلا اس نے پڑھ کر نہیں دیا اور میں نے پڑھ لیا تو کیا یہ میرا قصور ہے؟"

ابو مسکرائے تھے "شمو بیٹیا۔ ناراض نہ ہو۔ وہ تمہارا چھوٹا بھائی ہے۔ اس کی ماں کے مرنے کے بعد دراصل میں نے ہی لاڈ پیار میں اسے بگاڑ دیا تھا۔ اب اس کو یہ احساس ستاتا ہوگا کہ بہن تو ایم اے پاس اور بھائی کسان!"

ابو سچ ہی کہتے تھے وہ خود بھی جان سے اس کا ہر طرح خیال کرتی تھی۔ کبھی بڑا پا نہیں جتایا، کبھی اپنے کو اس سے قابل اور ذہین نہیں سمجھا۔ اور سچ مچ وہ کتنا ذہین اور تیز ہے۔ بغیر اعلیٰ تعلیم پائے ہی وہ کتنی ایسی باتیں جانتا ہے جو وہ بھی نہیں جانتی۔ فر فر انگریزی بولتا ہے۔ اخبار پڑھتا ہے۔ سیاست سے واقفیت رکھتا ہے۔

بجیا اور بھائی جان ابو کو خدا حافظ کہنے آئے تو خبر لائے کہ اُفو بہت خفا ہے۔ بجیا اس کی خالہ کی بیٹی اور بھائی جان چچا زاد بھائی تھے۔ اور دونوں میاں بیوی ان دونوں کو سگے بھائی بہن کی طرح ہی چاہتے تھے۔

مگر تیسرے دن اس کا خط بجیا کے نام آیا جس میں لکھا تھا، ابو سے کہنا میں ان کی ہر تمنا پوری کروں گا۔ مگر وہ مجھ سے ناراض نہ ہوں! میں کیا نہیں کر سکتا ان کے لیے۔" اور آخر میں دو سطریں خود اس کے نام "بھنو تو مجھ سے روٹھ گئی ہے! مگر کوئی بات نہیں۔ میں ابو سے ملنے آؤں گا تو تجھے منا لوں گا۔ میری بھنو کا دل تو پریم کا ساگر ہے ساگر۔ مگر ہاں کبھی کبھی اس میٹھے ساگر میں کڑوے سوت بھی آ کر مل جاتے ہیں —— پاگل بھنو۔"

دونوں بہنیں ہنس ہنس کر اس خط کو پڑھتیں اور بھیا کی باتیں کرتی رہی تھیں اور وہ سوچنے لگی تھی کتنا صحیح تجزیہ کیا ہے میرے بھیا نے میری سیرت کا۔ کتنا ذہین ہے بھیا۔

اس کا جی چاہتا تھا کہ بھیا کا فارم خوب ترقی کرے۔ وہ خوب روپے کمائے اس کی اچھی جگہ شادی ہو۔ پیاری سی دلھن آئے۔ ننھے منے گول مٹول بچے ہوں۔ بھیا کی طرح حسین و پیارے اور پھر وہ دونوں مل کر ان بچوں کا

لاڈ کریں، چھیڑیں، ستائیں۔ جیسے بجیا اور بھائی جان کے بچوں کو ستاتے ہیں۔

ابو روانہ ہونے کے وقت تک بار بار بھیا کا ذکر کرتے رہے جیسے پچھتا رہے ہوں کہ کیوں نہ بلایا اسے۔ "شمو ہیں آتے ہی اس کے لیے روپے کا انتظام کروں گا۔ اور ہاں تم اسے میرے آنے کی تاریخ لکھ دینا ہوائی اڈے پر وہ مجھے لینے آجائے گا تو خوش ہو جائے گا۔ سفر خرچ کے لیے روپے بھیج دینا اسے۔"

وہ دل ہی دل میں مسکرائی تھی! ابا ظاہر میں کتنے سخت اور اندر سے کتنے نرم ہیں بالکل بھیا کی طرح!

اس کو یہ گوارا نہ تھا کہ بھیا کو اس کے سوا کوئی اور کچھ کہے۔ وہ نہ اگر لڑنے پر کمربستہ ہو جاتی۔ بحثیں کرتی۔ ابو تک کچھ کہتے تو اس کی طرف سے صفائیاں دینے لگتی۔ اس سے محبت کا، ڈانٹ ڈپٹ کا، تربیت کا، خدمت کا حق اس کا ہے۔ صرف اس کا۔

سورج کی کرنیں بام و در کو روشن کر چکی تھیں۔ بام و در کی طرف سے آنے والی آوازیں بتا رہی تھیں کہ دنیا جاگ گئی ہے اور اپنے معمولات میں مصروف ہو چکی ہے۔ گھر میں بھی لوگ اٹھتے جا رہے تھے۔ کوئی نماز پڑھ رہا تھا۔ کوئی رو رہا تھا۔ کوئی باورچی خانہ میں تھا۔ چھپر میں چچا ابا بیٹھے تلاوت کر رہے تھے۔ بار بار ان کی آواز ٹوٹ جاتی تھی اور وہ دم بھر کو رک کر پھر عقیدے کا سہارا پکڑنے لگتے تھے۔

اندر کے دالان کا ایک اندھیرا کونا یکایک سورج کی کرن سے روشن ہو گیا۔ خواب کے سے عالم میں وہ وہاں جا کھڑی ہوئی۔ لکڑی کی پرانی، لمبی سی میز پر اس کے اپنے ہاتھ کا کڑھا ہوا میز پوش پڑا تھا۔ ایک طرف دس بارہ کتابیں اردو اور انگریزی کی سلیقے سے چنی تھیں۔ جاسوسی اور مزاحیہ کتابیں۔ اسے بھیا میں کبھی سنجیدگی نہ آئے گی۔ کچھ اخباروں کی کٹنگ پیپرویٹ

سے دبی نظر آئیں۔ کرکٹ کی خبریں۔ دنیا بھر کے کرکٹ پلیرز کی تصویریں۔ دو تین گلابی فائلیں ایک طرف دھری تھیں۔ ایک میں چچا ابا کے وسیع فارم کا حساب کتاب تھا اور دوسرے میں خود بھیا کے کھیتوں اور فالیز کا حساب ایک فائل میں آئندہ ہونے والے کاموں کی تفصیل درج تھی۔ ۶۹ء ٹیوب ویل، ۷۰ء ٹریکٹر، ۷۱ء آموں کا باغ تیار اور ۷۵ء میں دس بارہ ہزار سال کی آمدنی! تین ہزار کو ابو کو قسط کے۔ دو ہزار بھنو کی ساڑھیوں کے لیے اور باقی ——— ٹانگیں لڑکھڑا ئیں! اس نے مضبوطی سے میز کا کونہ پکڑ لیا۔ پرانی میز زور سے چرچرائی!

اور پھر یکا یک اس کی نظر البم پر پڑی۔

ٹانگوں کی کپکپاہٹ، دل کا درد، ابو کی فکر، کچھ بھی یاد نہ رہا۔ عمرِ گذشتہ کی کتاب اس کے سامنے کھلی پڑی تھی۔ بچپن اور شباب کی زندگی کی تفسیر۔ وہ دونوں اماں کی گود میں بیٹھے ہیں۔ اماں جن کو انھوں نے دیکھا نہ تھا۔ مگر ہمیشہ دل سے اتنا قریب۔ اتنا قریب محسوس کیا تھا جیسے وہ کبھی جدا نہ ہوئی ہوں۔ دوسری ابا اور اماں کی ہے۔ اور تیسری میں چاروں نظر آ رہے تھے۔ اور پھر کتنی ان دونوں کی اکٹھی تصویریں۔ کہیں لڑتے ہوئے، کہیں درخت پر چڑھے کہیں گلے میں باہیں ڈالے، کہیں ابو کے کندھے پر ہاتھ رکھے، کہیں بھائی جان اور بھیا کے ساتھ سنجیدہ با وقار بنے کھڑے ہوئے۔ اور یہ۔ یہ اس کی ایم۔ اے کی ڈگری کے بعد کی تصویر۔ بھیا کس پیار، کس فخر و ناز کے انداز سے دیکھ رہا ہے اسے!

وہ کب تک ان میں کھوئی رہی نہیں جانتی تھی۔ وہ یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ آج اس کے بھیا کی جدائی کو تیسرا دن ہے ——— دالان، چھپر، صحن، اور چبوترہ عورتوں اور بچوں سے اور باہر بیٹھک، مسجد اور وسیع آنگن چار گاؤں کے مردوں سے کھچا کھچ بھر چکا تھا۔

دونوں ہاتھوں سے میز کا کونہ مضبوط پکڑے وہ جھکی ہوئی ان تصویروں
میں غرق تھی۔ جو تین دن پہلے اس کی زندگی کی ٹھوس حقیقت تھیں!
بھانت بھانت کی آوازیں کانوں میں یوں گونج رہی تھیں جیسے دور
کہیں مکھیوں کی بھنبھناہٹ! کبھی گریہ وزاری کا شور سا بلند ہوتا۔ دبی
دبی سسکیاں سنائی دیتیں۔ مگر اس کے لیے یہ سب بے معنی آوازیں تھیں۔
ایک دم کتابوں کے اوپر سے رکھی کالے چمڑے کی کاپی لڑھک
کر اس کے سامنے آگری!
ڈائری!
تو بھیا اب ڈائری بھی رکھنے لگا ہے؟
گاؤں والوں کی مشکلیں اور مسئلے، ان کی محبت اور خلوص۔ اس سے
ان کا لگاؤ۔ کسی افسر سے ان کے لیے بحث! فارم اور کھیت اور باغ کی
ترقی کے منصوبے۔ آئندہ سال ابو، بھنو، بجیا اور بھائی جان کو لے کر کشمیر
جانے کا پروگرام!
جس آواز کو وہ مسلسل جھٹلا رہی تھی۔ وہ ایک دم زور زور سے
کانوں میں گونجنے لگی۔ بھیا ایک ٹرک کی جھپیٹ میں آگیا۔
"بھیا کا ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ بھیا کا ایکسیڈنٹ ہوگیا۔"
میرا بھیا کیا کچھ کرنا چاہتا تھا۔ کچھ بھی تو نہ کرسکا۔ کتنی ناشاد و نامراد
گزری اس کی زندگی ــــ
"ہمرے بھیا تو دیوتا تھے۔" اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ ایک سوکھی ماری
بڑھیا چچی اماں کے پیر دبا دبا کر سسک سسک کر کہہ رہی تھی!
"تمھیں کیسے صبر آوے گا بٹیا جب ہمرا کلیجہ پھٹا جاتا ہے" اب وہ
ہمہ تن گوش تھی!
"بوبو تم تو بھیا کی ماں ہی تھیں۔ ماں کی طرح یوں پالا تھا۔ کلیجے میں آگ

لگی ہوگی ۔۔ ہائے بھیا تو ہمیں بھی لاوارث کر گئے بولو ۔"

دوسری عورت نے پلو سے بہتے آنسو پونچھے!

" جب سے بھیا گاؤں میں آیا بھیا ۔ لگتا ہمارا سگا بھائی آگیا ۔ وہ تو بالکل ہم میں سے ایک تھے ۔"

ایک جوان عورت جو شاید گاؤں کی بہو تھی بڑی صاف زبان میں بھیا سے کہہ رہی تھی!

" ارے بھیا ہمرے بیٹے تھے بٹیا ۔ جب سے گاؤں میں آئے ہم سبھوں کے لیے ایسروں اور حاکموں سے جھگڑتے رہتے ۔ جو لوٹنے کھسوٹنے آتا بھیا اس کے سامنے کھڑے ہو جاویں تھے ۔

" ہمرے بھیا کلکٹر لگیں تھے کلکٹر ۔"

ایک بوڑھی عورت بڑے فخر کے انداز میں کہہ رہی تھی ۔

" بھیا میں چھوٹے بڑے کا بھید بھاؤ نہ تھا ۔ بھیا ہمرے گھروں میں آ تنے ۔ ہمری کھاٹ پر بیٹھتے ۔ ہمری ہنڈیا سے دال بھاجی نکال کر مجے سے کھاتے ۔۔"

" ہمرے نصیب ہی کھوٹے ہیں ۔ ہم جانت تھے بھیا آگئے ہمرے نصیب پھر گیو ۔"

" ہائے میا میرے منوا کو بکھار آیا تو سارا دن بھیا بیٹھے رہے اس کے پاس ۔ اور آدھی رات کو جب منوا بے ہوش ہو گیا تو چار کوس جا کر ڈاگدر کو لے آئے ۔ ہائے مورا بھیا ۔"

ایک ادھیڑ عورت نے چھوٹے منوا کو دھکیل کر پرے کیا اور پلو منھ پر ڈال کر ہائے اور سر میں رونے لگی ۔

" ارے بو چودھری کہے تھا اگلے سال الکسن میں بھیا کو پردھان بنائیں گے ۔ بھیا تو کسمت پھیرنے آئے ہیں ہمرے گاؤں کی ۔"

"بھیا نے سب کے دلوں میں گھر بنا لیا تھا بیٹیا۔ تین دن سے چار گاؤں میں سوگ پڑا ہے۔ کل کسی گھر میں عید نہیں ہوئی۔ ہائے بھیا بگیر عید کیسی"۔ بلک کر کسی نے کہا۔

"ارے میاں پرسوں ہولی ہے نا۔" ایک عورت نے سینے پر دوہتڑ مارا۔ "بھیا نے پچکاریاں منگوائی تھیں۔ رنگ اور گلال منگوایا تھا۔ ہائے دیا۔ کہیں تھے اب کے سب کے سنگ پھاگ کھیلوں گا۔"

دوسری نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا "چاروں گاؤں کے لونڈے رو رہے ہیں بیٹیا۔ ہولی نہ ہوگی اب کے۔ ہمرا بھیا چھوڑ کر چلا گیا۔"

اسے کچھ خبر نہ تھی کہ کب، وہ میز کے پاس سے ہٹ کر ان عورتوں کے بیچ میں آ بیٹھی۔ ایک ایک لفظ امرت بن کر رس گھول رہا تھا۔ "بی بی بھیا ہمارا بھی تو تھا" ایک لڑکی نے رو کر اس کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ دوسری عورت نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بڑے گمبھیر لہجے میں اسے دلاسا دیا۔ "بیٹیا بھیا ہمرے دیوتا تھے۔ بھگوان نے بھیجا تھا ہمرا کلیان کرنے۔"

"بھیا ہمرے دیوتا"

"میرا بھیا ان سب دلوں میں زندہ رہے گا" دل کی گہرائیوں میں سے ایک آواز اٹھی۔

بے حسی کی چٹان ٹوٹ گئی، پچھتاوے، مایوسی اور محرومی کے پتھریلے حصار بکھر گئے۔ چھتیس گھنٹے کے خشک آنسوؤں کا سوتا جانے کہاں سے پھوٹ رہا۔

اس کا سارا جسم آنسو بن کر پگھلا جا رہا تھا۔

مگر دل کی آگ اور دماغ میں بھڑکتے شعلے پر یہ آنسو ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دے رہے تھے۔

دُنیا کیا سے کیا ہو جائے گی؟

وہ دیر سے بس کے انتظار میں کھڑی تھی اور سوچ رہی تھی ـــــ دفتر پہنچنے میں دیر ہوئی تو افسر صاحبہ کی لعنت ملامت اور ملازمت ختم کرنے کی دھمکیاں! اونہہ! وہ کیا جانے کہ ہم آٹھ سات میل دور سے کس مصیبت سے دفتر پہنچے ہیں ـــــ گھنٹوں بس کا انتظار کرنا پڑے تو موصوفہ کو کھلے! وہ تو لمبی سی کار میں بیٹھیں اور دم بھر میں دفتر پہنچ گئیں ـــــ دو ڈھائی گھنٹے کام کیا ـــــ پھر کھانا کھانے کے لیے موٹر میں بیٹھیں اور گھر روانہ ہو گئیں۔ یہاں سوکھی روٹیاں، ذرا سی سبزی سے جیسے تیسے حلق سے اتار کر پھر وہی ٹپ ٹپ ٹپ۔ گھس گھس گھس ـــــ اور تھک وہ جاتی ہیں! کام وہ کرتی ہیں!! افسر جو ٹھیریں! سنتی ہوں ان کا ایک بچہ بھی ہے، جو ان ہی کے پاس رہتا ہے، کسی انگریزی اسکول میں پڑھتا ہے ـــــ مگر میاں کہاں ہیں آخر ان کے؟ وہ شوبھا تو کہتی ہے کہ انھوں نے میاں کو گھر سے نکال دیا ہے ـــــ بچے کو میاں لے جانا چاہتے تھے، مگر وہ نہیں ـــــ اور شوبھا تو یہ بھی کہتی ہے کہ وہ ان کو بہت چاہتا تھا ـــــ مگر ـــــ مگر.....

"خالہ جان آداب ـــــ خالہ جان آداب۔" تین ایک سی آوازیں کانوں سے ٹکرائیں۔ اس نے مڑ کر دیکھا، نصیرہ کے تینوں بڑے بچے اسکول کی

یونیفارم پہنے سامنے کی پٹری سے گذر رہے تھے۔ الجھے بال، ٹانگوں پر چوٹیں، گردن اور باہوں پر پھنسیاں، کسی کا میلا نیکر تو قمیص صاف، کسی کا جمپر گندا، شلوار صاف، مگر دوپٹہ پھٹا ہوا ـــــ ارے یہ حسینہ کتنی پیاری نکل آئی ہے دو سال میں ؟ خواب آلود آنکھیں، پتلی سی ستواں ناک، گندمی رنگ اور گھونگریالے بال ـــــ جب لڑکی بچپن کی حدیں پار کر کے جوانی کی سرحد چھوتی، تو کتنی حسین لگتی ہے ـــــ مگر ـــــ مگر اس کی آنکھوں میں دکھ اور شرم کی پرچھائیاں اور چہرے پر بے کسی اور بے بسی کی یہ کیفیت ! بدنصیب لڑکی !

روشن میاں چھوٹے بچے کا ہاتھ پکڑے بڑی سڑک کی طرف جا رہے تھے ان کے پاؤں کے لنگ نے جو سال گذشتہ ٹانگ ٹوٹ جانے سے پیدا ہو گیا تھا، ان کی کیفیت اور بھی قابل رحم بنا دی تھی۔

" آداب آپا جان ۔" انھوں نے سر جھکائے ہوئے کہا اور تیزی سے آگے بڑھ گئے ـــــ دو سال سے انھوں نے کسی سے آنکھ ملا کر بات نہ کی تھی !

جب وہ ان بچوں کو اور روشن میاں کو دیکھتی تو دل اندر سے مسوس سا اٹھتا اور وہ کچھ عجیب شرم اور دکھ کی کیفیت میں ڈوب جاتی ـــــ جیسے اس گھر کی تباہی میں اس کا بھی کچھ حصہ ہو ـــــ نصیرہ پر اسے اتنا غصہ آتا کہ سامنے ہو تو مار مار کر بھرکس بنا دے ـــــ خود غرض عورت ! اس کے میاں کے جانے کے بعد نصیرہ کس قدر اس سے لڑی تھی جب اس نے دوسری شادی رچالی تو تو آپ ہی کیوں بچوں کے لیے اپنی جوانی خاک میں ملائیں۔ طلاق لے کر مزے سے زندگی بسر کیجیے ـــــ بچے کیا صرف آپ کے ہیں ؟ ان کے نہیں ؟ انھیں درد نہ آیا یوں انھیں منجدھار میں چھوڑتے ہوئے ؟ " وہ لاجواب ہو چکی تھی۔ دل میں غصے کا لاوا سا ابلتا محسوس ہوا، مگر ـــــ میرے بچے ؟ ان کا کیا ہوگا ؟ میری تو زندگی کی خوشیاں ختم ہو گئیں ـــــ مگر یہ بے سہارا مجبور بچے ! یہ دکھ بھری زندگی نہ

گزاریں ــــــ" اب ان ہی کی خاطر تو وہ یہ نوکری کر رہی ہے اور ان کا مستقبل
بنانے کے لیے اپنے کو خاک میں ملا رہی ہے.....

بس کی گھڑ گھڑاہٹ نے اسے خواب سے چونکا دیا ــــ کئی آدمی
اسے دھکا دے آگے بڑھ گئے تھے۔ جیسے تیسے وہ بھی بس پر چڑھی۔ "لیڈیز
اونلی" کی ایک سیٹ خالی تھی۔ جلدی سے وہ اس پر بیٹھ گئی۔ فوراً ہی کوئی
اور عورت بھی اس کے پاس آکر بیٹھی ۔ ایک پل بھر کے لیے اس نے پہچانا
نہیں ۔ اب دو سال سے وہ اس کے پڑوس سے کہیں اور چلی گئی تھی ـــــ
اور پھر ــــ کہاں وہ گھٹیا معمولی ساڑیاں پہننے والی، سیدھی چوٹی گوندھے
آنکھیں جھکائے چلنے والی پرائمری اسکول کی سیدھی سادی استانی اور
کہاں یہ لڑکی !

"آپا ـــــ آپا جان ! کتنی دبلی ہوگئی ہیں آپ !" شمیم نے بڑی اپنائیت
سے کہا اور وہ اس کے بدلے ہوئے لہجے پر اور حلیہ پر غور کرتی رہ گئیں،
قیمتی فارن جارجٹ کی گہری نارنجی ساڑی، سانولے رنگ پر ویسی ہی گہری نارنجی
لپ اسٹک، بغیر آستین کا ریشمی بلاؤز، جس سے آدھی پیٹھ اور سارا پیٹ
نظر آ رہا تھا ـــــ سرخ رنگ کا چمڑے کا قیمتی پرس، پیٹ تک لٹکی ہوئی
لمبی سی مالا اور دیو داسیوں جیسا جوڑا، جس کی اونچائی، گولائی اور بڑائی
تاج محل کے گنبد کو شرما رہی تھی !

"تم بدل بھی تو بہت گئی ہو شمیم ـ" اس نے مسکرا کر کہا۔
شمیم کچھ جھینپ گئی "آپا جان دیکھیے، اپی نے امریکہ سے میرے
لیے یہ ساڑی، یہ پرس اور یہ جوڑی بھیجی ہے ـــــ اور بھی بہت سی
چیزیں ہیں ـ"

اس نے بات کاٹی "شمیم، تم بچوں کو اس انداز میں پڑھانے
جاتی ہو ــــ یہ تو کچھ اچھا نہیں لگتا ــــ" دو برس پہلے وہ اس سے

انگریزی پڑھنے اور کشیدہ سیکھنے آیا کرتی تھی اور وہ اسے وقت بے وقت نصیحت کرنے کی عادی تھی۔ اور عادت آسانی سے کہاں بدلتی ہے۔

"اوہ ـــــ مائی ڈیر آپا جان ـــــ ناؤ آئی ایم ناٹ ان دیٹ ڈرٹی اسکول (Now I am not in that dirty school)"

اس نے ناک سکوڑ کر دل میں کہا "میرے خدا یہ انگلش کیوں بولنے لگی"

پھر اس نے حیران ہو کر شمیم کی طرف دیکھا "تو اب کس پاک پاکیزہ جگہ ہو؟" اسکول کے لئے لفظ 'ڈرٹی' اس کو سخت ناگوار ہوا تھا۔

"آپا جان، اب تو میں ایک فرم میں نوکر ہوں۔ یو نو ـــــ آپا جان۔ اب میری انگلش بہت امپروو ہو گئی ہے ـــــ اینڈ ـــــ" اور پھر جیسے ایک دم بریک سا لگ گیا اور اس کا انگلش کا ذخیرہ دم توڑ گیا ـــــ انگلش میں فیل ہو جانے کی وجہ سے انٹر پاس نہ کر سکی تھی اور اپنے اور بڑھیا ماں کے گزارے کے لیے ایک پرائمری اسکول میں چھوٹی سی نوکری کر لی تھی۔

"اپی تو مجھے امریکہ بلا رہی ہیں ـــــ شامی بھیا نے بھی لکھا ہے ـــــ مگر ـــــ مائی مدر از ال (MY MOTHER IS ILL) اینڈ یو نو ـــــ آئی ایم اے ..... میرا مطلب ہے مجھے ان سے بہت محبت ہے۔"

"بی بی، تم بے کار اس قدر انگلش چھانٹ رہی ہو۔ میں اردو بہت اچھی طرح سمجھتی ہوں اور تم بھی تھوڑی بہت جانتی ہو۔"

وہ کھسیانی ہنسی ہنس پڑی ـــــ دم بھر کو خاموشی رہی ـــــ دونوں نے ٹکٹ خریدا، اور وہ اب کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی کہ شمیم نے پھر مخاطب کیا "آپا جان ـــــ نصیرہ آپا نے پچھلے خط میں آپ کو پوچھا تھا ـــــ لکھا تھا ـــــ لکھا تھا ـــــ "وہ کچھ ہچکچائی" کہ آپ اب بھی وہاں رہتی ہیں ـــــ یا ـــــ یا آپ نے دوسری ....."

اسے غصہ تو بہت زور سے آیا مگر پی گئی "تم لکھ دینا نصیرہ

کو کہ میں اسی گھر میں رہتی ہوں۔ ویسی ہی زندگی بسر کرتی ہوں۔ مجھے اپنے عیش و آرام سے اپنے بچے اور ان کا مستقبل پیارا ہے۔"

شمیم کچھ سہم سی گئی اس نے پرس کھولا آئینہ نکال کر لپ اسٹک ٹھیک کی۔ پرس بند کر لیا۔

"نصیرہ اپی تو —— آپ نے تو سنا ہی ہو گا کہ امریکہ میں ہیں اور شمی بھیا سے انھوں نے شادی کرلی ہے —— ہائے ابا جان —— انھوں نے دلہن کے لباس میں اپنی جو تصویریں بھیجی ہیں وہ اتنی پیاری ہیں —— اور بھی بہت سے فوٹو ہیں، بیڈنگ کاسیٹوم میں سوئمنگ کرتی ہوئی، کار چلاتی ہوئی —— اسکیٹنگ کرتی ہوئی —— اب وہ خوب انگلش بولتی ہیں۔ سوسائٹی میں موو کرتی ہیں۔ اتنے ٹھاٹھ سے رہتی ہیں کہ بس۔ لوگ بدنام کرتے ہیں۔ کریں۔ جلتے ہیں —— حسد کرتے ہیں۔ ان سے۔" انگلش کا ذخیرہ پھر دم توڑ گیا۔

"مگر کیا نصیرہ کو اپنے بچے یاد نہیں آتے —— ان کی اس حالت کا احساس نہیں جن کو دیکھ کر غیروں کو دکھ ہوتا ہے؟"

شمیمہ کی تیغی بازی اس کی برداشت سے باہر ہو چکی تھی۔

"جی بچے؟" بچے تو روشن بھائی کے پاس ہیں ہی۔ وہ پال ہی رہے ہیں۔ آخر باپ کی بھی تو ذمے داری ہوتی ہے۔"

"اور ماں کی کوئی ذمے داری نہیں ہوتی؟"

"ہوتی ہے، مگر سب کی نہیں۔ اپی تو شہزادی بننے کے لیے پیدا ہوئی ہیں۔ وہ کیسے ان بچوں کی خاطر اپنی زندگی تباہ کر لیتیں۔" شمیمہ نے وہی رٹا ہوا سبق دہرایا۔

زندگی تباہ کرنے سے تمہارا کیا مطلب ہے؟ میں تو برسوں اس کے پڑوس میں رہی ہوں۔ میری اس کی دوستی رہی ہے۔ دس بارہ برس اسی میاں کے ساتھ اسی گھر میں اچھی خاصی ہنسی خوشی زندگی گزاری ہے۔

روشن میاں اسے دل سے چاہتے تھے، اس کی ہر جا بے جا بات ہنس کر جھیل جاتے تھے، خود گھر کے کاموں اور بچوں کی پرورش میں ہاتھ بٹاتے تھے۔
ایک ایک پیسہ آمدنی کا اس کے ہاتھ پر رکھتے تھے۔"

"مگر دیکھیے نا آپا جان —— " تبیمہ گھبرا سی رہی تھی —— "آپ کیا جانیں اندر ہی اندر وہ انھیں کیسا جلاتے تھے۔ خود سب کے سامنے مظلوم بنے رہتے اور اپنی بے چارگی کی ہر بات کا لوگوں سے بکھان کرتے —— ان کی یہ جھلی صورت، یہ غریب گھٹیا گھرانا۔ تھوڑی سی آمدنی، چھوٹا سا گھر۔ آپ ہی سوچیے بجیا جیسی خوب صورت، اسمارٹ اینڈ وانس عورت.....!"

"تو اس حسین، ایڈوانسڈ، اسمارٹ عورت نے یہ طلاق بارہ تیرہ برس پہلے کیوں نہ لی؟ یہ اتنے بچے کیوں پیدا کیے؟ ....."

"بھلا آپ ہی سوچیے، آپا جان کہاں، روشن بھیا کہاں شامی کوئی مقابلہ ہی نہیں۔"

"ہاں جب شامی کو باہر نوکری مل گئی، جب بہت سارو پیہ وہ کمانے لگا تو اس میں بہت سی خوبیاں پیدا ہوگئیں، ورنہ یہی شمس اللہ —— اسی لبتی میں جب کلرک تھا تو کبھی نصیرہ بیگم نے مجھ سے یہ نہیں کہا کہ وہ اسے چاہتی ہے۔ میں تو آخر تک اسے تم لوگوں کا بھائی سمجھتی رہی ——"

"کوئی سگے بھائی تو نہیں تھے —— اور ——"

"اونہہ۔ مجھے کیا —— اگر کوئی عورت اپنے بچوں سے زیادہ روپیہ اور عیش و عشرت کی زندگی کو چاہتی ہے تو یہ اس کا فعل ہے۔ ہٹو ذرا جگہ دو میرا بس اسٹاپ آگیا۔"

اور وہ شمیمہ کے سلام کا نوٹس لیے بغیر اس تیزی سے بس سے اتری کہ گرتے گرتے بچی اور کئی مردوں کی بے ہودہ ہنسی دور تک اس کا پیچھا کرتی رہی۔

ساڑھے پانچ بج چکے تھے۔ پندرہ منٹ سے وہ انتظار میں کھڑی ہوئی تھی کہ

بس نہیں آتی تو کوئی اسکوٹر ہی مل جائے ۔۔۔ بچے بے چارے گھر پر پریشان ہو رہے ہوں گے ۔۔۔ جانے کھانا بھی کھایا ہو گا یا نہیں ۔ ببلو تو ویسے ہی ضد شروع کر دیتا ہے ۔۔۔ فرزانہ کیسے اسے سنبھالے گی ۔۔۔ مگر نہ بس آرہی تھی نہ اسکوٹر رک رہے تھے ۔

اچانک ایک بڑی سی نئی مرسیڈیز کار بالکل اس کے سامنے آکر رک گئی ۔

" ارے مسز عزیز، ہاؤ آر یو ۔۔۔ " کار کا فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولے کوئی کھڑا تھا ۔۔۔ نہایت قیمتی رَو سلک کا سرخ " بیل بوٹم " اور پرلیس کا سفید بے آستین کا، بیلوس ٹاپ جس کے اندر سے گلابی جالی کی چولی جھلک رہی تھی ۔ گلے میں موتیوں اور ہیروں کا لمبا سا ہار، دو دو انگل کے کٹے ہوئے بال، بے حد گہرا میک اپ، ایک ہاتھ میں سرخ کانچ کی چوڑیاں کہنی تک ! دوسرے میں جڑاؤ کڑا ۔ اور پاؤں میں نازک سے سنہرے چپلوں پر بھاری چھن چھن کرتی پازیب ۔

" واہ بڑی شان، کیا کیا نمونے پیدا کرتا ہے ! " اس نے سوچا ۔

" آپ تو پہچان ہی نہیں رہیں ۔۔۔ مسز ۔۔۔ مسز عزیز ۔ "

اب وہ پہچان گئی تھی ۔

" پہچاننا آسان بھی تو نہیں ہے رانی ۔۔۔ " اسے زبردستی مسکراہٹ چہرے پر لانی پڑی ۔

" او ۔۔۔ یہ لباس ؟ کیسی لگتی ہوں اس میں میں ۔ " حسب عادت اس نے اٹھلا کر کہا ۔

جب وہ کوئی سستی ریشم کی ساڑی پہن کر آیا کرتی تھی تو اسی طرح اٹھلا کر پوچھا کرتی تھی ۔ " کیسی لگتی ہوں میں ؟ " اس کے حسین چہرے اور متوازن جسم کو دیکھ کر وہ بڑی اپنائیت، بڑے پیار سے کہا کرتی تھی ۔

" بہت پیاری، بہت حسین ۔۔۔ رانی تو رانی ہی ہے یہ لباس تجھ پر کھِل

اٹھتا ہے ——— "مگر اس وقت جواب دینے کے لیے بڑی جرأت چاہیے تھی۔ اس نے الٹا سوال کر دیا "تم یہاں کب سے ہو؟ تم تو بمبئی چلی گئی تھیں نا"

"اب پھر یہیں آگئی ہوں ——— ادھر چانکیہ پوری میں میری کوٹھی ہے۔ اور . . . . . "

اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا ——— یہ کار ! یہ قیمتی لباس اور زیور ——— اور چانکیہ پوری جیسی جگہ میں کوٹھی ———

"چانکیہ پوری میں؟"

"ہاں ——— نیا فلیٹ خریدا ہے میں نے ——— پچیس ہزار میں فرنش کیا ہے اسے ——— اور دیکھیے یہ مرسی ڈیز ——— ابھی دو ہفتے ہوئے آئی ہے۔ ڈرائیور کو اسے ہاتھ نہیں لگانے دیتی ——— خود ڈرائیو کرتی ہوں۔"

"کوئی لاٹری نکل آئی ہے کیا؟" اس نے دل میں سوچا مگر اس قدر ذاتی سوال کرنا اسے اچھا نہیں لگا۔

"آپ وہیں نظام الدین میں ہیں اب تک، چلیے میں آپ کو چھوڑ آؤں۔" اس نے مجسم اخلاق بنتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں۔ تم کیوں تکلیف کرو ——— پھر میرا تمھارا راستہ بالکل جدا جدا ہے . . . ." وہ یوں تو پہلے بھی موٹر والوں کا احسان لینے سے کتراتی تھی۔ اور جب سے مالی حالت خراب ہوئی تھی، اس نے ان پڑوسیوں سے جو کار رکھ کر زیادہ اونچے، زیادہ مغرور۔ اور کبھی کبھی زیادہ بااخلاق ہو جاتے ہیں۔ ملنا جلنا بہت کم کر دیا تھا اسے اپنی خودداری دنیا کی ہر چیز سے پیاری تھی ———

"بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ میں خالی موٹر، بے وجہ ادھر ادھر دوڑاتی پھر رہی ہوں اور آپ یہاں کھڑی سوکھ رہی ہیں ———" اور قبل اس کے کہ وہ احتجاج کرے، رانی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اور فرنٹ سیٹ پر دھکا

دے کر بیٹھا، اور دوسری طرف بیٹھ کر وہیل سنبھال، موٹر اسٹارٹ کر دی۔
آپ یوں ماننے والی نہیں۔" بڑے فخر سے اس نے کہا۔
وہ کھسیاسی گئی تھی۔ اپنی کیفیت چھپانے کے لیے اس نے بات کرنا ضروری سمجھی۔ "بچے کیسے ہیں؟ گڈو اور لالی تو اب کافی بڑے ہو گئے ہوں گے۔"
ان بچوں سے اسے بڑا لگاؤ تھا۔ گھنٹوں اس کے چھوٹے بچوں کے ساتھ کھیلا کرتے تھے۔

"بچے!" اس نے زور سے قہقہہ لگایا "میں اب ان جھنجھٹوں سے آزاد ہوں ـــــ ایک تتلی کی طرح ـــــ ایک چڑیا ہوں ـــــ آسمانوں میں اڑنے والا پرندہ پنجروں میں قید نہیں رہ سکتا ـــــ"
وہ اس کا منھ دیکھنے لگی ـــــ بیچارے کے دماغ پر اثر ہے۔ جانے بچوں کو کیا حادثہ پیش آیا ہے! ڈرتے ڈرتے اس نے کہا "کیا ہوا بچوں کو؟"
"کیا ہونا ـــــ کچھ نہیں ـــــ باپ کے پاس ہوں گے، یا کسی اسکول کے بورڈنگ میں ـــــ"
"تو کیا اب تم اور خوشنود صاحب ساتھ نہیں رہتے ـــــ" نصیرہ کا واقعہ اچانک پوری جزئیات کے ساتھ ذہن میں تازہ ہو گیا۔
"اوہ!" وہ مسکرائی۔ "آپ بالکل بے خبر ہیں اب تک؟ وہ آپ کا خوشنود ـــــ بڑا شاعری کا دم بھرتا ہے ـــــ ارے مدت ہوئی میں نے اسے ـــــ وہ ـــــ میں اور وہ الگ ہو چکے ہیں بڑا اکھڑ قسم کا آدمی تھا ـــــ بد دماغ، بد تہذیب، عورت کی عزت کرنا نہیں جانتا ـــــ دن رات گھرداری کی چکی پیسنا اور بچے پلوانا چاہتا ہے۔" اس کے ایک ایک لفظ سے حقارت اور نفرت ٹپک رہی تھی!
"مگر تم تو اپنے میاں کی محبت کی، اس کی شاعری کی بڑی مداح بڑی

دل دادہ تھیں ———"

"دل دادہ ——— ہونہہ!" اس نے خالص تیسرے درجے کی بازاری ایکٹرسوں کی طرح کندھے اچکا کر موںہہ ٹیڑھا کر لیا "یہ تو مجھے جانے کیا ہوا تھا کہ اتنے برس اس بدتمیز، بے ہودہ کے ساتھ برباد کر دیے ——— وہ کیا اس قابل ہے کہ کوئی انٹلیکچول، کلچرڈ، عورت اس کے منہ پر تھوکے بھی!"

وہ اس شاک سے سنبھلنے بھی نہ پائی تھی کہ رانی نے ایک اور وار کیا "اَن اسمارٹ اَن کلچرڈ، بھدا، بدصورت انسان! نہ آرٹ سے مس، نہ اچھی بری تصویروں کی پہچان، نہ میوزک کا شوق تھرڈ کلاس شاعر اور سمجھتا ہے اپنے کو جانے کیا۔"

اس نے حقارت سے آرٹ، کلچر اور ذہانت کے اس کاغذی پھول پر نظر ڈالی ——— "تم میں خود کب سے ان سب کا ذوق پیدا ہو گیا ——— رانی؟"

"میں رانی نہیں ——— نورا ہوں ——— نورا ہیموٹل ———"

"تو کیا کسی ہیموٹل سے شادی کر لی ہے تم نے!"

"ہونہہ شادی؛ شادی دو دلوں کے میل کا نام ہے ——— وہ میرا ہے۔ میں اس کی ہوں ——— دل سے، جان سے۔ یہی شادی ہے ——— نورا ہیموٹل ——— اس کی لاکھوں کی دولت کی مالک ——— اس کی دل اور روح کی مالک ہے ———"

"تو نام کے ساتھ ذوق بھی بدل گیا شاید ———" اس نے طنز سے کہا۔

"ذوق؛ میرا ٹیسٹ ہمیشہ سے بہت ہائی تھا ——— مجھے ڈانس کا شوق تھا ——— میوزک پر مرتی تھی۔ آرٹ پیپرز پر جان جاتی تھی ——— مگر مجھ سے چولھا جلوایا جاتا ——— بچے پیدا کرائے جاتے رہے ——— اب آؤ ——— میری زندگی دیکھو ——— ہائی سوسائٹی میں ہر مرد میرا شیدائی ہے، ہر عورت مجھ سے جلتی ہے ——— گھر میرا آرٹ اور کلچر کی جنت ہے ——— میں نے دنیا کے بڑے بڑے نادر آرٹسٹوں کی تصویروں سے گھر سجایا ہے ——— ہونہہ۔

خوشنود! گھر بھر کی دیواروں پر اپنے بزرگوں، بچوں اور میاں بیوی کی تصویریں لگا رکھی تھیں ـــــ اوہ ـــــ لوگ کتنے بدذوق، اَن کلچرڈ ہوتے ہیں ـــــ"
باتوں کے جوش میں سامنے سے آتی ہوئی سائیکل اسے دکھائی نہ پڑی۔ ایک جھٹکے سے اس نے گاڑی موڑی۔ "سور ـــــ گدھے ـــــ اسٹوپڈ ـــــ"
وہ چاہتی تھی کسی طرح اس عورت سے پیچھا چھڑا لے ـــــ جس میں دو برس پہلے کی رانی کا کوئی پتا نہ تھا ـــــ رانی خوبصورت تھی، نمائش پسند بھی تھی اور آسائش و آرام سے بھرپور زندگی کے خواب بھی دیکھا کرتی تھی۔ تھوڑی سی فلیرٹ بھی تھی اور اکثر اس کی غلط باتوں پر وہ ٹوک بھی دیا کرتی تھی ـــــ مگر یہ ـــــ یہ نورا؟

"تمھیں اپنے بچے یاد نہیں آتے؟"
"نہیں یاد نہیں آتے۔ کیوں یاد آئیں؟ میں نے انھیں اپنی خوشی سے چھوڑا ہے ـــــ مجھ جیسی عورت کیا اس لیے ہوتی ہے کہ دوسری جاہل، بے وقوف عورتوں کی طرح صرف بچے پیدا کرے اور کھانا پکاتی رہے ـــــ او معاف کیجیے گا ـــــ میرا یہ مطلب نہیں تھا ـــــ مگر دیکھیے نا ـــــ کبھی میرے یہاں آ کر میری زندگی دیکھیے ـــــ میں خوش ہوں ـــــ بہت خوش ـــــ"
"بچوں سے الگ رہ کر کون ماں خوش رہ سکتی ہے؟ یہ فطرت کے قانون کے خلاف ہے۔ ناری یا نورا ـــــ جو بھی تم اپنے کو کہتی ہو ـــــ"
"تم صرف ماں ہو۔ جس نے میاں کی بے وفائی کے بعد بھی اپنی زندگی نہ بنائی۔ اسی طرح دکھ اٹھا رہی ہو ـــــ مگر یاد رکھو، عورت صرف ماں نہیں ـــــ وہ انسان بھی ہے، اس کا دل ہوتا ہے، خواہشیں ہوتی ہیں۔ اور پھر مجھ جیسی لڑکی ـــــ بنا ہے اس کا صرف ماں اور بیوی بن کر رہنا کیا سوسائٹی کے لیے، دنیا کے لیے ایک لاس (LOSS) نہیں تھا؟ سیمو یل کہتا ہے، اگر ہمارے دیس میں نورا جیسی عورتیں پیدا ہونے لگیں تو ۔ ۔ ۔"

"میرے گھر کی گلی آگئی، گاڑی روک دیجیے نورا صاحبہ ــــ" اس نے تیز لہجے میں کہا۔

"او نو ــــ میں آپ کے گھر تک چھوڑ آتی ہوں۔"

"نہیں ــــ" اس نے سختی سے کہا۔ نورا نے گاڑی روکی۔ اس نے اپنا پرانا سستا سا پرس اٹھایا۔ مڑی، پھر رکی اور ایک ایک لفظ چبا کر بولی "محترمہ، میں آپ کی شکر گزار ہوں کہ اتنی شاندار گاڑی میں آپ نے مجھے لفٹ دی اور اس کی بھی کہ آپ جیسی عظیم ہستی کے ساتھ اتنا وقت گزارنے کا موقع ملا ــــ مگر....."

نورا اس کے لہجے سے پریشان سی تھی: "مگر؟"

"مگر اتنی زیادہ ہوس، نفس پرستی اور خودستائی میرے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔"

"آپ میری انسلٹ کر رہی ہیں۔" تیزی سے نورا نے کہا۔

"میں تمھاری انسلٹ کر ہی کیسے سکتی ہوں؟ میں ٹھوس زمین پر رہنے والی ایک معمولی عورت اور تم خلاؤں میں پرواز کرنے والی انٹیلیکچول، کلچرڈ، حسینہ ــــ"

"آپ کا آخر مطلب کیا ہے؟"

"البتہ تم خود اپنی انسلٹ کر رہی ہو ــــ اپنے کو گرا رہی ہو ــــ تم عورت کے ماتھے کا کلنک ہو۔ ماں کے نام پر دھبّہ ہو انسانیت کے ہر شریف جذبہ کی قاتل ہو ــــ خدا حافظ!" غصے میں تھر تھر کانپتی ہوئی وہ اتنی تیزی سے اپنی گلی میں مڑی کہ گرتے گرتے بچی!

سامنے سے اس کا چھوٹا بچہ لپکا چلا آ رہا تھا "امی ــــ آج تو اتنی دیر کر دی؟"

اس نے پانچ سال کے بچے کو گود میں اٹھا لیا اور اپنا چہرہ اس کے سرخ سرخ گال پر رکھ دیا اور بے قراری سے اسے چومنے لگی۔

ہم سفر

فرسٹ کلاس کے ڈبے کے ریزروڈ کیبن میں آرام سے ٹیک لگا کر دونوں نیم دراز ہو گئے دھوپ ابھی ڈھلی نہیں تھی۔ جالی دار جھلملیوں سے دھوپ کے ننھے ننھے دھبے شریر بچوں کی طرح کمپارٹمنٹ میں آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ سامنے کی کھلی کھڑکی سے برسات کی نم اور سرد ہوا ان کے چہرے اور بالوں سے گستاخیاں کر رہی تھی۔

سامنے کی سیٹ پر جج صاحب سفید کرتا پاجامہ پہنے نیم دراز بڑے پُرسکون لگ رہے تھے۔ جب کبھی وہ دونوں ساتھ سفر کرتے (ایسا موقع کم ہی نصیب ہوتا تھا) تو وہ اپنا سارا رعب و دبدبہ، اپنا عہدہ، اپنی شان، سب کو بھول کر سکون و اطمینان سے وقت گزارتے۔ راستے بھر دونوں ہنستے بولتے بال بچوں، گھر بار کے بارے میں باتیں کرتے کبھی کبھی علمی، ادبی قسم کی گفتگو کر کے منہ کا مزا بدل لیا جاتا تھا کتنی خوشی، کتنی طمانیت محسوس ہوتی تھی۔ ایسے موقع پر! ان کی بے پناہ مصروفیت کی وجہ سے ایسے بے بہا مواقع ذرا کم ہی اس کی زندگی میں آتے تھے کہیں وہ ہو اس کا محبوب جیون ساتھی ہو اور تنہائی کی دولت ہو، ٹرین زندگی کی رفتار کی طرح تیزی سے رواں دواں ہو اور وہ سب کچھ بھول کر اس کے بالوں سے کھیل

رہے ہوں اس کو لطیفے سنا رہے ہوں، اس کی باتیں، آنکھوں میں محبت کی چمک لیے شوق سے سن رہے ہوں اور بیچ بیچ میں پیار بھری جھڑپیں بھی ہوتی جاتی ہوں۔

"آہ! یہ چار پانچ گھنٹے ان کے اپنے ہیں اٹنڈنٹ بھی دروازہ کھولنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

جج صاحب نے مسکرا کر اس کو دیکھا اور نرم تکیوں پر سر ٹکا دیا۔ وہ اٹھی اور ان کی سیٹ پر پہلو میں آ بیٹھی۔ اس وقت اس کے ادھیڑ چہرے پر جھریوں کی جگہ محبت کی دمک، آنکھوں میں مسرت کی چمک اور ہونٹوں پر شرمیلی سی مسکان تھی وہ انوکھی اور نایاب مسکراہٹ جس سے آج کے دور میں نئی دلہنوں اور کم سن محبوباؤں کے چہرے بھی محروم ہیں۔

وہ ان کے کھچڑی بالوں میں انگلیاں الجھا کر انہیں سلجھانے لگی۔ تئیس برس سے یہ اس کا محبوب شغل تھا۔ جب سے دونوں بچے پردیس سدھارے تھے، اس کی محبت کی بھوک کچھ اور زیادہ بڑھ گئی تھی۔ جج صاحب نے مسکرا کر اسے دیکھا اور اپنا گداز ہاتھ جس کی پشت پر زمانے کی گردش نے باریک باریک لکیروں کا جال بن دیا تھا۔ اس کے چہرے پر رکھا اور اس کی آنکھیں خود بخود بند سی ہونے لگیں ——— کسی نے کھٹکنے والے دروازے پر زور سے دھکا دیا اور دونوں چونک پڑے۔ ایک عورت بچوں کے ساتھ اندر گھس آئی اس نے دیہاتی بولی میں بچوں سے کچھ کہا۔ وہ ننگ دھڑنگ ٹانگوں اور میلے پاؤں سمیت دوسری سیٹ پر قبضہ جما چکے تھے۔

"کیا ہے؟" اس نے ذرا تلخی سے کہا "کون ہو تم؟"

"مسافر ہیں ——— اپن بھی ———" عورت نے تیکھے انداز میں جواب دیا اور سیٹ کے باقی حصے پر پھیل کر بیٹھ گئی۔

اس نے حیرت سے دیہاتی عورت پر نظر ڈالی۔ ایک میلی زرد چادر سے اس نے اپنا سارا جسم ڈھک رکھا تھا۔ پاؤں میں ربڑ کے پرانے چپل تھے

اور چہرے پر غریبی کی چھاپ۔ بچوں کے کپڑے سستے مگر نئے تھے۔ عید ابھی گزری ہے۔ شاید اس کے لیے بنے ہوں گے مگر پاؤں میں سلیپر پرانے تھے۔

"یہ فرسٹ کلاس ہے۔ جانتی نہیں ہو؟"

وہ عورت کچھ دیر اس کا منھ تکتی رہی اور پھر سیٹ پر کچھ اور آرام سے بیٹھ گئی۔ جیسے اس کی گدگداہٹ کا مزا لے رہی ہو۔ بچے برابر گدوں پر اچھلنے اور پھسلنے میں مصروف تھے۔

"ارے تمھارے پاس ٹکٹ کا ہے کا ہے ——— تھرڈ کا نا؟"

"ہاں جی ٹکٹ کیوں نا ہوتا ——— یہ رہا۔" عورت نے پلّو سے ٹکٹ کھول کر فخر سے اس کے سامنے کر دیا۔

اس نے بیزاری سے ناک سکیڑی۔ "ہونہہ! یہ اول درجہ ہے۔ اوّل اور تمھارا ٹکٹ تیسرے درجہ کا ہے سمجھیں؟"

مگر دیہاتی عورت خاک نہ سمجھی۔ بس اس کا منھ حیرانی سے دیکھتی رہی۔

"چلو باہر ——— نہیں تو میں بلاتی ہوں، اٹنڈینٹ کو۔" خلوت میں یہ مداخلت اسے زہر لگ رہی تھی۔

جج صاحب نے پہلی بار آنکھیں کھولیں چند لمحے عورت اور بچوں کو غور سے دیکھا اور پھر بیگم کی طرف مڑ کر شیریں لہجے میں بولے "ارے رہنے بھی دو اتنی جگہ پڑی ہے۔ بیٹھا رہنے دو بے چاری کو۔"

عورت کی ہمت بندھی "اجی صاحب جی۔ سب نے کہا آگو جاؤ۔ جگہ مل جاوے گی تمھارے پاس تو یہ سب جگہ کھالی پڑی ہے۔ ہم بیٹھ گئے تو کیا گجب ہو گیا۔؟"

بیگم کی جھلاہٹ پر جج صاحب مسکرائے۔

"کہاں جا رہی ہو، بائی؟" انھوں نے عورت سے پوچھا۔

"ہم بائی وائی نا ہیں۔ ہم تو رحیمن ہیں۔ اپنے مالک کے پاس شہر جاویں ہیں۔

وہ وہاں مجبوری کر رہے ہے۔"

"اس سے پہلے کبھی ریل کا سفر نہیں کیا کیا؟"

"نا جی ــــ ایک دفا۔ انھیں کے ساتھ دو ٹیشن دور گئے تھے۔ یا اب ان کی چھٹی آئی کہ بچوں کو لے کر سہر چلی آ۔ کام لگ گیا ہے۔ کیا کرتی ـ اس کا کہنا تو کرنا ہی پڑرے ہے جی۔ بڑا جالم ہے!" عورت کی آنکھوں اور چہرے پر عجیب مسرت اور فخر کے رنگ بکھرے ہوئے تھے۔

جج صاحب نے بیگم کی طرف دیکھا۔ جو اب بھی تیکھی نظروں سے اس عورت کو گھور رہی تھیں۔

"اری تیرے پاس پیسے ہیں؟ بہت سے روپے؟" انھوں نے کچھ تمسخر کے انداز میں پوچھا۔ عورت نے شک بھری نظروں سے ان کو دیکھا۔ پھر شاید اسے اطمینان ہو گیا کہ یہ اتنی امیر عورت اس کی دولت ہتھیانے کی کوشش نہ کرے گی۔

"ہاں جی۔ ہیں کیوں نا ــــ پندرہ روپے، بارہ آنے اور پانچ پیسے ہیں پورے۔" اس نے کہیں سے ایک میلا سا کپڑے کا بٹوہ نکال کر کھنکھنایا۔ بچے پورے انہماک سے سائڈ نگ کھڑکیاں کھول اور بند کر رہے تھے ــــ "اری اتنے روپیوں سے کیا ہو گا؟ ٹی ٹی آئے گا تو تجھ سے پورے پچاس روپے لے گا۔"

عورت بے وقوفوں کی طرح اس کا منھ تکنے لگی۔

"رہنے دو بیگم ــــ میں ٹی ٹی کو سمجھا دوں گا۔ پھر چلتی گاڑی میں وہ بے چاری اتر کر جائے گی کہاں؟"

بیگم نے برا سا منھ بنایا اور میاں کی سیٹ کی پائنتی بیٹھ کر ٹیک لگا لی۔ ان کا سفر غارت ہو گیا تھا نا!

بچے کبھی گیلری میں دوڑتے، کبھی ان کے خوبصورت سوٹ کیسوں کے چمچماتے کنڈوں اور قفلوں پر ہاتھ پھیرتے، کبھی تھرماس، ناشتہ دان اور پھلوں کی کشمیری ٹوکری کو ہاتھوں سے چھوتے ــــ ماں نے ٹیک لگا کر آنکھیں بند

کرلی تھیں۔ اب اس کا بھولا چہرہ کچھ اور زیادہ معصوم لگ رہا تھا۔ جج صاحب کی مسکراہٹ اور گہری ہوگئی تھی اور بیوی کے تیوری کے بل اور بڑھ گئے تھے۔

"دیکھو بیگم، بچے کتنے خوش ہیں۔ اسی معصوم خوشی کی خاطر ہم تھوڑی سی تکلیف اٹھالیں تو......"

"اچھی مصیبت نازل کرلی ہے آپ نے۔"

"یہ مصیبت نہیں، خدا کی رحمت ہے، کسی کے کام آنا۔"

"اور جب ان غریبوں پر جرمانہ ہوگا، تب؟"

"تب؛ نہیں — کچھ نہیں ہوگا۔"

"میرا تو سفر غارت ہوگیا۔"

"دیکھو — چھوٹا بچہ کس مزے سے تمہارے تکیے پر سر رکھ کر سوگیا ہے۔"

"ہونہہ!"

گاڑی کسی اسٹیشن پر رکی — پھر چل دی — ٹی ٹی نے دروازہ کھٹکھٹایا اور اندر داخل ہوا۔ عورت اور بچے چونک پڑے۔ ٹی ٹی کے چہرے پر خشونت کے آثار صاف ظاہر تھے۔ مگر جج صاحب نے رواں انگریزی میں اس سے باتیں کیں اور جب اسے یقین ہوگیا کہ اس "جلیل الشان" شخصیت کو کوئی اعتراض نہیں تو وہ بھی نرم پڑ گیا۔

"ہاں صاحب — کوئی بات نہیں۔ غریب ہے بے چاری — مگر دلی سے پہلے اسے کسی اور ڈبے میں بھیج دیجیے گا۔ نہیں تو ممکن ہے دلی پر لوگ اسے پریشان کریں۔" یہ کہہ کر اس نے سلام کیا دروازہ بند کیا اور برابر کے کیبن کی طرف چلا گیا۔

عورت کے چہرے پر کچھ حیرانی تھی، کچھ پریشانی مگر ٹی ٹی کے جانے کے بعد وہ پُرسکون ہوگئی تھی۔ اس نے پلویں بندھے ہوئے ٹکٹوں کو ایک بار

اور کھولا دیکھا اور اس کے بعد پھر باندھ لیا۔

بیگم صاحب کو بھی اب اس سے ہمدردی ہو چلی تھی۔

"تم کہاں جاؤ گی دلی ہیں ؟"

"اجی وہیں کہیں میرا مرد رہو ہے ہے۔"

"تمھارا میاں لینے آوے گا اسٹیشن پر ؟"

"ہاں جی، لکھا تو تھا اس نے کہ آوے گا۔"

بیگم نے جج صاحب کی طرف دیکھا۔ وہ اونگھ گئے تھے۔ گاڑی پہنچنے میں ابھی خاصی دیر تھی۔ انھوں نے جھٹکے سے اپنی سیٹ سے تکیہ اٹھایا اور اس کا سہارا لے کر نیم دراز ہو گئیں۔ ذرا دیر میں ان کی بھی آنکھ لگ گئی۔

شور سے گھبرا کر بیگم اٹھیں۔ ٹرین دلی کے اسٹیشن پر رک چکی تھی۔ اردلی بستر سمیٹ رہا تھا۔ جج صاحب نے اچکن پہن لی تھی۔ عورت اور بچے جا چکے تھے۔

"دیکھو جمن خاں ـــــ سب سامان تو ٹھیک ہے نا؟ کچھ لے تو نہیں گئی؟"

جمن خاں نے اپنا پگڑ بندھا سر دانش مندانہ انداز میں ہلایا ـــــ "نہیں صاحب مجال ہے! ہم باہر بیٹھا تھا۔ ٹرین رکتے ہی اس عورت کو اتار دیا۔

جج صاحب نے اطمینان سے سر ہلا دیا۔

جب وہ لوگ پلیٹ فارم پار کر رہے تھے تو انھوں نے دیکھا کہ اسٹیشن کے بھیڑ بھڑکے میں بدحواس پوٹلی سر پر رکھے دونوں بچوں کو پہلو سے لگائے وہ دیہاتی عورت وحشی ہرنی کی طرح چاروں طرف دیکھ رہی ہے۔

جج صاحب آگے بڑھ چکے تھے۔ بیگم نے روکا۔

"ذرا ٹھہریے ...."

"کیا ہے؟" وہ پلٹے۔

"دیکھیے وہ ہماری ہم سفر کھڑی ہے۔ اس کا میاں اسے نہیں ملا۔" اور وہ لپک کر اس کے پاس پہنچ گئیں۔

"تمھارا آدمی نہیں ملا ؟"

"نا بیگم ——" اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

"پھر......"

"اب ہم کیا کریں گی ؟" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"بیگم جلدی چلیے۔" جج صاحب نے پاس آکر ناگواری سے کہا۔

"مگر یہ عورت ؟"

"آپ بھی خوب ہیں۔ اب کیا ہم نے اس کا ٹھیکہ لیا ہے۔ مل جائے گا اس کا آدمی !" بے زاری سے وہ بولے۔

"اور اگر نہ ملا تو ؟" بیگم نے پریشانی سے کہا۔

"تو میں کیا کر سکتا ہوں ؟"

"ہم ذرا انتظار نہ کر لیں۔" بیگم کی پریشانی بڑھ رہی تھی۔ "جوان عورت ہے —— اور یہ دلی شہر۔ شاید اس کا میاں تھرڈ کلاس میں ڈھونڈ رہا ہوگا۔"

"آپ جانتی ہیں اس وقت گھر پر کئی آدمی میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ اس سے کہیے کہ یہیں کھڑی رہے۔ اس کا شوہر مل جائے گا۔" اور وہ آگے بڑھ گئے۔

بیگم نے دو قدم بڑھائے۔ ٹھٹکیں —— رکیں چپراسی ادب سے پیچھے آرہا تھا۔ اس سے بولیں۔ "جمن خاں —— تم اس عورت کے پاس رکے رہو۔ اگر اس کا میاں مل جائے تو ٹھیک ہے۔ ورنہ....."

"ورنہ کیا ہوگا۔ میم صاحب ؟" جمن خاں سوالیہ نشان بن گئے۔

"ورنہ —— ورنہ —— پھر تم اسے کوٹھی لے آنا۔"

اور وہ تیزی سے آگے بڑھ کر جج صاحب سے جا ملیں۔ اندر ہی اندر وہ بڑبڑا بھی رہی تھیں۔ "ہونہہ بڑے آئے ہمدرد بن کر !"

جُوئی کی بیل

زندگی کبھی روپوں میں مسکراتی ہے! کبھی انفرادیت میں جلوہ گر ہو کر اپنے حسن و جمال کا مظاہرہ کرتی ہے۔ کبھی اپنے وجود کو دوسروں میں کھپا کر کثرت میں وحدت کا جلوہ دکھاتی ہے۔ وہ پھول میں مسکراتی، پتی میں نکھرتی، سرو و چنار کی شکلیں اختیار کرتی، پودوں میں ابھرتی۔ جھاڑیوں سے الجھتی، گھاس میں سرسراتی ننھی کومل بیلوں میں اور ان کھلی کلیوں میں مسکرا اٹھتی ہے۔ اس کا ہر روپ کتنا سندر، کتنا دلکش ہے!

وہ بڑی کومل، بے حد نازک، چھوئی موئی کی طرح شرمیلی تھی۔ ایسی بیل جس کی جڑیں الفت کی زمین کی گہرائیوں میں بڑھتی ہیں۔ جس کی شاخیں محبت کے سہارے کی تلاش میں بانہیں پھیلائے رہتی ہیں ــــــ اور یہ سہارا نہ ملے تو وہ گر پڑتی ہیں، مرجھا جاتی ہیں۔

جب اس ننھی سی کونپل نے دھرتی کے سینے سے سر ابھارا تو خوف سے لرز رہی تھی۔ ملائم پتیوں اور رنگین خوشبودار پھولوں سے لدی جھاڑی نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا تو اس کا سارا وجود کھل اٹھا ــــــ اس مضبوط سہارے نے اس میں ایک نئی توانائی پیدا کر دی۔ وہ بڑھنے سیکھنے دنیا کو دیکھنے اور پرکھنے لگی ــــــ مگر اسی کی نظر سے ــ اس کی ہر بات جو ہی

کے لیے ایک حدیث تھی! ہر رائے قطعی، ہر حکم ناطق ۔ اپنے اس محترم شفیق بزرگ سے اسے بے پناہ عقیدت تھی، اس وقت زندگی سکون، تحفظ و امان کا کیسا گہوارہ تھی ..!

وہ کم سن الھڑ دوشیزہ چمن کی بربادیوں اور خزاں کی تباہ کاریوں سے یکسر بے خبر تھی ۔ بگولے کیا ہوتے ہیں، آندھیاں کیوں چلتی ہیں ۔ سیلاب کیوں آتے ہیں، بیماریاں تناور سے تناور درخت کو کھوکھلا کر کے کس طرح جڑ سے اکھاڑ کر زمین بوس کر دیتی ہیں ؟ —— یہ سب وہ کچھ بھی نہ جانتی تھی ۔

پھر ایک دن اس کا مضبوط سہارا ٹوٹ گیا ۔ تناور ثمردار آم کے پیڑ کو نہ جانے کیا بیماری لگی کہ اسے اندر ہی اندر گھن کی طرح کھا گئی ! وہ بے سہارا رہ گئی ۔ اس اچانک حادثہ زندگی کے اس پہلے غم نے اسے جیسے توڑ دیا ۔ وہ نیم بے ہوش، بے حال زمین پر پڑی تڑپ رہی تھی ۔

ممتا نے اپنی باہیں پھیلائیں —— مگر —— مگر یہ آغوش اب اس کے لیے بہت تنگ تھی —— وہاں تو اور کئی پھول کلیاں سہمے ہوئے اس کے دامن سے چمٹے تھے ۔

دن جیسے تیسے بیتنے لگے ! بے معنی، بے رنگ، اداس دن ! چمن کا ہر پیڑ ہر پودا، ہر جھاڑی، پیروں تلے کی گھاس تک اس کے غم میں شریک تھی ۔ اسے سہارا دینے، اس کی مدد کرنا چاہتی تھی ۔ خوش رنگ پھلوں سے لدے سیب نے شفقت سے سر پر ہاتھ رکھا ۔ چمپا کے پودے نے دل سوزی سے سمجھایا گلاب نے دوستی کا ہاتھ بڑھایا —— مگر وہ —— اسی طرح اداس اور نڈھال تھی ۔ کبھی کبھی وہ کسی پودے کا ہاتھ تھام کر کارزار حیات میں کودنے کا عزم کرتی —— مگر ہمت جواب دے دیتی ۔ ان میں کوئی سہارا بھی ویسا مضبوط نہ تھا —— اسے تو ایسے ہی تناور، شاندار سہارے کی تلاش کر رہی تھی ۔ جیسا بچپن میں اسے ملا تھا ۔

اوہ!۔ کون جانتا تھا کہ یہ تمنائیں بر آئے گی!

وہ سروِ رواں جب اس کی زندگی میں آیا تو اس کا سارا وجود کھل اٹھا۔ تنا حسین اتنا بلند و بالا، اتنا مضبوط سہارا ـــــ اس کے آم سے اتنا مشابہ! آہ!! اس نے سوچا بھی نہ تھا کہ وہ اتنی خوش قسمت ہوگی! اب زندگی سرتا سر چمن تھی، بہار تھی، رنگ و نکھار تھی، حسن تھی، محبت تھی، بھروسہ تھی۔ اس کا روپ نکھر اٹھا۔ شاداب، ہری بھری پھولوں سے لدی، اس بیل کو دیکھ کر سب حیران رہ جاتے، کیا یہ وہی مرجھائی سی زرد، ننھی سی جوہی ہے؟؟۔

خود اعتمادی، حوصلہ، غرور، اس کے انگ انگ سے پھوٹتا تھا۔ اب وہ پہاڑوں سے ٹکر لے سکتی ہے۔ کٹھن سے کٹھن منزلیں طے کر سکتی ہے، اس کا دامن پودوں اور کلیوں سے بھرتا رہا ـــــ اس کے اندر سے تخلیق کے سوتے پھوٹتے رہے.... محبت کے چشمے ابلتے رہے!

اپنے محبوب سرو کے پہلو میں وہ زندگی کے ایسے حسین، ایسے مسرور اور ایسے محفوظ دن گزار رہی تھی۔ جو بہت کم ـــــ بہت ہی کم خوش نصیبوں کا مقدر ہوتے ہیں۔ زمانہ پر لگا کر اڑتا رہا۔ یہ مسرت کے دن کتنی جلدی گزر جاتے ہیں خدایا!!

وہ اور سرو، بزم حیات میں بھرپور حصہ ادا کر رہے تھے۔

اسے کیا حاصل نہیں! سر پر بھرپور سایہ تھا۔ اس محبوب اور چاہنے والی ہستی کا گھنا، خنک سایہ، جس نے اسے جینا سکھایا تھا ـــــ زندگی سے پیار کرنا سکھایا تھا ـــــ اپنی بھی اور دوسروں کی بھی!

سارے چمن میں ان دونوں کی محبت کی مثال دی جاتی۔ ان کی قسمت پر رشک کیا جاتا تھا۔

مگر آہ! کتنی ناپائدار ہوتی ہیں یہ خوشیاں!! جنت کی جھلک دکھا کر اسے ہمیشہ کے لیے نرک میں جھونک دیا گیا۔ اس کا محبوب یوں اچانک اسے چھوڑ گیا

جیسے کبھی اس کا وجود ہی نہ تھا!

قدرت اتنی بے درد ہو سکتی ہے!! زندگی کی ہر مسرت یوں خاک میں مل سکتی ہے!

کیا زندگی اتنی ظالم ہے۔؟

ایک بگولہ آیا اور اس کے سرو کو دم بھر میں اس سے چھین لے گیا۔ ہائے! کیسے اس کا یہ حسین، شاندار تناور سرو جڑ سے اکھڑ کر خاک میں مل کر خاک ہو گیا؟ یہ بھی نہ سوچا کہ اس کی محبوب نازک جوہی یہ جدائی کیسے جھیلے گی؟ یہ بھی مڑ کر نہ دیکھا کہ اس کے بعد جوہی پر کیا بیت رہی ہے؟

کیا موت وحیات کا رشتہ اتنا ناپائیدار ہوتا ہے؟

اتنا بے ثبات؟ پل بھر میں محبت کے مضبوط سے مضبوط بندھن یوں توڑ کر پھینک دیے جاتے ہیں جیسے مکڑی کا جالا! دنیا آنکھوں میں اندھیری تھی۔ وہ کیوں زندہ رہے؟ کس لیے؟ کس کے سہارے؟ وہ اس بے حقیقت زندگی کے لیے؟ کیوں جدوجہد کرے؟

نہیں نہیں۔ وہ بھی اپنے محبوب کے پاس جائے گی —— وہ زندہ رہنا نہیں چاہتی! اس کی پتیاں زرد ہو گئیں۔ جڑیں کمزور ہونے لگیں۔ سارا چمن غم میں ڈوب گیا۔ ہر ایک اس کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ مگر کیسے؟ بوڑھے برگد نے پیار سے سر پر ہاتھ پھیرا۔ گل مہر نے اپنا شانہ پیش کیا۔ چمپا کے سندر و شاداب پودے نے پیار سے دامن تھاما۔ چنبیلی نے دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ مگر جوہی کو کسی سے ڈھارس نہ ملی۔ ان میں سے کوئی سہارا بھی ویسا مضبوط نہ تھا۔ بوڑھے برگد کے دامن میں جانے کتنے پیڑ پودے، بیلیں اور جھاڑیاں پل رہی تھیں۔ گل مہر کے تنے کے گرد چھوئی موئی کا نازک پودا بانہیں ڈالے تھا۔ چمپا کا پیڑ بہت نازک اور نوعمر تھا۔ اور چنبیلی تو خود ہی زرد اور بیمار۔ آہ! کہاں ہے اس کا سرو رواں؟ اس کا بدل کون ہو سکتا ہے؟ —— وہ اس کا تھا —— صرف اس کا!

اس کے دامن کے پودے سہمے سہمے اس کی حالت دیکھنے! کیا وہ سرو کے

سائے سے محروم ہونے کے بعد، ممتا کی گود سے بھی بچھڑ جائیں گے ؟

دن بیتنے لگے! پھر جانے کہاں سے اس میں زندگی کی لہر دوڑی۔ جیسے کہیں سے جینے کا سہارا مل رہا ہو۔ جیسے کوئی درسِ حیات دے رہا ہو کہ ؂

"زندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا"

یہ کون ہے ؟ کون ہے یہ جو اسے سنبھال رہا ہے۔ اس کا بوجھ اپنے شانوں پر اٹھا رہا ہے۔ کون ہو تم ؟ کون ہو تم ؟

اس نے سروؔ کی یادگاروں کو سینے سے لگایا اور ان کو ہر آفت، ہر مصیبت سے بچانے کے لیے سینہ سپر ہوگئی! ان کی پرورش اور حفاظت کے مقدس فرض کی ادائیگی میں ان کی جان بھی چلی جائے تو کیا پروا ہے۔ اسے انھیں زندہ رکھنا ہے۔ اپنے خونِ جگر سے ان کی جڑوں کو سینچنا ہے۔ ان کو جینے کا گر سکھانا ہے۔ اچھی زندگی بسر کرنے، دنیا میں کچھ کرنے کچھ بننے کا درس دینا ہے۔

کبھی کبھی وہ تھک جاتی —— بیمار سی، مرجھائی سی ڈالیاں جھک جاتیں، پتے جھڑنے لگتے —— مگر جب ان ننھے منوں کو دیکھتی تو ایک نئی طاقت ابھر آتی۔ اور جب اس کا ہار سنگھار مسکرا کر اسے دیکھتا۔ سہارا دے کر کھڑا کرتا تو وہ مسکرا پڑتی۔ اس سے لپٹ کر پھر زندگی کی کٹھنائیوں کو جھیلنے کی شکتی پیدا ہو جاتی۔

اس کا دبلا، پتلا، نازک سا ہار سنگھار تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ اس کی آغوش میں سر چھپا کر سروؔ کی یاد میں آنسو بہا کر اسے بڑی تسکین ہوتی۔ اس کی صحبت میں دلی خوشی ملتی۔ کتنا مشابہ ہے وہ اس کے سروؔ سے! وہی من موہن ہنسی، وہی خود اعتمادی، دلداری کا وہی انداز، ویسا ہی وقار اور سنجیدگی، اور خاموش محبت میں ساگر کی سی گہرائی!

دیکھتے دیکھتے وہ بلند و بالا جوان رعنا بن گیا۔ اس کی مسکراہٹ گمبھیر اور انداز شانت تھا۔ اس میں انگی کو ملتا۔ انگی سندرتا، اتنا رس۔ ایسی کشش تھی کہ ہر کوئی اسے پسند کرتا۔ اس کی تعریف کرتا۔

اور اسے پتا بھی نہ چلا کہ کب سے وہ ہار سنگھار کے سہارے کارزارِ حیات میں اپنا حصہ ادا کر رہی ہے۔ اکٹھنائیوں کو جھیلنے، دھوپ کی شدت، طوفان سے مقابلہ کرنے کی ہمت، اس کے بل بوتے پر اس میں پیدا ہوئی ہے یہ وہ نہ جانتی تھی۔

اور یوں گرنے اور اٹھنے، ہارنے اور فتح پانے، رونے اور ہنستے زندگی کے دن بیتتے رہے۔

اس کے سب ننھے منے جوان ہو گئے! چھوٹی چھوٹی بیلیں ثمردار، مضبوط گھنی جھاڑیوں میں بدل گئیں۔ نازک پودے شاندار پیڑ بن گئے۔ وہ انھیں دیکھ کر فخر و مسرت سے پھولی نہ سماتی تھی۔ ان کی تعریفیں کرتے نہ تھکتی تھی۔ یہ حسین بیلیں۔ یہ شاندار درخت اسی کے ڈالی کے پھل تو ہیں، اسی کا خون تو ان کی رگوں میں دوڑ رہا ہے۔ اسی کی بیلوا اور ممتا کا تو قدرت نے اسے یہ انعام دیا ہے ۔۔۔ یہ تو سر بدلے کا سر کا ہیں۔ اس کے سرو کی یادگاریں! خدایا۔ تیرا کتنا احسان ہے۔ ایسا خوش قسمت کون اور کہاں ہو گا! اور اس کا سر اپنے خالق کے سامنے جھک جاتا!

اور ہار سنگھار ۔۔۔ اس کا جواں سال، جواں بخت بیٹا ۔۔۔ وہ اس کی جان تھا ۔۔۔ اس کی روح! وہ اس کی ہر ہر ادا پہ نثار تھی۔ وہ مسکرا کر اسے دیکھتا تو اس کا رواں رواں مسرت سے کھل اٹھتا۔ سہارے کے لیے اپنا بازو پیش کرتا تو اس میں نئی توانائی پیدا ہو جاتی۔ محبت سے اس کے گلے میں باہیں ڈالتا تو روح و جاں میں آ جاتی!

اور وہی کیا اس کی تعریف تو اپنے پرائے سبھی کرتے تھے اور پھر اس کے یہ مختلف نوع کے بھائی بہن جن میں سے ہر ایک کی صورت الگ تھی، مزاج الگ تھا، مذاق الگ تھا، پھر بھی کوئی چیز مشترک تھی کہ سب ایک دوسرے کو چاہتے تھے۔ اور سب سے زیادہ ہار سنگھار سے محبت کرتے تھے۔ وہ تھا بھی توان کا بھائی۔ دوست، مشیر، ہمدرد، رفیق، اور استاد۔ باپ کی سی شفقت اور ماں کا سا پیار وہ انھیں دیتا تھا۔ ہر ایک جوہی کی قسمت پر رشک کرتا۔ ایسا

بیٹا کسی نصیبوں والی ہی کو ملتا ہے۔ رسیلی ہنسی جس سے ننھے ننھے خوشبودار پھولوں کی برکھا ہوتی ہے۔ نرم نرم سایہ جو ہر کسی کو راحت دیتا ہے۔ اس کی ڈالیوں میں سرسراتے، نسیم کے ہلکے ہلکے جھونکے! اس کا استقلال اور حوصلہ، ہمت اور مضبوط قوتِ ارادی —— اور اس کے باوجود محبت کی نرمی اور گرمی! کون تھا جو اس کی صفات کا مداح خواں نہ ہوتا! پھر جوہی کا تذکرہ ہی کیا ہے۔

ہار سنگھار کی شہرت اور ہر دلعزیزی اسے لگتا خود اس کی ہی ہے۔ کتنا بڑا کرم ہے خالق کا کہ اس نے معنوی بچوں کا یہ انمول خزانہ اسے بخشا۔ یوں تو سارے بچے ہی اسے چاہتے تھے۔ مگر ہار سنگھار کی الفت سے کسی اور کی محبت کو کیا نسبت تھی بھلا؟ اوروں کی محبت میں وہ گہرائی، وہ خلوص، وہ اپنے کو مٹا کر اس کی خدمت کی سعادت حاصل کرنے کا مقدس جذبہ، اس کو سکون، خوشی دینے کی بے پناہ جاہ وچاہ کہاں تھی؟ ان کی محبت اور خیال ہوا کا جھونکا تھا —— آیا، آیا نہ آیا، نہ آیا۔ ان کی اپنی زندگی تھی۔ اپنی دلچسپیاں، عیش و آرام کی تمنا اور جاہ وچاہ، دولت، اقتدار، نام و نمود، شہرت کی طلب تھی۔ وہ ایک مرجھائی، بوڑھی، چڑچڑی بیل کی خدمت پر اپنا مستقبل تو نچھاور نہیں کر سکتے! اپنا قیمتی وقت اس کی غیر دلچسپ باتوں میں ضائع نہیں کر سکتے! وہ ذرا دیر میں اکتا جاتے، الجھ پڑتے! اور وہ دکھ اور غم سے نڈھال ہو جاتی —— کیا یہ سب مصیبتیں اس نے اسی لیے جھیلی تھیں؟ یہ زندگی ان پر اسی لیے نچھاور کی تھی کہ بڑھاپے میں یہ دل شکن باتیں سننے کو ملیں؟

مگر ہار سنگھار، ہر رکھائی، ہر بے اعتنائی، ہر دل آزاری کی تلافی کر دیتا! اس کی دلداری کے لیے اس کے پاس وقت کبھی کم نہ پڑتا تھا۔ اپنی بوڑھی بیمار جوہی کی اسے ہر حالت میں فکر رہتی تھی۔ کوئی مصروفیت، کوئی دلچسپی، کوئی کام، کوئی ہستی اسے جوہی کی محبت سے غافل اور خدمت سے بے نیاز نہ کر سکتی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی جڑیں اِسی بوڑھی بیل کے خونِ جگر سے مضبوط ہوئی ہیں۔ اس کے پھول

اسی سے شاداب اور رنگین ہیں ـــــــ " یہ سر سبز پتے۔ یہ مضبوط تنا۔ اس کی دِل سوزی اور مامتا کا رہین منت ہے! اس کی محبت وہ اپنی نس نس میں دوڑتی محسوس کرتا تھا ـــــــ وہ جو کچھ ہے اس کی دین ہے! احسان ناشناس اور خودغرضی کے الفاظ اس کی لغت میں موجود نہیں تھے۔

مگر کنبہ بچھڑ گیا۔

سرخ گلاب اور موتیا، کسی اور باغ کی زینت بن گئے۔ دار چینی کا پیڑ اور اونچا ـــــــ اور اونچا ہوتا گیا ـــــــ دوسروں کی ہستی سے نالاں و بیزار، اپنی بلندی پر نازاں اور مغرور! کبھی کبھی وہ اسے پکڑنا چاہتی۔ اس کا سہارا لینا چاہتی ـــــــ اسے آواز دیتی ـــــــ تو وہ غصے سے کانپ جاتا ـــــــ اور سخت، خشک، نوکیلی پتیوں کی بارش اس کے بوڑھے جسم کو دُہرا اور کمزور دل کو مجروح کر دیتی! پیاروں کی رکھائی یا بے نیازی اور اپنی ہتک پر جوہی کا دل بھر آتا ـــــــ مگر شکایت سے اس کے لب آشنا نہ ہوتے۔ اسے ان سب سے اتنی گہری محبت تھی کہ وہ ان کی کسی بات، کسی حرکت کا گلہ نہ کر سکتی تھی۔ ان کی ہر غلطی کا کوئی نہ کوئی جواز تلاش کر لیتی تھی۔ وہ اپنی فطرت سے مجبور تھی کہ ان کی آنکھ سے دیکھے، ان کے کان سے سنے! دل پر البتہ کسی کا بس نہ تھا۔

مگر جب ہار سنگھار اس کی دل گرفتی محسوس کرتا تو اس کی طرح طرح سے دل جوئی کرتا، دوسروں کی طرف سے صفائی دیتا ـــــــ اس کو ان سب کی محبت کا یقین دلاتا ـــــــ

اور پھر اسے یہ احساس دلاتا کہ میں تو تمھارا ہوں! تم میری ہو ـــــــ میں تمھارا ہوں! اور کسی کا نہیں، صرف تمھارا ـــــــ میری، تمھاری محبت امر ہے ـــــــ " اور اس کا غنچۂ دل کھل جاتا۔ ہر دکھ درد غائب ہو جاتا۔

جانے کتنے موسم بیت گئے۔

بوڑھی جوہی اپنے ہار سنگھار سے لپٹی زندگی سے چمٹی رہی۔ بس

اب اس کی صرف ایک تمنا تھی! وہ اپنے ان سب پیاروں کو زندہ و شاداب چھوڑ کر اس دنیا سے جائے!

آہ ــــ!

دنیا میں کتنی آرزوئیں ہیں جو بر آتی ہیں؟؟

اور پھر..... ایک دن! ایک خوفناک دھماکہ ہوا۔ ہولناک سائیکلون سمندر نے اپنا سارا غیظ و غضب دھرتی پر اگل دیا۔

بجلیاں کڑکیں.....

بادل گرجے.....

دھرتی پر سیاہی چھا گئی.....

ہولناک چیخیں، خوفناک آہیں..... گھور اندھیرا!

انتہائی دہشت نے جوہی کے ہوش حواس چھین لیے ــــ سوچنے سمجھنے کی سکت نہ رہی ــــ بے حس، بے خبر، وہ دھرتی پر پڑی تھی۔ ہاں ذہن کے کسی کونے میں ایک احساس اب بھی باقی تھا۔

ہارسنگھار ابھی آئے گا۔ اسے سہارا دے گا ــــ اور پھر اس سے لپٹ کر ــــ یہ خوف، یہ دہشت غائب ہو جائے گی، اس کے سہارے تو وہ ہر طوفان کا مقابلہ کر سکتی ہے۔

طوفان تھما! بادل چھٹے ــــ سیاہی دور ہوئی۔

اس نے بہ مشکل اپنا بھاری سر اٹھایا ــــ دھندلی نظریں چاروں طرف دوڑائیں، کمزور ہاتھ بڑھایا..... "میری جان ــــ کہاں ہو تم۔؟"

مگر آہ! ــــ یہ کیا ــــ؟

کیا وہ اندھی ہو گئی ہے۔؟

حواس کھو چکی ہے۔؟

اس کا پیارا سنگھار ـــــ اس کا خوبصورت، شاندار، تناور ہار سنگھار...

اس کا پیارا ـــــ اس کا عاشق، اس کا سہارا...

اس کی زندگی ـــــ اس کی روح!

کہاں ہے ـــــ؟ "کہاں ہے میرا ہار سنگھار؟ کدھر گیا میرا لاڈلا؟

کہاں ہو میری جان ـــــ؟

"کدھر ہو ـــــ بولو ـــــ بولو میرے پیارے، کہاں ہو تم؟"

مگر وہ تھا کہاں، جو جواب دیتا!

اسے صرف اپنی آواز کی گونج سنائی دیتی۔ "کہاں ہو ـــــ کہاں ہو تم۔ جواب دو ـــــ"

وہ کہاں تھا جو اسے سہارا دیتا ـــــ مسکرا کر ننھے ننھے پھولوں کی برکھا کرتا؟

وہ فردوسِ گوش آواز سنائی نہ دی......

وہ جنتِ نگاہ نظر نہ آیا.......

اسے کون چھین لے گیا.......

کس نے ان دونوں کو جدا کر دیا۔

وہ جو اس کی زندگی تھا ـــــ روح تھا ـــــ جان تھا!

وہ جو طاقت کا سرچشمہ ـــــ مسرت کا منبع تھا!

کہاں ہے وہ؟

وہ سر کو پٹختی رہی ـــــ ہاتھوں کو پھیلاتی رہی، زمین و آسمان کی پہنائیوں میں اسے ڈھونڈتی رہی!

ناکام نظریں تھک کر جھک جاتیں......

بے کار جستجو دم توڑ دیتی...

خالی ہاتھ بے جان سے گر پڑتے.......

اور آخر کار ——— حقیقتِ جاں کاہ، روح فرسا حقیقت اس پر کھل گئی!

یہ طوفان، یہ سیلاب اس کے ہار سنگھار کو لے جانے لیے آیا تھا!

وہ چپ چاپ، اس سے رخصت ہوئے بغیر، ہمیشہ کے لیے اسے چھوڑ کر

کسی انجانی دنیا کی طرف چلا گیا......

کہاں؟ کس کے ساتھ؟ کیوں؟ آخر کیوں؟ وہ روٹھ گیا......

اس کے کسی سوال کا جواب نہ دے سکی۔

اور خدا ہی جانے ——— وہ اب کیسے زندہ تھی؟

بغیر کسی طاقتور سہارے کے زندہ تھی......

لرزتی، کانپتی، ڈولتی ہوئی!

زندگی ——— ظالم زندگی، کیوں اب اس سے چمٹی ہے؟؟

اس کا وجود دردِ فرقت سے گھلتا رہا......

دلِ فراق کی آگ میں جلتا رہا......

روح، پیا کہاں، پیا کہاں پکارتی رہی......

بے نور نگاہیں فضا میں کسی کی جستجو کرتی رہیں......

کمزور باہیں پھیلی رہیں......

کوئی اسے دھوکے دیتا رہا...... اب وہ آئے گا ——— اسے

سہارا دے گا......

پیار سے اس کے گرد اپنی شاخوں کی باہوں کا گھیرا ڈال دے گا...

شیریں آواز کانوں میں سرسرائے گی...... "میری تمھاری محبت امر ہے

...... امٹ ہے"...... اور وہ دونوں ایک دوسرے کی آغوش میں سما جائیں گے۔

مگر...... نظریں بھٹکتی رہیں......

بانہیں پھیلی رہیں......

کان منتظر سنتے رہے......

دل تڑپتا رہا.....

روح بھٹکتی رہی......

کتنا سمے بیت گیا؟

چند لمحے، کہ صدیاں؟

اسے لگتا تھا قرن گزر گئے۔ وہ اپنے ہارسنگھار سے نہیں ملی!

جُگ بیت گئے — وہ فضا میں بے سہارا، بے آسرا، بے کس، مجبور...

...معذور معلق ہے.....

خدایا....

خدایا.....کب تک وہ زندگی کی صلیب پر یونہی لٹکتی رہے گی؟

کب تک؟؟

آخر اسے ایک دن نیند آگئی.....میٹھی! گہری، پُرسکون نیند!

مدتوں بعد آج اس کے وجود پر سکون اور شانتی کے سائے لہرا رہے تھے۔

اچانک وہ جاگ پڑی!!

زندگی، طاقت اور حسن سے بھرپور! — کتنا خوبصورت ہے یہ چمن؟

کتنے سندر پھول ہیں یہ!! — کیسے حسین پودے ہیں.....؟

اور کتنے شاندار پیڑ..... آہ! یہ کون ہے — کون ہے یہ؟

اس کا پیارا ہارسنگھار باہیں پھیلائے کھڑا تھا........

اس کے پیچھے اس کا محبوب سرو — مشفق آم — اس کا حسین چمپا کا پیڑ۔

سب مسکرا مسکرا کر اس کا خیر مقدم کر رہے تھے۔ صدیوں کی شبِ فراق بیت

گئی۔ شبِ ہجر کی سحر ہو گئی۔ قطرہ دریا میں جذب ہو کر — سب کچھ پا گیا —

سب کچھ!!

تفریح

شام کا وقت تھا۔ بے وقت کی بارش نے موسم بہت خوشگوار کر دیا تھا۔ آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے تھے جن کے بیچ بیچ میں نیلا آسمان اور گہرا الگ رہا تھا۔ سورج کی گول سنہری تھالی دھیرے دھیرے مغرب کے افق کی طرف سرک رہی تھی۔ اس کے ارد گرد کے بادل قوسِ قزح کے ساتوں رنگوں میں رنگے عجیب بہار دکھا رہے تھے۔ پکے کھیتوں کی سنہری بالیاں ہوا میں ہلکورے لے رہی تھیں۔ اور گھاس کا دھانی رنگ کچھ اور نکھر آیا تھا۔ کہیں کہیں کھڑے پانی کے جوہڑ کے اندر کنول اور بَیّ کے ننھے منے پھول مسکرا رہے تھے۔ کچے رستے کی اور کھیتوں کے مینڈوں کی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو فضا میں بکھری ہوئی تھی اور آسمان کی بلندیوں میں طائر محوِ پرواز تھے۔

وہ دوڑتی موٹر کی کھڑکی سے چپکا۔ یہ سب محو ہو کر دیکھ رہا تھا۔ اس کے اندر کا فن کار اس منظر سے اتنا مسحور ہو چکا تھا کہ ذرا دیر کے لیے وہ سب کچھ بھول گیا تھا۔

وطن میں بیمار پڑا چھوٹا بھائی جو اب خطرے سے باہر ضرور تھا، مگر اس کی حالت قابلِ اطمینان اب بھی نہ تھی، اور جس کو چھوڑتے وقت اسے

بہت دکھ ہوا تھا۔ بچے کے اسکول کی تین ماہ کی فیس جو اسی ہفتے داخل کرنی تھی اور جس کی فکر اسے کھائے جا رہی تھی، یاد نہ تھی۔ دس سالہ ببلو اس پبلک اسکول میں داخل ہو کر کتنا خوش ہوا تھا۔ خود اسے کس قدر طمانیت کا احساس ہوا تھا کہ اس کا بچہ ایک عمدہ اسکول میں تعلیم پائے گا تو اس کی ذہنی اور دماغی صلاحیتیں ابھر کر سامنے آئیں گی۔ اپنے باپ کی طرح نہیں، جس نے قصبے کے چھوٹے سے اسکول میں پڑھا تھا۔ جس میں نہ انگلش کافی تھی اور نہ اسٹینڈرڈ اونچا تھا۔ اور کالج بھی تو ایسا ملا تھا جس کا ذریعہ تعلیم مادری زبان تھی۔ آج اس کی انگریزی اچھی ہوتی۔ کہیں باہر کی ڈگری اس کے پاس ہوتی تو ملک اور قوم اس کو جانتے۔ اس کی ناز کرتے۔ اس کا مقام دیا جاتا۔ اب وہ کیا ہے، دیسی زبان کا ایک معمولی ادیب جس کے من پاروں کو اکثر لوگ نظر اٹھا کر دیکھتے بھی نہیں۔ ہنہ۔ یہ مادری زبان اکیا رکھا ہے بھلا اس میں اس کے منہ پر بعض لوگ کہہ دیتے۔ "کاش تم انگلش میں لکھتے۔" یا "تمہاری چیزوں کا ترجمہ ہی انگلش میں ہوتا" مادری زبان اور غریب رشتے دار۔ ہیں نا دونوں ایک ہی ناؤ کے سوار! جانے یہ اپنے احساسِ کمتری کو تسکین دینے کے لیے اس نے ببلو کو اس مہنگے اسکول میں داخل کیا تھا یا بچے کا مستقبل بنانے کے لیے؟ مستقبل! ابھی سے فیس، کتابوں، یونی فارم اور روز روز کے نت نئے مطالبوں نے اس کی کمر توڑ دی تھی بیوی کا زیور اور خود اس کی کتابیں بکنے کی نوبت آگئی تھی۔ چار چھ سال وہاں اور پڑھایا تو کیا ہوگا؟ مگر امید اسے ڈھارس دیتی۔ تمہاری کتابوں کی رائلٹی، تمہارے مضامین کا معاوضہ کسی کتاب پر انعام —— کیا ہوا —— دنیا میں معجزے بھی ہوتے ہیں۔ اور وہ ان کھلونوں سے کب سے خود کو اور اپنی بیوی کو بہلا رہا تھا۔

کھیتوں کی مینڈوں پر مور پیہو پیہو کر رہے تھے ایک جگہ تو مستی میں اس انداز سے ناچ رہا تھا کہ سوا ایک نقشین رنگین پنکھے کے اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ تیتروں کی چہکار سے سبحان تیری قدرت کی بار بار آواز بلند ہو رہی تھی۔ کچھ مویشی

شانِ بے نیازی سے چراگاہوں سے واپس آ رہے تھے۔ اور ان کے گلے میں پڑی گھنٹیوں سے ہلکی ہلکی دردناک موسیقی نکل رہی تھی۔ وہ جب کبھی مناظرِ قدرت سے قریب ہوتا، اپنا دکھ، غم، فکریں بھول جاتا اپنے ہی کو بھول جاتا ـــــــــ اور ایک عجیب سی روحانی مسرت میں کھو جاتا۔

"روکو ـــــ روکو ـــــ جلدی روکو ـــــ" ایک جھٹکے سے موٹر رکی اور وہ لڑھک کر سیٹھ صاحب کی گود میں جا گرا۔ گھبرا کر وہ سنبھلا اور ڈر کر ان کو دیکھنے لگا۔ وہ مسکرا رہے تھے۔ اس کی جان میں جان آئی۔

وہ ان کے ہاں کلرک تھا۔ آٹھ نو گھنٹے جان توڑ محنت کے بعد کبھی کبھی اسے ان کو شعر بھی سنانے پڑتے تھے۔ کیا گزر جاتی ہے بدذوق لوگوں کو شعر سناتے وقت۔ یہ اس کا جی ہی جانتا تھا۔ مگر روٹی بھی تو پیاری تھی نا۔

کل وہ کسی دوست کے ہاں شادی میں جا رہے تھے تو اسے بھی از راہِ عنایت ساتھ لے آئے تھے۔ ان کی یہ مہربانی کیسے بھولے گا کہ اس کی خاطر وہ اس کے قصبے کے قریب ڈاک بنگلے میں پورے ایک گھنٹہ ٹھہرے تھے تاکہ وہ اپنے بیمار بھائی سے مل آئے۔

اور اب وہ لوگ واپس جا رہے تھے۔ موٹر میں آگے سیٹھ صاحب کے دونوں بیٹے بیٹھے گپ کر رہے تھے۔ ان کے پاس دو بھری ہوئی بندوقیں رکھی تھیں۔ کیا معلوم رستے میں کوئی شکار مل جائے مگر آتے وقت یہ امید پوری نہ ہوئی تھی اور وہ راستے بھر پریشان رہا تھا۔ اگر دھچکے سے بندوق چل گئی تو؟ ایک بار ڈرتے ڈرتے پوچھا بھی "سیٹھ صاحب کیا بندوق بھری ہے۔" یہ سن کر سیٹھ صاحب مسکرائے اور لڑکوں نے خوب قہقہے لگائے تھے۔

"بڑی جان پیاری ہے تمہیں؟" اور وہ یہ بھی نہ کہہ سکا تھا کہ اگر وہ زخمی ہو گیا تو علاج کے لیے پیسہ نہ ہوگا اور مر گیا تو جوان بیوی اور دو ننھے بچے دنیا میں بے سہارا رہ جائیں گے۔

تیزی سے موٹر کا پٹ کھول کر دونوں صاحب زادے بندوقیں تانے دوڑتے ہوئے سامنے کے کھیت میں گھس گئے۔ ٹھائیں۔ ٹھائیں کی دو آوازیں فضا میں گونجیں۔ بہت سے پرندے ڈر کر فضا کی بلندیوں میں تیزی سے اڑتے نظر آئے۔ اور کوئی چیز تیر کی طرح گر کر سڑک کے کنارے ایک نالے کے پاس آ گری۔ لڑکے ادھر دوڑے، ڈرائیور دوسری طرف بھاگا اور چند منٹ بعد ہانپتے شکاری جن کے چہرے جوش اور مسرت سے سرخ ہو رہے تھے، ہاتھ میں کچھ لٹکائے موٹر کی طرف چلے آ رہے تھے۔

"تیتر ..... ڈیڈی ..... دو تیتر ..... دیکھیے کیسے شاندار کیسے تگڑے ہیں۔"

وہ سامنے کھڑے ان تیتروں کو نچا رہے تھے جو پل بھر پہلے زندگی اور مسرت سے بھرپور سبحان تیری قدرت کا راگ الاپ رہے تھے۔

اس کے پورے جسم میں سنسنی سی ہونے لگی اور ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ آنکھیں بند ہو گئیں اور بے ارادے اس نے اپنا منہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا تھا۔

اف یہ انسان! آہ یہ اس کی تفریح!

کبھی بے زبان، بے ضرر جانوروں کو شکار کر کے زندگی کی مسرتوں سے محروم کرتا ہے۔ تفریح کے نام پر۔

کبھی اپنے ہی بھائیوں کا ..... انسانوں کا خون بہاتا ہے ..... عدل ..... انصاف ..... آزادی اور حق کا نام دے کر!

موٹر نشین اس کی بزدلی پر ہنس رہے تھے۔ اور وہ خاموش بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ موٹر پھر دوڑ رہی تھی اشرف المخلوق کی بے دردی اور ہوس ننگی ہو کر اس کے سامنے ناچ رہی تھی۔

"روکو۔ روکو۔" گاڑی پھر جھٹکے سے رکی۔ پھر شکاری موٹر سے اتر کر بھاگے، پھر شرارے چمکے، آوازیں فضا میں گونجیں اور زندگی سے بھرپور کئی جانیں

پھر بندوق کی بھینٹ چڑھ گئیں۔

صاحبزادے ایک طرف دوڑے کہ مردہ پرندوں کو اٹھائیں۔ ڈرائیور دوسری طرف بھاگا۔ جدھر اس نے ایک پرندہ کو زخمی ہو کر دوڑتے دیکھا تھا۔

وہ بھی کار سے اتر آیا اور ٹہلتا ہوا اس کھلیان کے پاس جا کھڑا ہوا جہاں کئی دیہاتی کسان کھڑے ان شکاریوں پر اظہارِ رائے کر رہے تھے۔۔۔۔۔۔

اور پھر اس نے دیکھا کہ ایک ننھی سی جان رینگتی ہوئی کھلیان کی طرف آئی اور بھوسے کے ڈھیر کے نیچے چلی گئی۔ ایک ادھیڑ عمر کے کسان نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا اور پھر دو تین پولے اٹھا کر اس کے سامنے رکھ دیے۔ وہ سر اٹھائے ان سہمے ہوئے پرندوں کو دیکھ رہا تھا جو مہذب انسان کے اس محبوب ہتھیار سے ڈر کر چیخیں مارتے بلندیوں کی سمت جا رہے تھے۔

ذرا دیر میں تینوں شکاری بھی یہاں آ پہنچے ان کے ہاتھ میں کئی مردہ پرند لٹک رہے تھے۔ مگر اپنے زخمی شکار کی تلاش میں بدحواس تھے۔ شکاری! جو اس مشقت پر کو کھانے کے لیے نہیں۔۔۔۔ ان کے ہاں کھانے کی کیا کمی تھی۔۔۔۔۔ بس اپنے جذبۂ تفریح کو تسکین دینے کے لیے شکار کر رہے تھے۔

وہ بگڑتے رہے، بڑبڑاتے رہے، دھمکیاں دیتے رہے۔ آخر میں لالچ دلانے لگے۔۔۔ "کہاں ہے ہمارا شکار۔۔۔ یہیں کہیں ہوگا۔۔۔۔ ہم نے اسے ادھر دوڑتے دیکھا ہے۔ تم لوگوں نے ضرور دیکھا ہوگا؟ نہیں دیکھا؟۔۔۔ اچھا ڈھونڈو، ہم پانچ روپے دیں گے۔"

دو ایک آدمی زخمی پرند کو تلاش کرنے لگے۔ پانچ روپے کا لالچ کافی بڑا تھا ان لوگوں کے لیے۔

اور ادھیڑ کسان بظاہر بڑا پر سکون بڑا شانت بیٹھا نیم وا آنکھوں سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مگر اس کے جھریوں بھرے ہاتھ میں جو ایک پولے پر دھرا تھا جو کپکپاہٹ تھی اسے صرف وہی دیکھ سکتا تھا۔ اور کسی کھیت سے

کچھ پرندوں کے چہچہانے کی آواز آئی۔ اور شکاری اس طرف دوڑ گئے۔ تیتروں کے کسی اور حسین جوڑے کی جان لینے کے لیے۔

وہ وہیں کھڑا رہا! "بابا"

" ہاں بھیا "

" تم۔ تم اس کی مرہم پٹی کر دینا۔ "

" کس کی ؟ "

" زخمی تیتر کی بابا۔ " کسان نے حیرانی سے اسے دیکھا۔ تو موٹر نشین شکاریوں میں بھی انسان مل جاتے ہیں!! اس نے پودے کے اندر ہاتھ ڈال کر ایک سہمی مجروح جان کو نکال کر اپنے سینے سے لگا لیا " ہاں بیٹے میں اس کا علاج کروں گا۔ " اس کی آنکھیں بھر آئیں " تم عظیم ہو بابا؟ "

" کیا کہا بھیا۔ " اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

" تم انسان ہو . . . سچ مچ انسان۔ "

" ارے وہاں کیوں کھڑے ہو۔ آؤ نا اب " سیٹھ صاحب کی گرج دار آواز سنائی دی۔ اس نے جھک کر بڈھے کے کھردرے، جھریوں بھرے میلے ہاتھ کو جس میں تیتر پھڑپھڑا رہا تھا، بوسہ دیا اور آہستہ آہستہ موٹر کی طرف چل پڑا۔

درد کا رشتہ

تو یہ رات بھی بیت گئی۔

وقت کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ گزر جاتا ہے۔ فراق کی جان لیوا رات ہو کہ دکھ کی کرب ناک رات۔ جس کا درد وکرب دیکھنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ ہاں خالقِ کائنات جس پر عقیدہ رکھ کر انسان ہر دکھ جھیل لے جاتا ہے۔

تو یہ رات بھی بیت گئی۔

مگر کیسے؟ یہ کاغذ؟ یہ کہانی؟ کہاں سے آگئی یہ کہانی؟ کانٹوں پہ لوٹتے لوٹتے کب اس نے قلم اٹھایا؟ کیا لکھتی رہی؟ اسے کچھ بھی یاد نہ آرہا تھا۔ ہاں دھندلی پنسل سے لپے ہوئے کاغذوں کے ٹکڑے کمرے میں بکھرے پڑے تھے۔

اس نے منتشر اوراق کو اکٹھا کیا۔ مشکل سے انھیں ترتیب دیا اور پڑھنا شروع کیا۔ تم آئیں اور چلی گئیں۔ درد کا پرانا رشتہ —— اور مضبوط کر کے۔ —— مگر تمھارے گلے سے لپٹ کر بھڑکتے شعلوں کو بجھانے کی حسرت دل کی دل میں رہ گئی۔

تم کہ واحد نشانی رہ گئی ہو اس سنہرے ماضی کی، جس کی یاد ہی اب زندگی کا سہارا ہے۔

تم ۔ جس سے مل کر ماں کی ممتا اور بہنوں کا کھویا پیار پھر زرا دیر کو مل

جاتا تھا ــــــ

تم ــــــ کہ درد و غم کو اپنے پیار سے کم کرنے کا گُر جانتی ہو...... تم آتیں تو ہم دونوں مل کر ماضی کو حال بناتے، پیاروں کی یاد پھر تازہ کرتے جن کی یاد کے گھاؤ ناسور بنتے جا رہے ہیں!

تم کہ... جن سے میرا کوئی رشتہ نہیں!

نہ خون کا رشتہ ــ نہ ذات برادری کا ناتا، نہ طبقہ ایک، نہ ذہنی رفاقت، نہ دماغی ہم آہنگی۔

تم کہ... "اعلیٰ قدروں" کے معنی "تہذیب و تمدن" کا مطلب، "علم" کی اہمیت "عشق" کی ہمہ گیری "خودی" کا لفظ تک نہیں جانتیں!

تم کہ... ایک نیچ ذات کی فرد، اَن پڑھ، اَن کلچرڈ سمجھی جاتی ہو سماج میں!

تم کہ جس کی محبت کے دامن میں اتنی وسعت ہے کہ ساری نوعِ انسانی سما جائے۔

تم کہ ماں کا آدرش روپ ہو ــــــ پریم اور سیوا کی مورتی ۔ غریب اور کیسی غریب ــــــ پھر بھی دیالو اور کیسی دیالو! فیاض اور کتنی فیاض! اپنی محنت مشقت سے پیدا کیا پیسہ اپنوں، عزیزوں، "بڑو سیلوں" اپنے پیاروں" پر خرچ کر دیتیں اور سب تمھیں "ساون کا اندھا" کہہ کر مذاق اڑاتے۔

تم ــــــ جو پیسے سے بھی زیادہ خدمت اور محبت کی انمول دولت لٹاتیں اسی طرح جیسے ہوا اور پانی بے دریغ اپنی نعمت دوسروں کو بخشتے ہیں اور نہیں جانتے کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔

تم ــــــ کیسے یہ اٹل حقیقت جان گئیں کہ انسان کی تخلیق کا راز انسانیت کی محبت ہے ــــــ جس کا زندگی بھر یہ مسلک رہا کہ ؎

خدا کے بندے تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے

میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

تم - کہ - ہم میں سے ہر ایک کی مشکل یا مصیبت کے وقت پہنچ جاتیں اور لوگوں کا دکھ درد بانٹ لیتیں ذمے داریاں اٹھا لیتیں۔

تم --- جس سے لوگ اس بات پر خفا ہو جاتے کہ سب کو چھوڑ کر تم صرف ان کی کیوں نہیں ہو جاتیں؟

اور تم --- تم ایک محبت کو خفا کر کے دوسری محبت کی طرف دوڑ جاتیں اور پھر اسی غم میں گھلا کرتیں کہ فلاں یا فلاں تم سے ناراض ہے۔ تمھارے لب پر شکوہ نہ آتا مگر خاموش آنسو اس غم کی غمازی ضرور کر دیتے!

تم --- کہ دستِ طلب دراز کرنا خودداری کے خلاف جانتی تھیں۔ جو کسی نے دے دیا۔ انتہائی شکر گزاری سے لے لیا اور بدلے میں پرخلوص دعاؤں کا خزانہ لٹا دیا۔

تم۔ اَن جانے میں مذہب اور اخلاق کی قدروں کا پالن کرنے والی --- علم اور تہذیب کا جو حاصل ہزاروں سال میں دنیا نے معلوم کیا (یہاں صرف معلوم کیا ہے)، اس کو دل میں چھپائے، انسانیت کی، انسانوں کی ستر برس کی عمر تک سیوا کرتی رہیں!

تم --- جس نے مجھے پالا۔ اور اپنے بچوں سے زیادہ چاہا۔

تم میری ماں کی پرستار، میری بہنوں کی فدائی۔ میرے بھائیوں کو چاہنے والی --- میرے بچوں پر نثار۔

تمھاری محبت --- کس چیز سے تشبیہ دوں اس محبت کو جو خاص کر تمھیں میرے بھائیوں سے تھی۔

کتنا چاہتی تھیں تم ان کو، اپنے بھائیوں سے زیادہ اپنے بیٹوں سے زیادہ --- یہ وہ محبت تھی جس میں بناوٹ نہیں ہوتی، گہری خاموش محبت، دل سوز الفت جو صرف ایک بہن کا حصہ ہوتی ہے --- مگر ہمیشہ ہوتی نہیں۔

ان میں سے ایک جب ہمیں چھوڑ کر چلا گیا تو میرے ساتھ تم پر بھی غم

کا پہاڑ ٹوٹ پڑا —— تمہارے آنسو میرے زخم پر مرہم کا کام دیتے۔ تمہاری آہیں دل کو ڈھارس بندھاتی رہیں۔ سچا غم گسار دنیا میں کتنی بڑی نعمت ہے!!
اور اپنے دوسرے بھائی سے ہم دونوں کی محبت کچھ اور زیادہ بڑھ گئی۔
تم دن رات کلپ کلپ کر اپنے اسی منہ بولے بھائی کی زندگی اور صحت کی دعا مانگا کرتیں!

یہ بھائی جس سے سات سال کی عمر میں تم نے یہ پوتر ناتا جوڑا تھا۔ اور ستر برس کی عمر تک اسے نباہ گئیں!
اور یہ عالم فاضل بھائی، شہرت اور عزت کی اونچی چوٹی پر براجمان بھائی۔ اپنی اس منہ بولی غریب، کم حیثیت بہن سے کتنی محبت کرتا تھا کتنی عزت کرتا تھا۔
سال بھر پہلے اس کی بیماری کی خبر سن کر تم ہزار میل سے دوڑی چلی آئیں اور کس دل سوزی، کس محبت، کس خاموشی سے تم اس کی خدمت اور دوسروں کی دل دہی کرتی رہیں!
مگر تمہاری صحت گر رہی تھی، ہاتھ پیر جواب دے رہے تھے اور تم سمجھ رہی تھیں کہ اب خدمت کا دم ختم ہو رہا ہے۔ خدمت لینے کا وقت آچکا ہے۔ اور یہ تم بھی جانتی تھیں —— ہاں اس حقیقت کی بھی شناسا تھیں کہ جب تک ہاتھ پاؤں چلتے ہیں سب اپنے ہوتے ہیں۔ جب یہ رفیق ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ تو اکثر اپنے بھی موڑ لیتے ہیں۔

تم نے مجھ سے کہا —— اب مجھے گھر پہنچوا دے —— اب مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ میں بہت دن نہ جیوں گی۔

میں سمجھ رہی تھی —— یہ ماں کی ممتا بول رہی ہے۔ جو بیماری دکھی میں اپنے بچوں کے پاس رہنا چاہتی ہے۔ میں نے تمہاری خواہش پوری کر دی۔ تمھیں گھر بھیجنے کا انتظام کر دیا۔
سب روکتے رہے مگر تم اپنے گھر چلی گئیں۔ پریشان سی، بدحواس سی۔

کھوئی سی ۔ مجھے بار بار گلے لگاتیں ۔ لڑکیوں کو بار بار پیار کرتیں اور اپنے بھائی کی بار بار بلائیں لیتیں...... جو تمہیں دلاسا دیتے رہے، سہارا دے کر گاڑی میں بٹھایا، جلدی واپس آنے کے لیے کہا۔

میں رو رہی تھی کہ مجھے اب تم سے ملنے کی امید نہ تھی۔ تم رو رہی تھیں کہ تمہیں اب کسی سے پھر ملنے کی آشا نہ تھی۔ مگر وہ مسکرا رہے تھے۔ فقرے کس رہے تھے!

ہاں تم چلی گئیں!

جو اندیشہ تھا وہ صحیح نکلا۔ تمہیں فالج کا اثر ہو گیا تھا۔ عجیب و غریب فالج جس میں سب حسیں بے کار نہیں ہوتیں۔ پھر بھی انسان وہ نہیں رہتا جو تھا۔ تم ناموں کو گڈ مڈ کرنے لگیں، چہرے پہچان لیتیں۔ مگر نام لیتے لیتے زبان لڑکھڑا جاتی۔ شعور کی لہر کبھی آتی۔ کبھی لوٹ جاتی —— تم بہک جاتیں۔ اور اس احساس سے کہ بہک گئی ہو۔ کرب کی ایک لہر سارے وجود پر چھا جاتی۔

مگر اسی حال میں بھی تم مجھے نہیں بھولیں —— "اپنے بھائی" کو نہیں بھولیں۔ "اپنے بچوں" کو نہیں بھولیں۔ تمہارے خط آتے رہے۔ دوسروں سے لکھوائے ہوئے۔ تم اور تمہارا خاندان لکھنے پڑھنے سے ایسا ہی بے بہرہ تھا جیسے ابتدائی انسان تھا، تم جھرہٹ منگاتی رہیں۔ بار بار بلاتی رہیں کہ خود آنے کے قابل نہ تھیں۔

مگر تم سے ملنے کون آتا۔

تم ایک "نیچ" ذات کی غریب، اپاہج فرد —— تم جو اب کسی کے کام آنے کے قابل نہ تھیں —— کون آتا —— کون بلاتا؟ سب بنے کے ساتھی ہوتے ہیں نا؟

اور پھر ہمارے سر پر سے قیامت گزر گئی!

مگر تم اس سے بے خبر رکھی گئیں، رکھی جا سکیں کہ تم معذور، اپاہج، ان پڑھ دنیا سے بے خبر، ایک پلنگ پر پڑی مجبور ہستی تھیں۔

جس خبر پر ہزاروں آدمی رو رہے تھے تم اس سے بے خبر تھیں تمہارے خاندان والے بھی یہ جانتے تھے کہ اس صدمے کو سہار نہ سکو گی! شاید مر جاؤ ——— شاید پاگل ہو جاؤ۔

پر کون جانے!

یہ دل ——— یہ شیشے سے زیادہ نازک! چٹان سے زیادہ مضبوط دل! کون جانے کیا سہہ سکتا ہے کیا نہیں؟

کبھی ایک جنبشِ لب نہ سہار سکے چٹاخ سے ٹوٹ جائے ..... کبھی سخت سے سخت وار سہہ جائے اور یونہی دھڑکتا بھڑکتا رہے۔

کون جانے تم بھی اس صدمے کو سہار لیتیں؟ پھر شاید تم سے مل کر دل کی بھڑکتی آگ پر چھینٹا پڑ جاتا ——— کہ سچے غم گسار کے سینے سے لپٹ کر رو لینے سے دکھ بٹ جاتا ہے نا۔

مگر تم ہر بات سے بے خبر ——— پھر بھی بے قرار و پریشان ——— خط لکھواتی رہیں ——— مجھے بلاتی رہیں۔

میں دل کو مضبوط کر کے تمہارے پاس جانے کا ارادہ کرتی رہی اور توڑتی رہی ——— ڈرتی رہی کہ تم سے مل کر ضبط کے بندھن ٹوٹ نہ جائیں گے کیا ———؟ کیسے تم سے یہ سب چھپا سکوں گی؟

دن، ہفتے اور مہینے گزرتے رہے اور میں تم سے ملنے نہ جا سکی!

اور پھر ایک دن میں نے فیصلہ کر لیا۔ کل میں ضرور تمہارے پاس جاؤں گی۔

جانے کب ماضی کے پیار کا یہ آخری بندھن بھی ٹوٹ جائے۔ اس سے پہلے میں تمہیں ایک نظر تو دیکھ لوں۔

مگر ——— اس رات۔ دروازے پر کھٹکا ہوا ——— اور وہاں تمہیں کھڑا دیکھ کر حیرت سے میں دم بخود رہ گئی۔

تم کہ اپنے گھر میں دو چار قدم چلنے کے قابل نہ تھیں... فالج کے

حملے سے نیم جان و نیم حواس!

تم کہ.... کسی صاحب ثروت گھرانے کی فرد ہوتیں تو کسی نرسنگ ہوم میں نرسوں سے خدمت لے رہی ہوتیں ــــ یا کسی عام فارغ البال خاندان سے ہوتیں تو پلنگ پر پڑے پڑے گھر والوں سے خدمت لیتیں، دوا علاج کراتیں۔ دوسروں کو ستاتیں اور اپنی انانیت کو تسکین دیتیں۔ اپنا فرسٹریشن نکالتیں

تم۔ کیسے ۔ خدایا کیسے ۔ پانچ چھ گھنٹے کا بس کا یہ کٹھن سفر کرکے یہاں آگئیں؟

بجلی کی کوندکی طرح یہ سب خیال ذہن میں سے گزر گئے!

تم ہاتھ میں لوٹا پکڑے، بغل میں چادر دبائے، کانپتی دبلی ٹانگوں پر اپنے بے ڈھنگے بھاری جسم کا بوجھ اٹھائے کھڑی تھیں ۔ ویسی ہی صاف ستھری پاک پاکیزہ! مگر ـ مگر ہمیشہ کی طرح چہرے پر مسرت نہ تھی، ہونٹوں پر پیار بھری مسکراہٹ نہ تھی۔ ہاتھ پیر میں لرزش ۔ آواز میں لڑکھڑاہٹ، چہرے پر بیماری اور پریشانی کے تاریک سائے اور آنکھوں میں درد وغم کا ساگر!

تم آئیں ــــ مگر کس حال میں!

مگر اب بھی، ہر کسی پر محبت کی برکھا ہو رہی تھی۔ ہر ایک کو یاد کیا جا رہا تھا۔ پوچھا جا رہا تھا۔ سب سے ملنے کی خواہش کی جا رہی تھی!! الفاظ اور دماغ میں ہم آہنگی نہ تھی مگر محبت اپنا کرشمہ دکھا رہی تھی۔

مگر تم آئی تھیں۔ اصل مقصد تو یہی تھا۔ کہ "اپنے بھائی" سے مل لو۔ کئی ہفتے سے تم بے قرار تھیں۔ تمہارے خاندان والے ٹھیک سے بات بنانا بھی تو نہ جانتے تھے۔ تم ان کو برا بھلا کہتی اور کوستی رہیں کہ میرے بھائی کی خیر نہ منگا کر دو۔ آخر جب دل کو قرار نہ آیا تو بیٹے کو لے کر چل پڑیں۔

کونسی حس تھی یہ جس نے تمہارے دل کو خبر کر دی تھی۔

تم ماں نہ تھیں کہ ممتا تڑپ اٹھتی ہے۔ بہن یا بیٹی نہ تھیں کہ کہا جاتا ہے

خون کا رشتہ بڑا گہرا ہوتا ہے۔ کسی کو کچھ ہو جائے تو یہ خون بلک اٹھتا ہے؟
تم تو خالی ایک خدمت گزار تھیں۔ ایک غریب چاہنے والی منہ بولی
بہن!

پھر کیسے تمہارے دل کو خبر ہو گئی؟
تم نے بلک کر، رو کر، ہاتھ جوڑ کر۔ جیسے ڈرتے ڈرتے مجھ سے پوچھا۔
"سچ بتا۔ سچ کہیو —— بھائی۔ بھائی کیسے ہیں؟"
یہ لمحہ۔ آہ۔ یہ جان لیوا لمحہ آخر آ گیا جس کے خیال سے میں لرز رہی تھی۔
کون سا جذبہ تھا جس نے منہ سے یہ کہلوا دیا۔ "وہ۔ وہ تو اچھے ہیں۔
علاج کے لیے امریکہ گئے ہیں۔" جو لفظ دل چھید کر نکل رہے تھے وہ کتنے
پُرسکون انداز میں ادا ہوئے تھے۔

مگر تمہارے چہرے پر شک کی پرچھائیاں تھیں —— تم ایک ٹک
مجھے تک رہی تھیں —— اور میں اسی جد و جہد میں تھی کہ تم میرا چہرہ نہ پڑھ سکو!
لوگ آتے رہے اور تم سے ملتے رہے۔ تم ہر ایک سے ایک ہی سوال
کرتیں —— اور وہ صبر کی سِل کلیجہ پر رکھ کر میرا بنایا ہوا جواب دہرا دیتا۔
اور پھر —— نیند کی گولی کھلا کر، تمہارا ہاتھ، ہاتھ میں لے کر میں تم
سے بڑے نارمل انداز میں باتیں کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ تم جس حال
میں بھی ہو مجھے عزیز ہو!
مگر —— تم جیسی زندگی سے بھرپور ہستی کی معذوری، نیم دماغی میرا
دل مسوستی رہی —— تم بار بار میرا ہاتھ اٹھا کر چوم لیتیں —— اور میں یہ سب
جھیلتی رہی۔

تم سو گئیں۔ میری رات بھی بیت گئی۔
صبح ہو گئی —— رات بھر وہ دروغ مصلحت آمیز میرے سینے میں اٹکا
رہا۔ رات بھر جان لیوا سچائی مجھے نگلتی رہی!

اور دن —— وہ تورات سے زیادہ سخت تھا کہ تم بار بار سوالات کرتی رہیں۔ ان کے بارے میں، ان کے خط کے بارے میں، ان کے آنے کے بارے میں!

میں تمہیں کیسے بتاتی کہ وہ اس مقام پر ہیں جہاں سے ازل سے نامہ و پیام بند ہے۔ میرا سپاٹ لہجہ دوسروں کو رلا رہا تھا مگر میں تمہیں زندہ رکھنا چاہتی تھی —— تم اس بے کراں محبت کے ساگر کی بوند —— جو کبھی میرا حصہ تھا۔ تم بھی کہیں بحرِ فنا میں ضم نہ ہو جاؤ!

اور پھر تم جانے کے لیے تیار ہو گئیں! تم کہ پہلے آتیں تو مہینوں سے پہلے واپس نہ جاتیں۔ نہ جانے دی جاتیں۔ آج بیس گھنٹے لیے تم جا رہی تھیں یہ سمجھ کر کہ اب تم مجبور و معذور کو کوئی نہیں روکے گا —— آج تم کسی کی خدمت کرنے کے قابل نہیں رہ گئی تھیں نا۔ خود خدمت کی محتاج تھیں!

ہم میں وہ جذبہ، وہ حوصلہ، وہ ہمت کہاں تھی جو تمہیں روکتے خدمت کرنے اور اس سیوا کا بدلہ چکانے کو، جو تم عمر بھر سب کی کرتی رہیں! ہم بھلا کیسے ایک "غیر" کی خدمت کا بار اٹھاتے —— جو اپنوں کی خدمت بھی کرنے سے گریز کرتے ہیں۔

ہم —— جن کے پاس وسائل تھے، موٹریں، پیسہ، تم سے ملنے نہ جا سکے۔ تم دکھ اٹھا کر ملنے آئیں تو بعض نے تم سے ملنے چار قدم پر آنے کی زحمت نہ اٹھائی۔

تم —— ممتا کی جان، خدمت کا پیکر، سیوا کی مورتی ہو تو ہوا کرو —— ہم خود اپنے مسائل میں الجھے ہوئے ہیں۔

ہاں۔ ہم نئی تہذیب کے مارے، نئے کلچر۔ کھوکھلے کلچر کے سلامی۔ خود پرستی، خود نمائی کا شکار —— اپنی حالت کے بھنور میں چکر کھاتے ہوئے انسان...!

ہم — جو کائنات کا محور صرف اپنی ذات کو سمجھتے ہیں۔

ہم جن کو اس پر غصہ اور جلن ہے کہ ساری دنیا اور خود خالقِ کائنات ہماری خواہش اور مرضی کا پابند کیوں نہیں؟

ہم کہ اس "فرسٹریشن" میں خدا کے منکر اور انسانوں سے بیزار ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

ہم کہ — ذہنی تنہائی، وجودیت کا کرب، زندگی کا دکھ، محرومی، ناکامی، لفظوں کے جال میں پھنس گئے ہیں۔

ہم — سکون و طمانیت سے کوسوں دور۔ اپنی آگ میں خود ہی جلتے رہتے ہیں!

ہم — جو بہت کچھ ہوتے ہوئے بھی — کچھ نہ ہونے کے دکھڑے روتے رہتے ہیں!

ہم کہ — زندگی کو سورگ بنانے کی جگہ نرک بنانے پر تل گئے ہیں۔

ہم — جو لینا جانتے ہیں۔ دینا نہیں۔

ہم میں اکثر ایسے بھی ہیں جو ہزاروں میں کھیلتے ہیں۔ اسراف بے جا کرتے ہیں پھر بھی نہونت کا رونا روتے ہیں!

آہ! ہم — جو خود رحمی، بے یقینی اور بے زاری کے جال میں پھنسے پھڑپھڑا رہے ہیں۔ کاش ہم، تم — اور تم جیسوں کو سمجھ سکتے۔

تمھاری سیرت کا حسن، شخصیت کی دلکشی، تمھاری محبت کی وسعت خدمت کی لگن، تمھارا سچا ایثار، بے لاگ قربانی کا جذبہ ..... تمھارا ایمان و یقین! کاش اے کاش یہ صفات اور زیادہ عام ہوتیں۔ یہ جذبے زیادہ فراواں ہوتے۔

مگر تم ہو کیا؟

اُنھ۔ یہ ..... یہ فنکار بھی عجیب مخلوق ہوتا ہے — جسے چاہے آسمان پر چڑھا دے، جسے چاہے پاتال میں گرا دے۔

تم ایک معذور و بے بس ہستی! نچلے طبقے کی جاہل، اَن کلچرڈ، بوڑھی عورت!

تم میں ہے کیا بھلا؟

اور تم چلی گئیں ..... چلتے وقت ایک بار پھر تم نے مجھے اپنے سینے سے بھینچ لیا۔ درد و محبت کی گرمی کی لہر تمہارے جسم سے میرے جسم و روح میں سرایت کر گئی!

تم چلی گئیں ......

میرے زخموں کو کرید کر ......

میرے دماغ کی طنابیں کس کر ....

اور تم سے لپٹ کر جی بھر کر رونے کی تمنا دل کی دل ہی میں رہ گئی۔

مگر نہیں — نہیں — تم میرا غم بٹانے آئی تھیں۔

تمہاری یہ محبت — یہ اپنا پن — یہ احساس کیا زخم پر مرہم نہیں رکھتا؟

مگر یہ رشتہ — یہ درد کا رشتہ ..... اور مضبوط ہو گیا .....

دنیا کی کون طاقت اسے توڑ سکتی ہے؟....

اس کا سر دھیرے دھیرے جھکتا چلا جا رہا تھا — کہانی ختم ہوتے ہوتے اس کی آنکھیں خمار آلود ہو چکی تھیں۔

اور اب وہ سو رہی تھی۔ مدت بعد گہری پر سکون نیند۔

٥

زخم و مرہم

طیارے کا پٹ بند ہو چکا تھا مگر جہاز کی اڑان میں ابھی دیر تھی۔ اندر اور باہر بے پناہ چہل پہل تھی۔ مسافر سامان رکھ رہے تھے، آپس میں باتیں کر رہے تھے، فرسٹ کلاس کے لوگ سامنے والے حصے میں جھانک رہے تھے۔ خوش پوش، خوش شکل "ایر ہوسٹس" ادھر ادھر بھاگ رہی تھیں، کسی سے ہنس کر بات کر لیتیں، پھر دوڑنے لگتیں۔ نوجوان مرد ان کی توجہ زیادہ کھینچ رہے تھے۔ اسمارٹ "پرسنز" بھی دوڑ رہے تھے۔ لائف بلٹ اور آکسیجن کا استعمال سکھایا جا رہا تھا۔ بیٹی باندھنے اور سگریٹ نہ پینے کی ہدایتیں جا رہی تھیں۔ لیمن ڈروپ اور اورنج اسکاش پیش کیا جا رہا تھا.... وہ کھڑکی کے برابر کی سیٹ پر بیٹھی یہ سب کو دیکھ بھی رہی تھی اور نہیں بھی دیکھ رہی تھی۔ بعض وقت انسان کی ایک ایسی کیفیت ہوتی ہے کہ جیسے وہ اس دنیا میں موجود بھی ہے اور نہیں بھی۔ کچھ یہی حال اس کا تھا۔ کھڑکی سے باہر کی روشنیاں، پھرتے ہوئے لوگ، کھڑے ہوئے طیارے، یہ چمک دمک، شور و غل، ہجوم سب اسے دھند میں لپٹے محسوس ہو رہے تھے.... عجیب سی ویرانی نے اسے چاروں طرف سے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ ساٹھ ستر لاکھ آبادی کے اس پُر شور شہر میں بھرے پرے گھر میں، بچوں کی کلکاریوں اور پیاری پیاری باتوں، نوجوانوں کے ہنسی مذاق،

تفریح، ساحلِ سمندر کی سیر عزیزوں اور دوستوں کی خاطر داری اور دلداریوں کے درمیان۔ یہ ویرانی یہ دھند اسے اپنی لپیٹ میں لیے رہی تھی اور اب وہ طیارے میں بھی اس کے ساتھ ہی چلی آئی تھی۔ اس نے اپنا سر شیشے کی کھڑکی پر لٹکا دیا۔ نظریں باہر تھیں، سوچیں آزاد تھیں۔

"کتنا بدل گیا ہے تمہارے بغیر یہ شہر؛ وہ رونق، وہ زندگی، وہ مسرت، وہ ولولہ۔ وہ جوش جو اس کا کیرکٹر تھا۔ جس کے تم اتنے دلدادہ تھے۔ وہ سب کہاں کھو گیا؛ بس پل بھر کے لیے جب تمہارا تصور حقیقت بن کر دل کو دھوکا دیتا۔ تو یہ لگتا، یہ وہی ہنستا کھلکھلاتا شہر ہے جس میں تمہاری آواز ہمارے کانوں میں رس ٹپکایا کرتی تھی۔ تمہاری دبلہ ہمارے لیے دنیا کی خوشیاں لایا کرتی تھی۔ مگر پھر تصور ہمیں ایک دھچکے سے حقیقت کی چٹان پر دھکیل دیتا۔ اور ویرانی و تنہائی ہمیں دبوچ لیتی......"

آہ! محبت کرنے والوں کی کج فہمیاں! تصور اور حقیقت کی یہ آنکھ مچولی وہ برسوں سے کھیل رہی تھی۔ کیسے کیسے اس نے حقیقت کو نہیں اپنایا، کس کس طرح دل کو یقین نہیں دلایا وہ جن سے بچھڑ چکی وہ پھر مل نہیں سکتے۔ دنیا کی کوئی طاقت آب و گل کی اس دنیا میں اب ان کو اس سے نہیں ملا سکتی۔ وہ ان کو خواب میں بلانا چاہتی۔ مگر خواب و حقیقت میں جانے وہ کون سا رشتہ ہے کہ ہزاروں دعاؤں اور آرزوؤں کے باوجود خواب میں بھی وہ اس پیارے مسکراتے چہرے کو اس طرح نہ دیکھ پائی جس کے لیے اس کی روح بے چین تھی۔

"تمہارے بعد ہمارے خواب بھی چھن گئے۔ یہ ہمارے سوا کون جان سکتا ہے۔ لیکن تخیل اور تصور۔ اور وہ بھی ایک فنکار کا تصور۔ وہی تو اس کی زندگی کا سہارا ہوتا ہے۔

تم تو اس کے قائل نہیں تھے کبھی۔ مگر ہم جانتے ہیں۔ اگر ہمارے پاس یہ بے بہا دولت نہ ہوتی تو شاید اب تک پاگل ہو گئے ہوتے۔ ہاں یہ تخیل اور

تصور ہی تو ہے جس پر دنیا کی کوئی طاقت پابندی نہیں لگا سکتی۔ تم ہزاروں بار تصور میں آئے ہو۔ ہر اس رنگ میں ہم تمہیں دیکھتے ہیں جن میں پچاس برس دیکھتے رہے ہیں — جانے لاشعور کے کس کونے میں یہ خیال جا کر چھپ گیا تھا کہ تم ہم سے بالکل نہیں کھوئے ہو۔ ہزار میل دور اس بڑے شہر میں موجود ہو۔ جب جائیں گے تو تم ہمیں مل جاؤ گے۔ شعور اور لاشعور کی یہ غیر محسوس لڑائی برسوں سے ہوتی رہی ہوگی، تبھی تو ہم تمہارے شہر، تمہارے گھر جانے سے بچتے رہے۔ دل کسی طرح آمادہ نہ ہوتا کہ جس قیام سے تمہاری ہزاروں یادیں وابستہ ہیں وہاں تمہارے بغیر قدم رکھیں . . . . . "

جہاز اب پرواز کے لیے پر تول رہا تھا۔ سب نے پٹیاں باندھ لی تھیں۔ برابر میں بیٹھا نوجوان مسافر اسے عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا شاید بے چاری پہلی بار جہاز میں بیٹھی ہے ڈر رہی ہوگی۔ "گھبرانے کی بات نہیں! بیلٹی لائیے میں باندھ دوں۔" اس نے جھک کر کہا تو گھبرا کر اس نے اپنا بھاری سر اٹھایا۔ "جی شکریہ میں باندھ لوں گی!"

وہ خالی خالی نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ مگر جس کو دیکھنے کی عادی تھی۔ وہ کہاں تھا! جب بھی وہ یہاں آتی ٹرین سے آئے یا جہاز سب سے پہلا روشن چہرہ ان کا نظر آتا۔ جب واپس جاتی تب سب سے آخر میں وہ چہرہ اوجھل ہوتا تھا۔ وہ مصروف ہوتے یا بیمار۔ یہ ممکن نہ تھا کہ وہ آئے اور اسے لینے اور پہنچانے نہ آئیں۔ بس ایک بار، جب ان کی بیماری کی خبر سن کر بھاگی آئی تھی تو وہ نہ آسکے تھے۔ مگر کتنے لوگوں کو اسٹیشن بھیجا تھا اور جب وہ گھر پہنچی تھی تو اسے سینے سے لپٹا کر درد و محبت کے کتنے آنسو بہائے تھے۔ مگر وہ ہنستی مسکراتی رہی تھی۔ ان کے پاس پہنچ کر ضبط کی کیسی طاقت پیدا ہو جایا کرتی تھی۔

" بھیا ہم آئے بھی اور اب جا بھی رہے ہیں . . . . تم نہ لینے آئے نہ چھوڑنے آئے۔ تمہارے بنا اتنے دن ہم نے کیسے گزارے، تم نے یہ بھی پوچھا! ہم نے

تمھیں کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا، تمھارے بچوں کے پیار میں، تمھارے گھر کے کونے کونے میں پھولوں کی مہک پتوں کی سرسراہٹ، سمندر کے مد و جزر، طلوع و غروب کے مناظر، ساحل کے ذرے، سڑکوں کا ٹریفک سب ہمارے ساتھ تمھیں پکارتے رہے۔ تم کہاں ہو؟ کہاں ہو تم؟ اور ہمیں ایسا لگتا جیسے ہر چیز سے تمھاری صدا آرہی ہے۔ "یہاں آ ـــــ یہاں آنا۔ میرے پاس۔ وہاں کہاں بیٹھی ہے" کتنے عادی ہیں یہ بدبخت کان اس صدا کے مگر ہم تمھارے پاس نہ آسکے بھیا۔ یہ کون سا سمندر قدرت نے ہم دونوں میں حائل کر دیا ہے کہ جب تک فنا کی کشتی ہمیں لینے نہ آئے ہم معذور مجبور کھڑے درد کی لہریں گنتے رہیں گے .....

"مگر ـــ مگر تمھاری یاد نے تو ایک پل کے لیے بھی ہمارا دامن نہیں چھوڑا۔ وہ صورت نظروں میں پھرتی رہی، جس پر ہمیں دیکھ کر مسکراہٹ کی چاندنی نکھر اٹھتی تھی، اس سینے کی دھڑکن دل میں گرمی پیدا کرتی رہی جو دکھ اور غم میں ہمارے ساتھ دھڑکتا۔ وہ آنسو چپ چاپ اب صرف دو آنکھوں سے بہتے رہے جو پہلے چار آنکھوں سے بھی چپ چاپ بہا کرتے تھے۔ وہ دلچسپ باتیں ہلکے پھلکے لطیفے، مزاحیہ فقرے کانوں میں گونجتے رہے جن سے تمھاری گفتگو مالا مال ہوتی تھی۔ وہ شعر اور مصرعے یاد آتے رہے جو تم بے ساختہ پڑھ جاتے تھے وہ دکھ، محرومیاں، ناکامیاں، بیماریاں جن کو ہم صبر و برداشت کے ساتھ جھیل جاتے تھے۔ ہمارے وجود کو پگھلتے رہے۔ آنسو آنکھوں کی جگہ سینے میں اترتے رہے، آہیں دل میں بخیہ کرتی رہیں۔ اور آہ! دل تم سے باتیں کرنے کو مچلتا رہا۔ کتنی باتیں کرنی ہیں تم سے۔ تم تو ہمیشہ کے کم گو ہو۔ بولنے کا فرض تو ہمیں کو رہا ہے۔ جی چاہتا ہے۔ ہائے کتنا جی چاہتا ہے کہ ہمیشہ کی طرح ہم تمھیں اپنے دکھ اور غم کی داستان سنائیں اور تم دلسوزی اور خاموشی سے سن کر زخم پر مرہم رکھو۔ یہ کون جانے۔ کون جان سکتا ہے۔

سچے ہمدرد کو صرف سنا کر بھی دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ اور پھر ہمارا دکھ اور غم تو صرف تم ہی سمجھتے۔ دوسرا کوئی کیسے سمجھ سکتا ہے۔ کون اس بے پناہ تنہائی کو سمجھتا جس کا ہمیں سامنا ہے۔ اب کس سے کہوں کہ سب مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔ اس پنجتن گروہ میں سب کو یاد کرنے کے لیے بس کم نصیب باقی رہ گئی ہے اسی کی بے نام سسکیوں پر برابر کے اونگھتے مسافر چونک پڑے۔ مگر وہ اپنے ماحول سے بیگانہ تھی۔ جدائی کا زخم لوند لوند رس رہا تھا۔

کل وہ بڑی مشکل، بڑی کوشش کے بعد ان کی آرام گاہ پر گئی تھی۔ وہ جب سے آئی تھی وہاں جانے کے لیے بے قرار تھی، مگر قبرستان کے بے درد و بے حس منتظمین کا یہ قانون تھا کہ کوئی ماں، بہن، بیٹی، بیوی اپنے پیارے کی قبر پر نہ آئے! کیوں؟ اس کا جواب وہ کیوں دیں؟ دنیا میں ہزاروں ناانصافیاں ہمیشہ سے ہوتی آئی ہیں۔ ان میں اضافے کیوں نہ ہوں!

مگر آخر کار۔ ایک ہمدرد نے اس کی صورت نکالی اور وہ پانچ برس بعد اس کی خاک کو بوسہ دینے کے لیے جا سکی جہاں اس کا بھائی محوِ خواب تھا۔ وہ بڑی جذباتی تھی۔ مگر ساتھ ہی بڑی حقائق پسند بھی۔ یہ دو متضاد صفات کیسے اس کی شخصیت میں گھل مل گئی تھیں؟

وہ نہیں جانتی تھی۔ ہاں دو سال کی عمر سے اسے شدتِ احساس کی بیماری لگ گئی تھی۔ کیا وہ یہ جانتی تھی کہ خاک جب خاک میں مل جائے تو پھر سب کچھ خاک ہو جاتا ہے۔ جسدِ خاکی ایک بے جان حقیقت ہے۔ روح ایک ابدی ازلی شے جو زماں و مکاں کی قید سے آزاد ہے۔ مگر..... مگر پیارے کے نام کی ہر چیز کتنی پیاری، دل سے کتنی قریب ہوتی ہے، یہ صرف کوئی قرقت نصیب ماں، بہن بیٹی، بیوی جان سکتی ہے!

"بھیا پانچ سال سے ہم اس خاک کو بوسہ دینے کو تڑپ رہے تھے۔ جہاں تم سو رہے ہو۔ سیاہ پتھر کی آرام گاہ پر سنگ مرمر کا کتبہ نصب ہے۔

جس پر تمھاری جدائی کا قطعہ کندہ ہے۔ مگر ہم کچھ نہ دیکھ سکے، کچھ نہ پڑھ سکے۔
بس یہ لگا تم آغوش کھولے ہمیں سینے سے لگانے کے لیے کھڑے ہو.....
اور ہم بے اختیار زمین پر جھک گئے کہ شاید قدرت کو رحم آجائے اور بچھڑے
مل جائیں۔ زمین آسمان یہ دنیا سب چکر کھاتے رہے اور ہم ہچکیوں کے
سیلاب میں ڈوب گئے۔ مگر تمہیں پا نہ سکے.....

"اور پھر تو بھیا ہمیں ایسا لگا جیسے تم ہم سے آج ہی بچھڑے ہو۔ سب
آج ہی بچھڑے ہیں۔ اور ہم اس ویران اجڑے صحرا میں تنہا کھڑے ہیں۔
سینے میں جدائی کے زخم چھپائے، دل میں یادوں کا لالہ زار اگائے آنکھوں
میں آنسوؤں کے کانٹے چھپائے، تخیل میں محبوب صدائیں سجائے۔
آبلہ پا۔ کب تک، الٰہی کب تک..... ہم اس راہ پر چلتے رہیں گے؟"

ایک جھٹکے سے جہاز زمین پر اتر کر دوڑنے لگا۔ وہ چونک پڑی۔
اس کا شہر آگیا تھا۔

رات گہری ہو چکی تھی۔ باہر موسم بہت سرد تھا۔ مگر یادوں کی گرمی
سے اس کا دل ایک انوکھی گرمی محسوس کر رہا تھا۔

دوسرے مسافروں کے ساتھ اس نے بھی سامان سنبھالا۔ اور آہستہ
بہت آہستہ آہستہ طیارے کی سیڑھیاں اترنے لگی اس کا گھر، اس کا محبوب،
اس کے منہ بولے بچے جو صرف اسی کے تھے، اسے آوازیں دے رہے تھے۔
وہ ویرانی سے آبادی کی، جذبات سے حقیقت کی، تصورات سے اصلیت کی، فرار
سے ذمہ داریوں کی طرف جا رہی تھی!

ماضی اب بھی کچل رہا تھا، جدائی کے زخم اب بھی تپک رہے تھے۔ مگر
حال اسے پکار رہا تھا۔ فرائض اسے بلا رہے تھے کھوئی محبتوں کی یاد کے ساتھ ساتھ
اسے ان مول محبتوں، ان راحت بھرے دکھوں کا پالن کرنا تھا جن کے بغیر اس کی زندگی بے معنی تھی

پرتیں... پٹیاں... پھاہے...

ایک ذراسی بات...... اور ساری کوششوں پر پانی پھر گیا!!! پٹریاں اکھڑ گئیں...... پرتیں گر گئیں...... پھاہے الگ ہو گئے...... ساری رنگ برنگی پٹیاں...... دھجیوں کی طرح ادھر ادھر بکھری پڑی تھیں۔

چودہ ہزار چار سو راتیں اور دن فضا میں تحلیل ہو گئے تھے! انتہا گہرائیوں سے اچھل کر ننگی حقیقت آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے دیکھ رہی تھی سوال پوچھ رہی تھی۔

"یہ پرتیں...... یہ پٹیاں...... یہ پھاہے کس لیے؟ کیا زخم کا انگور بندھا؟ گھاؤ مندمل ہو سکا؟ لہو تھما؟ ناسور کا منھ بند ہوا؟"

اوہ یہ پھاہے یہ پٹیاں یہ پرتیں!!

کتنے بوجھ تلے تم نے مجھے کچل کر رکھا ہے۔ مگر تم کامیاب نہیں ہوئیں نا؟ فطرت سے بغاوت! ہنھ دنیا سے چھپانے کے لیے یہ ڈھونگ مگر تم بھول تو نہ سکیں، آگ...... یہ آگ کہیں ان چھینٹوں سے بجھتی ہے۔ ناسور مرہم کے پھاہوں سے بھرا ہے۔ پرتوں پر پرتیں اور پٹریاں جتنی چلی گئیں مجھے گہرائی میں ڈھکیلتی رہیں مگر سوئی کی جو نوک دل میں ٹوٹ چکی ہو اسے

کون نکال سکتا ہے؟

کیا تمھارے من میں کانٹا بن کر نہیں کھٹکتی رہی ہوں؟

- تم ادھوری ہو ـــــ ادھوری تھیں ـــــ ادھوری رہو گی!
تمھارا دامن خالی تھا، ہے اور رہے گا تمھاری پیاس نہ کبھی بجھی تھی نہ بجھے گی۔

جانے دل کی کن گہرائیوں سے یہ موہنی زخم کو چیر کر نکل آئی تھی اور آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اسے چنوتی دے رہی تھی.... سوال پر سوال کر رہی تھی ـــــ اور ہر سوال دل کے زخم پر چرکے لگا رہا تھا......

نہیں ـــــ نہیں ـــــ نہیں!

یہ غلط ہے۔ یہ جھوٹ ہے!

وہ ادھوری نہیں پوری ہے دکھی نہیں سکھی ہے پیاسی نہیں سیراب ہے کیا ہوا اگر اس نے ایک محبت کھودی.... کتنی محبتیں پائی بھی تو ہیں ایک گھاؤ پر کتنوں نے مرہم رکھا ہے!

ایک گوہر بے بہا گم ہوا ہے تو کتنے لولوئے شہوار اس کی گردن میں جگمگائے ہیں۔

آب حیات کا چھلکتا جام ہونٹوں تک آکر چکنا چور ہوا تو کیا۔ ٹھنڈے میٹھے پانی کے کتنے پیالوں نے اس کے خشک ہونٹوں کو تر کیا ہے! جگر کا ایک ہی ٹکڑا تو ٹوٹ کر گرا ہے۔ ایک ہی نام چلانے والا تو خاک میں ملا ہے مگر.... مگر

مگر اس کے دماغ کی کوکھ سے جنم لے کر کتنے جگر گوشوں نے اس کے دل کے خلا کو پر کیا ہے ـــــ اس کو زندہ باقی رکھنے کا عہد کیا ہے اس کا فن ـــــ فن پارے جان سے زیادہ پیارے معنوی

بچےان کو کون اس سے چھین سکتا ہے شاید یہ قدرت بھی اس پر قادر نہیں۔ اس کے زخم کا مرہم۔ اس کے دل کا سکون روح کا چین۔

— — — — — — — — — —

ایک قہقہہ گہرے گھاؤ کے سوکھے ہونٹوں سے ابھرا اور پھر وہ نہ جانے کہاں چلا گیا...... یہ طویل قہقہہ ——— وہ اس کا مذاق اڑا رہا ہے تضحیک کر رہا ہے۔

— — — — — — — — — —

اس نے ایک ہاتھ سے سر تھام رکھا تھا دوسرے سے دل مگر آوازیں، ان کو کیسے روکے؟

باہر کی آواز کی طرف سے کان بند کیے جا سکتے ہیں مگر یہ اندر سے اٹھنے والی آوازیں، یہ ہنسی اف خدایا!!

اس غار کا منھ چھپانے کے لیے اس نے کیا کیا جتن نہ کیے۔

اس گھاؤ کو کتنی پرتوں کے نیچے شعور اور لاشعور کی کوششوں نے دفن نہیں کیا......

زندگی کی خوشیوں میں حصہ لے کر......

پیاروں کی محبت میں ڈوب کر، دوستوں کی رفاقت کی چھاؤں میں بیٹھ کر، چاہنے والوں کی خاموش ہمدردی کا ٹھنڈا پھاہا سینے پر رکھ کر......

دوسروں کے باغوں کے پھولوں کی خوشبو سے لطف اندوز ہو کر......

غیروں کو اپنانے کی، دلدوز دل شکن دلکش دلفریب کوششوں میں اپنے کو کھو کر......

تن من دھن دوسروں کے لیے وقف کر کے، اپنا گمانیوں بے دردیوں کو نظر انداز کر کے......

اپنوں کی رکھائی بے حسی کو بھلانے کی من ماننے معنی پہنانے کی سعی میں محبت اور اپنائیت کی داد پانے کی توقع کو دم توڑتے دیکھ کر صبر کی سِل

دل پر، اور بے پروائی کی نقاب چہرے پر ڈال کر۔۔۔۔ محلے پڑوس اپنے اور عزیزوں کی خوشی اور غموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے کر۔۔۔۔۔ خدمت اور سیوا کے بھلاووں میں پڑ کر!

بیماروں کی تیمارداری، مریضوں کا دوا علاج مصیبت زدوں کی غم خواری کی کوششوں میں۔۔۔۔۔۔۔

مفلسوں اور ضرورت مندوں کی مصیبت میں ذرا سی کمی کرنے کی سعی میں۔۔۔۔۔۔۔

کتنے ٹھنڈے پھاہے ہیں یہ کتنا سکون اور راحت دیتے ہیں! اور پھر۔۔۔۔۔ یہی کیا دوسروں کو اپنے دکھ میں دکھی ہوتے دیکھنا بیماریوں میں محبت کرنے والوں کی دردمندی اور دل سوزی کی راحت۔۔۔۔۔۔۔ ان چاہنے والوں کے پیار سے مغلوب ہو کر جو اس کی زندگی اس کا پیار اس کا اعتماد چاہتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔

جو اس کی کمزوریوں خامیوں اور غلطیوں کو نظر انداز کر کے چاہتے رہتے ہیں۔۔۔۔۔ دنیا کی نظر میں وہ اس کا خون نہیں مگر اس کے دل کا روح کی پیاس اور درد کا درماں تو ہیں۔

اپنے رفیق کی محبت اور رفاقت کی بے بہا دولت پا کر اس کے انتھاہ پیار۔ گہرے اعتماد ان کہی ہمدردی میں زندگی کی صلیب کے بھاری بوجھ کو اس کے خاموش سہارے میں اٹھانے میں اس نے کیا نہیں پایا راحت، سکون، مسرت!

ہاں ہاں یہ مرہم یہ پھاہے یہ بہترین۔۔۔۔۔ یہ تو اس کے جیون کا سہارا ہیں یقین اور ایمان کا اٹوٹ ستون! جس سے مضبوط سہارا جس سے بڑی دولت جس کا بخشا سکون لازوال ہے۔

تم۔۔۔۔ تم کون ہوتے ہو ان پر ہنسنے والے۔ ان کی تضحیک کرنے

والے کیا کیا نہیں پایا اس نے ؟؟

زندگی کے چھلکتے جام نے اس کی پیاس ہمیشہ بجھائی ہے۔

زندگی کی راحتوں اور مسرتوں نے اس کی جھولی ہمیشہ بھری ہے۔

ہر چیز سے اس نے لطف اٹھایا ہے۔

باغ کی رنگینیوں سے۔ پھولوں کے رنگ و بو سے سبزے کی لہلہاہٹ سے کچے پھلوں کی بھینی مہک سے! چڑیوں کے چہچہوں سے ——— آسمان پر بکھرے شفق کے رنگوں سے۔ چاند کی ٹھنڈی دلکش چاندنی سے سورج کی ڈوبتی سنہری تھالی سے سمندر کی پُرشور موجوں سے، دریا کی ہلکورے لیتی لہروں سے، پہاڑ کی فلک بوس چوٹیوں اور جھیلوں کی نیلگوں گہرائیوں سے۔ اس زندگی میں ایک ہی سکھ تو نہیں ہزاروں سکھ ہیں۔ ہزاروں راحتیں ہیں کون سی چیز سے اس نے زندگی کو نہیں سجایا؟

مکان میں رچی بسی عافیت کا احساس......

گھر کی ہلکی پھلکی سجاوٹ......

راگ کے سُر......

تصویروں کی لکیریں اور رنگ......

گھرداری کے دل خوش کن احساسِ ذمہ داری.......

کیا یہ سب جھوٹ ہے؟ کیا ان میں زندگی کا سکھ اور راحت نہیں اس نے کیا نہیں پایا......

دنیا کی سیر و سیاحت کے مواقع!!

مقدس مقامات پر عقیدت اور ایمان کو دل کی گہرائیوں سے ابھرتے دیکھ کر! اور مقامات مقدسہ پر سر نیاز خم کرنے کی سعادت پا کر زیارت گاہوں پر آنسوؤں کا نذرانہ پیش کر کے۔

حسین و تاریخی عمارتوں کی عظمت اور دلکشی کو آنکھوں کی راہ دل

میں اتار کر ......

اور ــــــ اور مطالعے کی بے بہا دولت سے!

کتابوں کی رفاقت میں!

کرداروں کی تخلیق کی لذت میں!

کتنی نعمتیں کتنی راحتیں کتنی مسرتیں! اس کی جھولی میں کیا کچھ نہ تھا؟ کیا کچھ نہیں ہے؟

— — — — — — — — —

مگر یہ قہقہے یہ ظالم قہقہے کیوں؟ یہ دل سے ابلتا لہو آنکھوں سے بہتے چشمے کیوں؟

کیا زمانے میں محبت کے سوا اور غم نہیں ہیں؟

کیا اس گھاؤ کے بعد اور پہلے اور زخم نہیں کھائے؟

ہنھ! یہ ننھا سا گھاؤ منا کا داغ ــــــ یہ چھوٹا سا ناسور!

ہنھ۔

غم کے ان پہاڑوں کے سامنے اس کی حقیقت ہی کیا جنھوں نے اس کے سارے وجود کو کچل دیا ہے!

ان جدائیوں کے گھاؤ کتنے گہرے ان پیاروں کی یادیں کتنی جان لیوا ان دوستوں کی محرومی کتنی ناقابلِ برداشت ہے کہ زندگی کتنی اجیرن سنسان اور بے معنی ہو کر رہ گئی ہے!

مگر یہ چٹان ...... دل کی یہ چٹان ان کو بھی سہار گئی ....

— — — — — — — — — —

یہ ہنسی بند کیوں نہیں ہوتی یہ آوازیں کہاں سے چلی آ رہی ہیں۔

خوشیاں، سکون قلب، روح کی سیرابی دل کا چین! راحتیں پھر ..

یہ ذرا سی بات دل میں چبھ کیوں جاتی ہے؟

پتھر کی یہ بھاری چٹان ایک جلبے، ایک منظر، ایک نظر سے حل کیوں جاتی ہے؟ یہ پل بھر میں سارے پربت سارے پہاڑ ساری پٹیاں کہاں غائب ہوجاتی ہیں ——— یہ گھاؤ رسنے کیوں لگتا ہے؟ زخم سے لہو کیوں ابلتا ہے؟ آنکھوں کے سوتے کیوں پھوٹ بہتے ہیں؟ روح میں یہ کانٹا کیوں چبھ جاتا ہے؟ ہنھ بودے بیکار فضول ہیں یہ جھگڑے یہ پٹیاں! یہ پربتیں سب دھوکہ ہیں۔ فریب ہیں تم فریب خوردہ ہو خود اپنے آپ کو فریب دیتی رہتی ہو!

تمھاری روح کی پیاس کبھی نہیں بجھی!

یہ گھاؤ سب سے گہرا گھاؤ ہے ——— یہ جدائی سب سے روح فرسا یہ ناسور ہے.... کبھی نہ بھرنے والا ناسور۔

آہ یہ آوازیں یہ ہنسی درد میں کیوں ڈوبے جارہے ہیں؟ یہ ہنسی گریہ میں کیوں کھوئی ہوئی ہے؟ یہ شور؟ یہ شور بادل سرگوشی کیوں بن گیا ہے؟ کہ........

گھاؤ کوئی نہیں بھرتا..... داغ کوئی نہیں مٹتا..... ناسور مندمل نہیں ہوا کرتا...... غمِ مفارقت۔

آہ کتنی تلخ مگر کتنی سچی حقیقت۔

اس کو کیسے کوئی جھٹلائے کہ محبت سیراب ہوجائے..... جس پیار کی چھاؤں زندگی کو مل جائے۔ جس پیارے کی باہیں گلے کا ہار بن چکی ہوں جس عزیز کی دوستی اور چاہت کا آبِ حیات روح کو سیراب کر گیا ہو۔ اس کی جدائی کے غم میں یہ ٹیک یہ جلن نہیں ہوتی، یادیں ——— پیاری یادیں۔ دلکش یادیں، جینے کا سہارا بن جاتی ہیں۔ اسی یاد کے سہارے پیارے

کے پیاروں کو محبت دے کہ اس کے کاموں میں خود کو کھو کر دل میں وہ تڑپ وہ بیقراری نہیں رہتی، وہ آگ سینے میں نہیں بھڑکتی جو زخم کو بھرنے ہی نہ دے، یہ تڑپ کسک بن جاتی ہے میٹھی پُر لذت کسک اور یہ کسک ہی درد کا درماں بن جاتی ہے مگر ......

مگر جو کانٹا گوشت کے اندر ٹوٹ کر پیوست ہو جائے؟
جو محبت پھلنے پھولنے سے پہلے ہی مٹی میں مل جائے؟
جو پھل ڈالی پر پکنے سے پہلے ہی توڑ کر اچھال دیا جائے ......
جو کلی کھلنے سے پہلے ہی مرجھا جائے؟
ماتما کا جو چاند طلوع ہونے سے پہلے ہی ڈوب جائے
یہ داغ آسمان کے چاند کی طرح ہمیشہ چمکتا رہتا ہے۔
اس گھاؤ میں بھٹی کی سی آگ دہکتی رہتی ہے ......
یہ پیاس روح اور دل کی یہ پیاس ..... ہمیشہ ٹٹیری کی طرح پانی کی تلاش میں بھٹکتی رہتی ہے ......
یہ پپیہا ہمیشہ پی کہاں پی کہاں کی رٹ لگائے رہتا ہے۔
یہ اَن کہے اَن سنے بول جسم و روح کے رشتے میں جڑے ہوئے یہ بول رگ جان میں دوڑنے والے یہ بول ہمیشہ کھٹکتے رہتے ہیں۔
اسی لیے تو کبھی کبھی بہانے بے بہانے اس زخم کا منھ کھل جاتا ہے، پرتیں اکھڑ جاتی ہیں آنکھوں سے چشمے ابل پڑتے ہیں۔

مگر یہ محرومی کے داغ تو ہیں!
ناکامی کے گھاؤ کہاں ہیں؟
ان میں نفرت کی جلن نہیں!
دوسروں کی محبت سے جلنے اور حسد کرنے کی چھوت کی بیماری نہیں۔

یہ خود رحمی کی لعنت نہیں!
یہ گھاؤ نہیں محبت کا دمکتا ہوا چاند ہے۔
یہ زخم نہیں ہاں ممتا کا نکھرا ہوا پھول ہے!
یہ آنسو نہیں پیار کے موتی ہیں!
یہ روح کی پیاس نہیں فن کو مہمیز کرنے والے تازیانے ہیں!
یہ دل کی آگ نہیں فن کا شعلۂ طور ہے!
یہ نارِ نمرود نہیں گلزارِ ابراہیم ہے!
فن کو جلا سکتی ہے!......
یہی تو انسان کو جی جی کر مرنے اور مر مر کر جینے کا گر سکھاتا ہے۔
نہیں نہیں یہ محرومی نہیں.... ناکامی نہیں... مصیبت نہیں عذاب نہیں یہ راحت ہے.... مسرت ہے سکون ہے طمانیت ہے۔

ہنسی دم توڑ چکی تھی طنز کے نشتر کند ہو گئے تھے۔ آوازیں اب بند تھیں ناسور اب رس نہیں رہا تھا زخم لہو نہیں اگل رہا تھا گھاؤ اب سوکھ گئے تھے اب وہ پھر گہری کھائی میں جا چھپا تھا۔

فن کے جادو نے
بھا ہے.......
پیرتیں......
پھر سے جمادی تھیں!

آنسوؤں میں ڈوبی مسکراہٹ میں اب پھر اس کا وجود ڈوب چکا تھا۔
اب وہ پھر اس شعر پر ہنس سکتی تھی ؎

دلے کہ عاشق صادق بود وے سنگ است
میان و عشق و صبوری ہزار فرسنگ است

اُلجھے سُلجھے رِشتے

اپنے سیٹ بالوں کو ہاتھ سے برابر کر کے دبیز سلک کی ساڑھی کے پلّوں کو درست کیا، چہرے کے میک اپ پر تنقیدی نظر ڈالی، ہیرے کے ٹاپس، لاکٹ اور چوڑی پہنی، گھوم کر اپنے سراپا کو دیکھا ــــ تو مسکراہٹ اس کے گداز ہونٹوں پر ابھر آئی ــــ وہ آج بھی "بے بی" سے زیادہ جوان، زیادہ تندرست، زیادہ حسین لگتی ہے ..... ویسے اس میں اور "بے بی" میں ۱۷-۱۸ سال ہی کا تو فرق ہے۔ مگر وہ ...... بے چاری تو ۲۸-۲۹ سال کی عمر میں ادھیڑ سی لگنے لگی ہے۔ تنگ دستی، پریشانی، روز روز کے بچے اور سسرال کی بک بک جھک جھک جو بھی نہ ہو تھوڑا ہے ...... ایک نامعلوم سی آہ اس کے سینے سے ابھری۔ مگر اندر ہی اندر دم توڑ گئی ...... "یہ آہیں ...... یہ افسردگی ... یہ کوفت!" "نہیں نہیں، یہ اس کی صحت، اس کی خوبصورتی، اس کی شگفتگی کے لیے زہر ہے۔" وہ کہتے ہیں خوش رہا کرو، تمہارا مسکراتا چہرہ، ہنستی آنکھیں، تمہاری سیرت کا جزو ہیں!۔ اوہ آج بھی ان کی آنکھوں میں اسے دیکھ کر، پریم کی جوت دمک اٹھتی ہے۔ آج بھی ان میں وہی گرم جوشی، وہی گہرائی ہے۔ نہیں تو بیس برس۔ سات ہزار تین سو دن، کتنی طویل مدت ہوتی ہے ــ کیا کچھ نہیں ہو جاتا بیس برس میں .....

اور آج ان کی رفاقت کی بیسویں سالگرہ ہے۔ آج دونوں نے اکٹھے

فلم دیکھنے کا فیصلہ کیا ہے، پھر شام کو کسی اچھے ریسٹورنٹ میں کھانا کھائیں گے اور رات کو بھی وہ یہیں رہیں گے۔ ۔ ۔ ۔ مگر "بے بی" و ادشوا سے بھی آج ہی آنا تھا۔ اور پھر آتے ہی دونوں میں جھڑپ ہو گئی! ہمیشہ ہی ہو جاتی ہے۔ جب بے بی نہیں آتی تو وہ تڑپتی رہتی ہے اور جب آ جاتی ہے تو دونوں جھگڑتی ہیں۔

۔ ۔ ۔ ۔ "بے بی" نے کبھی اسے معاف نہیں کیا۔ دس سال کی عمر سے وہ اس سے لڑتی رہی ہے۔ اپنی ماں سے ۔ ۔ ۔ ۔ اس ماں سے، جس نے اپنا مہر، اپنا جہیز، زیور، اپنا ہر حق اس کی خاطر چھوڑ دیا تھا۔ اور اس کے باپ سے علاحدگی کے وقت صرف اسے مانگا تھا۔ جب وہ صرف سات سال کی بچی تھی! مگر اس کا بدلہ کیا ملا؟ اسے الٹی ماں سے چڑ ہو گئی اور "ان" سے تو نفرت ہی کرتی ہے۔ وہ جو اسے اتنا چاہتے ہیں۔ اتنا سب کچھ اس کے لیے کرتے رہے۔ اس نے کبھی انھیں بابا تک کہہ کر نہ دیا۔ "انکل" وہ بھی مجبوری کو کہتی ہے، جیسے اس کے حلق میں یہ لفظ پھنس رہا ہو ۔ ۔ ۔ ۔ اور پھر ۵ برس بعد ایک دن وہ اسکول سے اپنے باپ کے پاس چلی گئی اور لاکھ بلانے پر بھی واپس نہ آئی۔ باپ نے سترہ اٹھارہ سال کی بچی کا بیاہ کر دیا، اس مجہول اسکول ماسٹر سے جس کی کل چار سو روپے تنخواہ ہو گی ہے۔ اتنے روپے تو اس کا باورچی اور ڈرائیور لے جاتے ہیں۔ سستی سوتی ساڑھی، روکھے بال، دبلی، سوکھی ۔ دیکھ کر ہی جی جل جاتا ہے مگر صاحبزادی کہتی ہیں وہ خوش ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ خوش قسمت ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ اسے میاں کا پیار، بچوں کی الفت، گھر کی عافیت میسر ہے۔ کسی زندگی میں اس سے بڑھ کر کیا چاہیے۔

وہ جا کر کھڑکی میں کھڑی ہو گئی۔ "وہ ابھی تک آئے کیوں نہیں، شاید کوئی مریض آ گیا ہو گا۔" اس کی نظریں سڑک پر گزرتے ٹریفک پر جمی ہوئی تھیں اور ذہن پچھلے بیس سال کی پرچھائیوں میں بھٹک رہا تھا۔

"ڈاکٹر صاحب ذرا کہیے ۔ ۔ ۔ ۔" ان کے کولیگ ڈاکٹر راہول نے آواز دی "کیوں بھئی کیا بات ہے" "میں ذرا جلدی میں ہوں کوئی مریض ہے تو

تم دیکھ لو۔" "سیریس کیس ہے وہ آپ کو بلانے پر اصرار کر رہے ہیں۔"

"کیا مصیبت ہے، مجھے آج وہاں ذرا جلدی جانا تھا۔" وہ جانتے تھے کہ ڈاکٹر راہول وہاں کا مطلب جانتے ہیں۔

آپ راستے میں دیکھتے ہوئے چلے جائیے زیادہ دیر نہ ہوگی۔" ان کے دوست نے تسلی دی! مگر دیر تو ہو ہی گئی۔" اب وہ تیزی سے کار چلا رہے تھے۔ دل کی دھڑکن اور کار کی رفتار ہم آہنگ ہو چکی تھی...... وہ مجھے ہمیشہ منع کرتی ہے کہ کار تیز نہ چلایا کیجیے۔ مگر عادت..... عادت کہاں چھوٹتی ہے۔ تو کیا... کیا وہ بھی عادت ہے؟ نہیں نہیں وہ عادت نہیں..... وہ تو ان کی محبوب ہے.. رفیق ہے.... دوست ہے..... ان کی جان ہے، کیا نہیں دیا اس طویل زمانۂ رفاقت میں اس نے مجھے.... تن..... من..... اس نے اپنے خاندان کی پروا نہ کی...... سماج کی بندشوں کو ٹھکرا دیا..... طلاق کا دھبّہ اپنے دامن پر لگایا..... مذہب کے رواجی دستوروں کی پروا نہ کی..... صرف ان کی محبت کی خاطر۔ ان کی چاہ میں اس کی جوانی ڈھل گئی۔ سیاہ، گھنے، لمبے بال سفید ہونے لگے۔ غلافی آنکھوں کے گرد جھریوں کا باریک جال بن گیا...... مگر اسے پہننے اوڑھنے، بننے، سجنے کا کیا سلیقہ ہے۔ آج بھی وہ اتنی ہی دلکش، ویسی ہی حسین لگتی ہے۔ اس کی گفتگو میں وہی شیرینی..... مسکراہٹ میں وہی لطافت، مزاحیہ جملوں اور لطیفوں میں وہی دلچسپی موجود ہے، جو بائیس برس پہلے تھی۔ بائیس سال..... کیسے یہ زمانہ بیت گیا..... جیسے وہ کل ہی میری بنی ہو۔"

کار کی رفتار بڑھ گئی تھی، دل کی حرکت اور کنپٹیوں کی رگیں..... ایک ہی ساز پر دھڑک رہی تھیں......

بائیس سال پہلے —— انھوں نے پہلی بار اسے دیکھا تھا۔ ایک گھبرائی، شرمائی، کچھ الجھی بکھری سی لڑکی، زنانہ سکنڈ کلاس سے اتر کر چاروں طرف کسی کو تلاش کر رہی تھی —— ویسے اسے لڑکی کہا جا سکتا تھا نہ عورت وہ ایسی

کلی تھی جو پھول نہ بن سکی تھی ــــ اور انھیں ایسا لگا، جیسے وہ انھیں کو ڈھونڈ رہی ہو۔ جیسے ان کی نظروں کو اس نے باندھ لیا ہو ــــ وہ چالیس سال کے باوقار ڈاکٹر جن کی شہر میں شہرت بھی تھی اور عزت بھی۔ ایک پینتالیس سال کی فربہ اندام مالدار۔ طنطنہ والی بیوی کے شوہر ــــ چار سیانے بچوں کے باپ ــــ اور اس لڑکی کو دیکھ کر ــــ یہ دل کیوں اس طرح دھڑک اٹھا تھا؟

" بی بی آپ کہاں جائیں گی؟" وہ اچانک اس کے پاس جا کر پوچھ بیٹھے تھے اس نے گھبرا کر انھیں دیکھا۔ " جی میں اپنی کزن سے ملنے آئی ہوں، مگر مجھے لینے تو کوئی آیا ہی نہیں۔" اس کی سیاہ آنکھوں میں ہرنی کی سی وحشت تھی۔ وہ اس کی کزن کے واقف کار نکلے، وہ بھلا کس کو نہیں جانتے تھے شہر میں! اور کون ان سے واقف نہ تھا۔ ایک جھٹکے سے انھوں نے تیز رفتار کار کو بریک لگایا تو وہ منھ کے بل گر پڑے۔

" شکر ہے حادثہ نہ ہوا۔"

مگر حادثہ تو ہو چکا تھا ــــ بائیس برس پہلے ہو چکا ــــ وہ پھر اپنے وطن واپس نہیں گئی۔ اپنے کر یک بددماغ میاں سے علاحدگی ہو گئی اور پھر ہمیشہ کے لیے ان کی بن گئی۔ ناکام شادی شدہ زندگی نے اسے مرجھا دیا تھا۔ ان کی محبت کی چھاؤں پا کر وہ پھر لہلہا اٹھی۔ اب وہ بلبل کی طرح چہکتی، پھولوں کی طرح ہنستی، عطر کی طرح مہکتی اور تتلی کی طرح اڑتی پھرتی تھی۔ اور اس کی وجہ سے ان کی بے کیف، بے مزہ زندگی میں بھی محبت کا پھول کھل اٹھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے دوست، محبوب ساتھی، سب کچھ تھے۔ انھوں نے اسے ملازمت دلوائی۔ اچھا گھر خرید کر دیا۔ نوکر چاکر، کار، فون، سب ہی کچھ دیا۔ کیا ہوا اگر وہ کھلم کھلا اسے اپنا نام نہ دے سکے۔ جاننے والے جانتے ہی ہیں کہ ان کی وہ بیوی ہے۔ مجبوریوں کی وجہ سے وہ سماج میں اسے بیوی کی حیثیت سے روشناس نہ کرا سکے۔ مگر..... اور تو کسی بات میں کوتاہی نہیں کی۔ عورت کو سکیورٹی چاہیے، محبت چاہیے.....

مگر ان کے دل میں ایک ٹیس سی اٹھی۔ "وہ ایک بچہ چاہتی تھی۔ بچہ جو ان دونوں کی پیار کی نشانی ہوتا ــــ "بے بی" نے ہمیشہ اسے دکھ ہی دیا۔ بچپن میں وہ ماں سے کتنی مانوس تھی، مگر جوں جوں بڑی ہوتی گئی، دور ہوتی چلی گئی۔ خود مجھ سے اسے ہمیشہ نفرت رہی، اسی لیے تو وہ ہم دونوں کی پیار کی نشانی چاہتی تھی، مگر ــــ وہ بھی کیا کرتے۔ انھوں نے اسے کھلم کھلا نہیں اپنایا تھا۔ بچے کو وہ آخر کس کا نام دیتی! ان کی مجبوریاں یا بزدلی۔ خود غرضی یا بے حسی، اسے اپنا نام دینے سے مانع تھی؟

" اف خدایا یہ میں نے کیا کیا ــــ کیا کیا یہ میں نے؟ مجھے بہادری سے حالات کا مقابلہ کرنا چاہیے تھا۔ کوئی میرا کیا کر سکتا تھا۔ میں شہر کا سب سے بڑا اور مشہور ڈاکٹر، ہزاروں روپے کی پریکٹس ہے ...... سماج؟ اونہہ سماج میرا کیا کر سکتا تھا! ہم سماج کو بناتے ہیں، سماج نے ہم کو نہیں بنایا۔ مگر پھر بھی اس دنیا میں رہ کر سماجی بندشوں کا پاس تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ لیکن اس نے تو ان کے لیے کسی بندش کا خیال نہیں کیا۔ انھیں اس سے کھلم کھلا شادی کرنی چاہیے تھی۔ بیوی؟ ...... وہ اپنی جائداد ہی تو لے لیتی، میرا کیا بگڑ جاتا۔ پیسے کی مجھے کیا کمی ہے؟ خاندان ..... بیٹے بیٹیاں ...... پھر اگر ان کی پروا تھی تو اس غریب کو کیوں اپنایا اور اس نے تو مجھے سب کچھ دیا۔ اپنی بیٹی تک کو بیگانہ بنا لیا میری خاطر۔ مانا کہ اس کا ضمیر مطمئن ہے۔ اپنے خالق کے سامنے، اپنے ضمیر کے سامنے ہم نے ایک دوسرے کو اپنایا تھا۔ مگر کیا میں خود؟ میں نے خود جرأت کیوں نہیں دکھائی۔ اگر مجھے کچھ ہو گیا۔ کچھ ہو گیا تو اس کا کیا ہوگا؟ بیٹی بھی تو اس کو سہارا نہ دے گی۔"

ان کے دماغ کی رگیں اتنے زور زور سے پھڑک رہی تھیں کہ جیسے اب پھٹ جائیں گی۔ مجھے جلد سے جلد اس کے پاس پہنچنا چاہیے۔ وہ منتظر ہوگی آج ہم اکٹھے رہیں گے اور آج میں ضرور کوئی فیصلہ کروں گا۔ اب میں اسے کھلم کھلا اپناؤں گا۔ اس کے مستقبل کے لیے ......" گاڑی کی رفتار اور تیز ہو گئی ٹیلیفون کی گھنٹی بجے جا رہی تھی ــــ اور وہ ہر بات سے بے خبر باہر

سڑک پر نظریں جمائے کھڑی تھی!

"ارے ممی فون بجے جا رہا ہے۔ آپ کو خبر ہی نہیں" بیٹی نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا اور ریسیور اٹھا لیا۔ "جی ..... جی ہاں ..... کیا کیا؟ کیا کہا؟ نہیں ..... نہیں ....." اس کی چیخ سن کر اس کی ماں پلٹی "بے بی۔ بے بی کیا ہوا؟ کس کا فون تھا۔" بے بی کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ منہ سے بول نہ نکل رہے تھے ....."

کس کا فون تھا؟" وہ چیخی۔ "ڈاکٹر راہول کا۔" آہستہ سے بے بی کے منہ سے نکلا اس نے لپک کر بیٹی کے ہاتھ سے ریسیور چھین لیا تھا مگر لائن کٹ چکی تھی۔

"بولتی کیوں نہیں! ہوا کیا ——" وہ پھر چیخی۔

"ممی ممی آپ ذرا ہمت سے کام لیں۔ انکل یہاں آ رہے تھے مگر ان کی موٹر کا ایکسیڈنٹ۔"

"کیا بک رہی ہو" وہ بے اختیاری میں چلائی۔

"ہاں ممی ..... ان کو ان کے گھر لے گئے ہیں۔" گھنٹی پھر چیخی، بیٹی سے پہلے ماں نے جھپٹ کر ریسیور اٹھا لیا۔ بے بی نے بھی کان لگا یا۔

"جی ..... میں ..... میں راہول ہوں —— ڈاکٹر صاحب؟

جی ہاں وہ بے ہوش ہیں —— پہلے آپ کا نام پکار رہے تھے ..... مگر اب ..... اب"

"میں آ رہی ہوں —— آ رہی ہوں" مجنونانہ انداز میں ریسیور پھینک کر وہ باہر بھاگی —— بیٹی نے ریسیور تھام لیا "ڈاکٹر صاحب۔ سچ بتائیے انکل زندہ تو ہیں نا؟"

"ہاں، مگر بے ہوش ہو چکے ہیں —— برین ہیمرج ہے۔ اپنی ممی کو روک لیجئے۔ وہ یہاں نہ آئیں اب کیا کریں گی آ کر —— میں نہیں چاہتا —— ان کی کوئی انسلٹ کرے ....."

ڈاکٹر راہول کی آواز گلوگیر ہو گئی، بے بی نیچے بھاگی۔ ممی بار بار کار اسٹارٹ

کر رہی تھی مگر لرزتے ہاتھ کام نہ کر رہے تھے۔ اس نے دروازہ کھولا اور ماں کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"ممی نہ جائیے۔"

"میں ضرور جاؤں گی۔ تم کون ہو مجھے روکنے والی؟" اس کی آواز میں وحشت تھی غصہ تھا۔

"ممی اس گھر کے دروازے کل بھی آپ پر بند تھے، آج بھی بند ہیں....."

اس کی آواز میں صدمہ تھا — دکھ تھا — طنز تھا۔

"وہ مجھے پکار رہے ہیں۔ میں ضرور جاؤں گی۔"

"ممی اب تو انکل بیچارے بے ہوش ہیں۔ اب تو وہ آپ کو شیلڈ بھی نہیں کر سکتے۔ ہائے ممی کبھی آپ نے نہ سوچا....."

وہ بیٹی کی طرف پتھرائی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ اسے لگا، یہ بے بی نہیں۔ اس کی بیٹی نہیں۔ ماں ہے۔ — ماں جس نے اسے پالا تھا۔ جس نے اسے اخلاق کا، مذہب کا، سماجی قدروں کا پالن کرنے کا درس دیا تھا۔ اور جس سے بچپنے کے لیے شریر بچے کی طرح ماں کی گود سے نکل کر وہ باہر گلی میں کھیلنے کے لیے نکل گئی تھی۔

"ممی ممی ہوش میں آئیے۔"

"میں جاؤں گی، ضرور جاؤں گی۔ وہ مجھے بلا رہے ہیں۔"

"اب وہ کسی کو نہیں بلا رہے ممی — وہ بے ہوش ہیں۔ برین ہیمبرج۔"

"ہائے اب دنیا میں — میرا کوئی نہیں....." آواز تھی کہ کسی ٹوٹے ساز کی چیخ۔

"ممی ہوش میں آئیے — ممی میں — میں تو آپ کی ہوں —"

ویران ویران نظروں سے وہ بیٹی کو دیکھتی رہی۔ چہرے کی تابانی ختم ہو چکی تھی، آنکھوں کے گرد جھریوں کا جال تن گیا تھا۔ بالوں کی دمک ماند پڑ گئی تھی۔

سرکش، مغرور، رعب اور شان والی ممی کہاں ہے۔ کہاں ہے وہ ممی جو اس پر رحم کھاتی تھی، اس کو کمتر سمجھتی تھی؟ — کہاں ہے وہ، ایک بے کس مجبور شکست خوردہ وجود اس کے بازوؤں میں پڑا تھا.....

▲▲

ایک سوال

کسی اور جگہ میں اسے دیکھتی تو جانے کیا سمجھتی مگر ایک ہاتھ میں جھاڑو دوسرے میں پوچا کرنے کا جھاڑن اور کوڑے کی بالٹی۔ شبہ کی گنجایش ہی کہاں تھی۔
آنٹی نے ذرا ٹیڑھی نظروں سے اسے دیکھا" بہو تو پھر آج دیر کر کے آئی ہے ؟" شریف گھرانوں میں جو کمین " کی بھی عزت کرنے کا " شرف " رکھتے ہیں جمعدارن کے لیے لفظ " بہو " مروج ہے۔ وہ اسی برس کی بڑھیا ہو تب بھی اسے " بہو " کہا جاتا ہے۔ اور رہتی بھی وہ بہو ہے۔ یہ لمبا ہاتھ بھر کا گھونگھٹ اور سر سے پیر تک چاندی، وہ بھی نہ میسر ہو تو گلٹ ہی کے زیوروں سے لدی ہوئی!
مگر یہ " بہو " عام بہوؤں سے مختلف تھی۔ نہ چہرے پر گھونگھٹ نہ ڈھیروں زیور۔ بس ہاتھ میں چار چار چوڑیاں، کانوں میں بندے اور گلے میں ذرا پتلی سبک سی ہنسلی۔ ہاں پیروں کی انگلیوں میں بچھوئے اور ناک میں سونے کی کیل۔ سہاگ کی نشانی!
"کیا کروں ماں جی۔ بچی کو بخار آ رہا ہے۔ رات تو جانے اس کا جی کیسا ہو رہا تھا۔ ساری رات گود میں لیے بیٹھی رہی!"
ارے اس کی صورت اور وضع قطع ہی نہیں لب ولہجہ، اندازِ گفتگو بھی بڑے گھروں کی بہو بیٹیوں جیسا ہے۔ میں حیران حیران سی اسے دیکھے جا رہی تھی۔ اس

نے ذرا سا مسکرا کر میری طرف دیکھا تو اس کے موتیوں کی لڑی جیسے دانت دمک رہے تھے۔

"اماں جی ـــــ یہ کون ہیں۔ کہاں سے آئی ہیں؟"

"یہ میری بھانجی سمان ہے۔ بہو۔ اس کی ماں اور ہم دونوں گہری سہیلیاں تھے۔ تیری دلی سے آئی ہے۔ کہانیاں لکھتی ہے۔"

آنٹی نے بڑے فخر سے میری طرف دیکھا۔ انھیں اس پر بڑا ناز تھا کہ ان کے قصبے کی بیٹی کہانی کار ہے۔ وہ ویسے میری کہانیاں پڑھتی نہیں تھیں۔

"اچھا جی ـــــ دلی سے آئی ہو آپا جی؟" اس نے اشتیاق سے پوچھا گویا میری کہانیوں کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ "میرا بھی دلی جانے کو بڑا جی چاہتا ہے بی بی ـــــ"

"تو میرے ساتھ چلی چلنا۔" میں نے کہا تو دم بھر کے لیے خوش ہو گئی۔ پھر اداسی سے بولی۔ "اجی ہم لوگوں کو کہاں چھٹی ملے ہے۔ مرنے کی بھی فرصت نہیں۔" اور آنٹی کی کڑک دار آواز پر وہ گھبرا کر مڑ گئی۔

"بس بہت بک بک ہو چکی اب کام کر۔ کل سے گھر گندا پڑا ہے۔"

"اچھا اماں جی اچھا ـــــ بی بی جی ـــــ تم ابھی رہو گی نا ـــــ"

چلتے چلتے اس نے پوچھا۔ میں بہت دن بعد اپنے قصبے میں ذرا سکون کی تلاش میں آئی تھی ـــــ کچھ لکھنا پڑھنا بھی چاہتی تھی۔ میں نے کہا "ہاں ابھی دس پندرہ دن تو ہوں ہی۔"

میں اسے دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ کیا پھرتی اور صفائی تھی۔ دم میں ادھر دم میں اُدھر۔ یہ کمرہ صاف کیا وہ کمرہ صاف کیا۔ برآمدے میں جھاڑو لگائی۔ سب جگہ "پوچا" کیا، صحن میں جھاڑو دی اور پیچھے آدھ گھنٹے میں سارا گھر چندن کر دیا۔ بارہ تیرہ برس کی ایک نازک سی لڑکی اس کے ساتھ ساتھ کام کرا رہی تھی اور وہ برابر اسے سکھاتی جاتی تھی۔ "یوں نہیں دوں۔ دوں نہیں یوں ـــــ

جی جان سے کام کرنے سے کوٹھیوں والے خوش ہوں ہیں بیٹی۔" میں نے دیکھا کہ وہ بہت باتونی ہے مگر اس کی باتوں میں ایک رس تھا، لہجہ میں ایک کھنک تھی۔ یہ مہترانی ہے یا کسی اچھے گھر کی پڑھی لکھی کارگذار عورت؟

کئی دن گزار گئے۔ وہ آتی۔ مجھے دیکھتی، مسکرا کر دو چار باتیں کرتی۔ اس کی میری خاصی دوستی ہو گئی تھی۔ ایک دن بولی "بی بی میری کہانی بھی لکھو گی؟" میں نے ہنس کر اسے دیکھا۔ یہ سوال تو کہانی کار سے سبھی کیا کرتے ہیں۔ پھر اس کے چہرے پر ایک سایہ سا آیا اور گزر گیا۔ "بڑی دردناک ہے بی بی میری کہانی" اور جیسے آنسو چھپانے کو جلدی سے کاموں میں لگ گئی۔

کون اسے دیکھ کر یہ کہہ سکتا تھا کہ وہ چھ بچوں کی ماں ہے۔ اس کا لمبا سیدھا قد، قدرے بھرا بھرا جسم جس کے نشیب و فراز کافی پرکشش تھے، سرخ مائل سنہری رنگت، بڑی بڑی شربتی آنکھوں پر سیاہ دراز پلکوں کا سایہ اور کیوپڈ کی کمان کے سے ترشے ہوئے گلابی ہونٹ! کتنی شباہت تھی اس میں اور چغتائی کی تصویروں میں!

اور میں سوچتی رہتی۔ یہ حسن، یہ جوانی، یہ دلکشی۔ کیا وہ مقابلۂ حسن میں جائے تو اسے ملکۂ حسن چنا نہ جائے گا؟ کیچڑ میں کنول۔

وہ سب کام کاج نبٹا کر دس پندرہ منٹ میری کرسی کے برابر زمین پر پھسکڑا مار کر بیٹھ جاتی اور مجھ سے دلی اور بمبئی کی باتیں پوچھا کرتی۔ اسے دلی اور بمبئی دیکھنے کی بڑی تمنا تھی۔ ہمارا قصبہ دلی سے کچھ زیادہ دور نہ تھا مگر اسے کبھی فرصت ہی نہ ملی کہ اپنی ماں کے میکہ جا کر اس کی بہار دیکھتی۔ "بی بی میری ماں خاص دلی کی تھی۔ ایسی زبان بولتی تھی کہ بس اس کا منہ دیکھتے رہو۔ لوگ کہتے پھول ورتی کے منھ سے پھول جھڑتے ہیں۔" پھر وہ ہنس پڑی۔ "گالیاں بھی اس کے منھ سے بری نہ لگیں تھیں لوگوں کو۔"

"اور تمھاری گالیاں؟"

"توبہ بی بی جی، میں گالی نہ بکوں ہوں۔ وہ تو ماں کو کبھی غصہ آجاوے تھا تو بک دے تھی۔ ایک دفعہ کی بات سناؤں..... بڑی خوبصورت تھی میری ماں..... اور بڑی ستی ساوتری....."

"بس جیسی تم ہو....."

"اجی آپ تو مجھے چھیڑتی ہیں بی بی جی۔ بھلا کہاں میں کہاں وہ —— تو بی بی ایک بار کسی ججمان نے۔ اونچی جات کا ایک ادھیڑ مرد وہ تھا اور بڑا پیسے والا تھا —— اپنی ڈیوڑھی میں اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ارے بی بی ماں نے گو کا بھرا ٹوکرا اس پر ہی الٹ دیا اور ایک ایک زبان میں ہزار ہزار باتیں سنا ڈالیں۔ کہے تھی مہینوں وہ مردوا گھر سے نہیں نکلا۔ اور اس کی جوروا سے چھوڑ کر میکے جا بیٹھی ——" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ کیسی جھنکار تھی اس کی ہنسی میں۔

"اب سمجھ میں آیا یہ سندرتا، یہ لب و لہجہ اور یہ کبر کر تمہیں ماں سے ورثہ میں ملا ہے —— ؟" میرا اس سے تو سے بات کرنے کا ہیاؤ نہیں پڑتا تھا۔

اس نے کچھ شرما کر کچھ دکھ سے کہا —— "ارے بی بی یہ سندرتا تو میرے لیے بلا ہو گئی ہے۔ بھگوان نے بدصورت بنایا ہوتا تو مجھے اتنے دکھ نہ جھیلنے پڑتے۔ اب تم ہی بتاؤ بی بی میں ٹھہری کام کرنے والی عورت —— پورے دس گھروں میں کام کرنا پڑے ہے بی بی۔ اب کیا ہر گھر سے مردوؤں کو نکالا دلوا دوں؟ مگر وہ جو ہے تمہارا جمعدار۔ اس کمبخت کا منھ ہی سیدھا نہ ہوئے۔ میری تنخواہ کے آدھے پیسے دارو شراب میں اڑا دے ہے۔ پوچھو دس جنوں کا خرچا۔ کیسے پورا کروں۔ مگر اسے کیا مطلب۔ بس ہم سے شک کرتا رہے ہے۔" اس کی شربتی آنکھیں آنسوؤں میں ڈوب گئیں! اور پھر وہ جیسے گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ "ابھی تو اور کئی گھروں میں جانا ہے۔ ہر جگہ پھٹکار پڑے گی۔ اور یہ جا۔ وہ جا۔

کیا کبھی ان لوگوں کی حالت بدلے گی؟ ہمارے بڑے بڑے ترقی اور

مساوات اور برابری کے حامی لکھکوں نے اس طبقے پر بھی لکھا ہے۔ نظمیں بھی کہی ہیں۔ مگر کیا لکھا؛ ان کے حسن۔ ان کی جوانی۔ ان کی کشش کا بکھان کیا۔ مگر سچے دل سے، گہری نظر سے کیا کبھی ان کا دکھ دیکھا؟ سمجھا؟ محسوس کیا —— کبھی کہ یہ لوگ کیسی زندگی گزارتے ہیں؟

اور میں انھیں خیالات میں گم بیٹھی رہی اور سامنے میری کتاب کے ان لکھے ورق ہوا میں پھڑپھڑاتے رہے۔

اس دن میرے گھر پر ایک میٹنگ تھی ...... شام کو پبلک جلسہ تھا اور اس میں ہم سب کو بولنا تھا۔ عورتوں کی حالت پر، ان کے حقوق پر۔ ان کے کارناموں پر۔ خواتین کا بین الاقوامی سال ہے نا۔ بھلا ہمارے قصبے کی عورتیں کیوں پیچھے رہتیں —— اور پھر اور کچھ ملے یا نہ ملے اس بہانے اخباروں میں نام اور شاید تصویریں تو آ ہی سکتی ہیں۔

بحث زوروں پر ہو رہی تھی۔ ایک کا خیال تھا کہ دنیا کو اب عورتوں کے سامنے جھکنا ہی پڑے گا۔ دوسری کہہ رہی تھی۔ "اجی ہونے ہو نے سب ملکوں کی حکومت عورت کے ہاتھ میں آجائے گی۔" تیسری کا کہنا تھا کہ دنیا سے جنگ اور خون خرابا تبھی ہٹ سکتا ہے، جب سیاست عورت کے ہاتھ میں ہو۔ آنٹی کا بڑا بیٹا سب پر فقرے کس رہا تھا۔ "ارے عورتوں سے زیادہ کون جھگڑالو ہو گا۔ دیکھنا ایک کا جھونٹا دوسرے کے ہاتھ میں نہ ہو تو؟" اور آنٹی ہاں میں ہاں ملا رہی تھیں "اور کیا —— ہم عورتیں بھلا حکومت وکومت سیاست ویاست کیا جانیں؟" اور چاچا جی ایک طرف بیٹھے حقہ گڑگڑاتے پوپلی ہنسی ہنس کر بولے "اجی مرغی اذان دیتی بھلی نہ لگے ہے۔" یہ کہہ کر وہ ہر اس عورت کی توہین کر تے تھے جو گھر سے باہر کے کسی کام میں حصہ لیتی تھی۔ "ہاں بابا۔ عورت تو گھر ہی میں اچھی لگتی ہے۔" بیٹے نے ہاں میں ہاں ملائی اور مسکرا کر مجھے دیکھا۔ "مگر خدا بچائے ان قلم کے سپاہیوں سے۔ ہمیں تو بس ان سے ڈر

لگتا ہے۔" میری جان پہلے ہی جل رہی تھی اس کی باتیں اور بھی زہر لگیں مگر میں
چپ رہی۔ میرا ذہن جانے کہاں بھٹک رہا تھا۔
عورت۔ عورت۔ عورت۔ عورت سے ان کا مطلب کیا ہے؟ کیا
صرف اپر کلاس کی تعلیم یافتہ، اپٹوڈیٹ اور الٹرا ماڈرن عورت، عورت ہے؟
یا مڈل کلاس کی پڑھی لکھی عورتیں جو کالجوں اسکولوں میں پڑھتی اور پڑھاتی ہیں،
سیاسی اور سماجی کام کرتی ہیں۔ مردوں سے اپنے حقوق مانگا کرتی ہیں۔ (ملیں
یا نہ ملیں اس سے بحث نہیں) وہ عورت ہیں؟ کیا صرف ووٹ کا حق مل جانا
عورت کے لیے کافی ہے؟ یا حکومت میں بڑے بڑے عہدے چند عورتوں کو
مل جائیں تو ہم سر اونچا کر کے کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے دلیس میں عورت کو سب
حق مل گئے ہیں؟ آخر ہم کس کے حقوق کے آوازیں بلند کر رہے ہیں؟ کیا
قصبوں اور دیہاتوں کی ان عورتوں کے لیے جن تک ابھی علم کی روشنی پہنچی
ہے نہ اپنے حقوق کا انھیں احساس ہے؟ کیا ہم کسان اور مزدور عورتوں کے
لیے اس بین الاقوامی خواتین سال میں کام کر رہے ہیں —— کیا یہ عورت
عورت نہیں —— مگر ہم اس کے لیے کیا کر رہے ہیں —— وہ اپنے
لیے کیا کر سکتی ہے؟ بکھرے الجھے بہت سے سوال میرے ذہن میں گونج
رہے تھے۔ ہمیشہ ہی گونجا کرتے ہیں۔

"تم کیوں چپ ہو؟" ایک دوست نے چھیڑا۔

"کسی کہانی کا پلاٹ سوچا جا رہا ہوگا۔" دوسری نے فقرہ کسا!

"اجی افسانہ نگار ٹھہریں —— ہم میں سے کسی کی خیر نہیں ——!"
بھائی نے چھینٹا اڑایا۔ میں جواب بھی نہ دے پائی تھی کہ آنٹی کی پاٹ
دار آواز گونجی ......

"بہو پر آج پھر کوئی مصیبت ٹوٹی ہے —— ایک بجنے والا ہے۔
اب تک نہیں آئی۔"

اور ایک بجنے کی خبر پر سب چونک پڑیں۔ شام کے جلسے میں شرکت کرنا اور انتظام کرنا تھا چند منٹ میں سب مہمان رخصت ہو گئے مجھے پھول رانی کی فکر تھی۔ آج کیوں نہیں آئی ——— !

اس کا سر جھکا ہوا تھا، سوتی میلی ساڑھی پر جگہ جگہ خون کے دھبے سوکھ کر کتھئی ہو گئے تھے۔ منہ سوجا ہوا ——— آنکھیں متورم اور ہونٹ ذرا سا زخمی۔ میں دھک سے رہ گئی۔ کیا ہوا پھول رانی کو؟

آنٹی نے اس پر برسنا شروع کر دیا مگر وہ بغیر جواب دیے، سر جھکائے جھاڑو لگاتی رہی۔ میں کمروں میں اس کے ساتھ ساتھ گھوم رہی تھی اور وہ مجھ سے آنکھیں چرا رہی تھی۔ آخر میں رہ نہ سکی۔

"کیا بات ہے پھول رانی۔ خیریت تو ہے نا؟"

اس نے جھاڑو ایک طرف ڈال دی اور دھپ سے زمین پر بیٹھ گئی۔ ایک غرور، ایک ناز، ایک شان جو اس کی شخصیت کا جزو تھی آج غائب تھی۔ (جی ہاں "شخصیت"۔ میں سمجھتی ہوں کہ "شخصیت" صرف پیسے والوں، علم والوں ہی کی ملکیت کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔) اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ یہ ایک مسلی، کچلی، مظلوم ہستی تھی۔ میری دوست پھول رانی نہیں۔

"بچے تو اچھے ہیں نا؟" میری سمجھ میں یہی آیا کہ کوئی بچہ سخت بیمار ہے یا ....

"بی بی۔" اس نے روتے ہوئے کہا۔ "بچے کو چار دن سے بخار آ رہا ہے تم جانو ہزاروں ارمانوں، گنڈے تعویذوں، منتوں، مرادوں کے بعد تو یہ بچہ ہوا ہے ——— جب بھی لڑکی ہوتی ان کا باوا مارنے مرنے پر تل جاوے تھا کہ مجھے بیٹا چاہیے اور تو بیٹی جنے جاوے ہے۔ جیسے یہ بھی میرا دوش تھا۔" وہ زارزار رو دی۔ اور میں سوچنے لگی اسی کے طبقے پر کیا منحصر ہے یہ حماقت تو بڑے بڑے پڑھے لکھے روشن خیال لوگ تک کرتے ہیں۔

"بی بی دو برس پہلے بھگوان نے یہ بھونسڑا دیا ــــــ اس کی بیماری مجھے پاگل سا کر دے وے ہے ــــــ کل سے بخار تیز تھا ــــــ سارے دن کام کیا اور رات بھر اسے لیے بیٹھی رہی۔ اس نے رو رو کر سارا گھر سر پر اٹھا لیا....."

"مگر یہ خون کے دھبے" اور اچانک میرے ذہن میں کوندا سا لپکا اس کے میاں نے مارا تو نہیں اسے؟

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی.... "بی بی یہ کون نئی بات ہے۔ روز ہی وہ مجھے مارے ہے ــــــ"

اور پھر ہچکیوں کے درمیان وہ اپنی بپتا سنانے لگی ــــــ!

"روز ہی دھنک کر رکھ دے ہے موا ــــــ نہ کمانے کا نہ دھمانے کا ــــــ مسٹنڈا بیٹھ کر کھاوے ہے ــــــ چودہ برس کی بیاہی آئی تھی۔ سولہ سترہ برس بیاہ کو ہو گئے۔ سات دن بعد یہ جھاڑو پوچا ہاتھ میں سنبھالا تو سات لڑکیاں جنیں۔ دو مر گئیں اور پھر ایک یہ لڑکا ــــــ پر مجھے کبھی آرام نہ ملا۔ چلا بھی پورا نہ ہو ہے کہ کام پر آنے لگوں ہوں ــــــ یہ چھاتی پر پانچ پہاڑ جو ہیں ــــــ ان کو کون سنبھالے گا ــــــ"

وہ شاید بات ٹال رہی تھی۔" مگر آج کیا ہوا ــــــ اس نے مارا کیوں؟

کہانی کار کی بے رحم رگ پھڑک اٹھی تھی۔

" اجی ہونا کیا۔ اسے میرا کھانا پینا، ہنسنا بولنا سبھی زہر لگے ہے۔ یہاں کھول کھڑی تھی، اس سے کیوں بات کی تھی۔ دکان پر کیوں ہنس رہی تھی کھڑی ــــــ پوچھو جب تو خود کوئی کام نہ کرے گا تو کام کاج کرنے میں نہ جاؤں گی تو پھر کیا ہو گا ــــــ بی بی جی ــــــ ہماری جات میں اسی مار دھاڑ ظلم و ستم کے پیچھے جانیں کتنی لگائیاں زہر کھالے وے ہیں یا پھر کسی کے ساتھ بھاگ جاوے ہیں ــــــ تم ہی کہو میں کروں تو کیا کروں بی بی ــــــ نکھٹو روز دارو پی کر ہوش و حواس کھو دے ہے۔ ایک کوٹھری کا گھر۔ دو جوان لڑکیاں، بیمار بچہ!

اب تم سے کیا کہوں بی بی. شرم بھی تو آوے ہے — پر اسے موئے بے غیرت کو نہ شرم نہ لاج — ہر دن یہی جھگڑا یہی ٹنٹا ہے. منع کرو تو بدچلنی کا الزام دگاوے ہے. رات اس بات پر اتنا مارا یہ دیکھو وہ غصہ میں بھڑک اٹھی تھی. ساڑھی پنڈلیوں سے اٹھائی تو کئی زخموں کے منھ گوری گوری پنڈلی پر کھلے ہوئے تھے.... بچے رونے لگے تو انھیں بھی مارنے لگا. پاس پڑوس والے اکٹھے ہو گئے. دوچار نے برا بھلا کہا تو جھاڑو مارا کہنے لگا میری عورت ہے ماروں یا چھوڑوں تم کون ہو. جو عورت آوارہ ہو گی وہ مار کھائے گی ہی.... اسے ڈھائی گھڑی کی آجاوے — اسے کل کا دن دیکھنا نصیب نہ ہو — مجھے عیب لگاوے ہے خود دنیا بھر کا آوارہ ہے موا — بی بی میں عیب کرنا چاہوں تو اس بستی میں دوچار نہیں دس بیس مرد مجھے سونے سے پیلی کر دیں. پر — مگر — بی بی میں اسی ماں کی بیٹی ہوں — جس نے بدنگاہ مردوے پر گوکاٹو کرا الٹ دیا تھا." اس کا سر اچانک بلند ہو گیا. چہرے پر غرور کی سرخی چھا گئی. مگر اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب تھا. پیٹ دو وقت سے خالی تھا.

آنٹی اسے بڑے پیار سے چائے اور روٹی کھلا رہی تھیں.

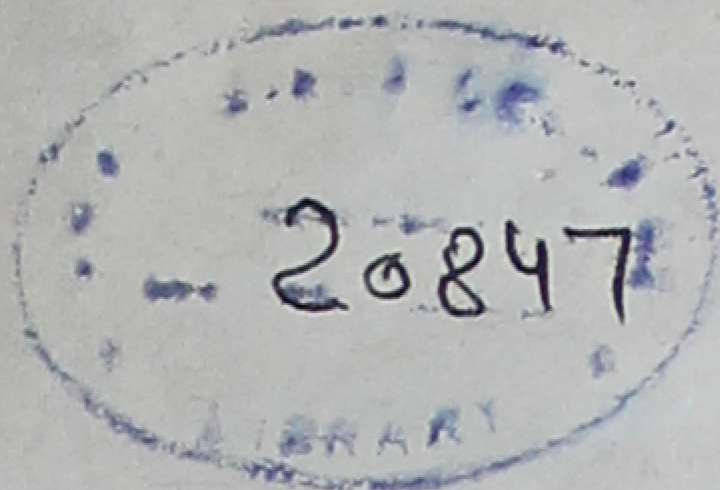
میں چپ چاپ بیٹھی تھی. جیسے ہاتھ پیر سُن ہو گئے ہیں —!

کیا میں آج شام کے جلسے میں کچھ بول سکوں گی —؟

پھول وتی. بھول رانی. رام دئی، بسنتی، لاجونتی اور اسی جیسی ہزاروں لاکھوں عورتیں. یہ جو صدیوں سے ہماری خدمت کر رہی ہیں. جو آج بھی آزاد ہند میں ہماری سیلوا کرتی ہیں ہماری گندگی ڈھوتی ہیں. اور ہم نے کیا دیا؟ آئین سے انھیں کچھ حق ملے ہیں. وہ بڑے فخر سے ووٹ ڈالنے جاتی ہیں اور بس اس سماج نے کیا دیا؟ مرد کی سماج نے؟ رسم و رواج نے؟ ذلت. نامرادی. مشقت... اور وہ نکھٹو مرد جو اس کا کھاتا اور اسی پر غراتا — مارتا ہے ذلیل کرتا ہے اسے بدچلن کہتا ہے اور خود آوارگی کرتا ہے.

...یہی ہے وہ برابری؟ کیا کیا ہے ہم نے ابھی اپنے ملک کی عورت کے لیے؟

مجھے کوئی اس سوال کا جواب دے. △△


20847
LIBRARY